اسلامی تعلیمات

کے

اصول و فروع

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام بارگاہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

فون 2431577

علامہ سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ جوادی

کے

بیش بہا علمی کارنامے

قرآن مجید (ترجمہ و تفسیر)

مطالعۂ قرآن

نہج البلاغہ (ترجمہ، تشریح، تفسیر، تقدیم)

اصول و فروع

نقوش عصمت (حیات چہاردہ معصومین)

ذکر و فکر

قمر بنی ہاشم

ابوطالب مومن قریش

نص و اجتہاد

فدک تاریخ کی روشنی میں

مجھے راستہ مل گیا

کربلا

[illegible]

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام بارگاہ، کھارادر، کراچی

فون [illegible]

باسمہ سبحانہ

اسلامی تعلیمات

کے

اصول و فروع

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

محفوظ بک ایجنسی

کراچی ۷۴۰۰۰

PH : (021) 32431577 Mob: 0341

Mob : 0314 - 2056416 - 0312

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : ـــــــــــــ اصول وفروع
مصنف : ـــــــــــــ علامہ السید ذیشان حیدر جوادی
کتابت : ـــــــــــــ ج احمد
سنہ طباعت : ـــــــــــــ
تعداد : ـــــــــــــ ایک ہزار
تعاون : ـــــــــــــ تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ (انڈیا)

رحمت اللہ بک ایجنسی
کاغذی بازار میٹھادر
کراچی ۷۴۰۰۰
PH : (021) 32431577 Mob: 0341-7234330
Mob : 0314 - 2056416 - 0332 - 3870828

فہرست

عرض تنظیم	۹
پیشرس	۱۳
توحید	۱۹ - ۴۱
مفہوم مسئلہ توحید	۱۹
اقسام توحید	۲۱
دلائل توحید	۲۷
نتائج واثرات	۳۱
عدالت	۴۲-۵۸
مفہوم عدالت	۴۲
عدل وفضل	۴۵
معیار استحقاق	۴۶
نتائج واثرات	۴۸
نبوت	۵۹-۸۳
مفہوم نبوت	۵۹
ضرورت نبوت	۶۲
صفات نبوت	۶۸
نبوت خاصہ	۶۹
نتائج واثرات	۷۲
امامت	۸۴-۱۰۵
مفہوم امامت	۸۴
شرائط امامت	۸۵
ائمہ اثنا عشر	۸۹
نتائج واثرات	۹۴
قیامت	۱۰۶-۱۵۶
ضرورت قیامت	۱۰۶
کیفیت قیامت	۱۰۹
موت	۱۱۳
قبض	۱۱۴
دلائل حیات بعد الموت	۱۱۹
فائدہ عقیدہ قیامت	۱۲۲
عالم برزخ	۱۲۷
سوال وجواب	۱۲۹
صراط ومیزان	۱۳۲
جنت وجہنم	۱۳۳
منظر قیامت	۱۳۵
قیامت واصلاح عالم	۱۳۷

محرکِ قیامت کے شہود ۱۴۱
نتائج و اثرات ۱۴۴
نماز ۱۵۹ — ۲۱۵
امتیازاتِ نماز ۱۵۹
سیرتِ انبیاء ۱۵۹
دعوتِ مسلسل ۱۶۴
جزوِ تقریبات ۱۶۵
کثرتِ اقسام ۱۶۶
مقصدِ ہجرت ۱۶۷
مقصدِ حکومت ۱۶۸
مقصدِ جہاد ۱۶۹
منعِ فساد ۱۷۱
ترکِ نماز محرکِ فساد۔ نماز مانعِ منکرات ۱۷۲
جنگ با شیطان ۱۷۴
علامتِ مردانگی ۱۷۵
وسیلۂ تشکر ۱۷۶
علامتِ ایمان بالغیب۔ ملاقات با محبوب ۱۷۷
وسیلۂ اطمینانِ قلب ۱۷۸
مجسمۂ ایمان ۱۷۹
معیارِ خشوع ۱۸۱
معراجِ مومن ۱۸۲
مخلوق شناسی ۱۸۴
وسیلۂ تحقیرِ دنیا ۱۸۵
تفکر در کائنات ۱۸۶
مدرسۂ تربیت ۱۸۷
احیاءِ اقدار ۱۸۹
اجتماعی مشکلات کا حل ۱۹۱
طاقت اور محاسبہ ۱۹۲
روحِ امدادِ باہمی ۱۹۳
حفظِ نظام کی تربیت ۱۹۴
حفظِ حیات ۱۹۵
شرطِ اخوت ۱۹۶
بنیادِ محبت ۱۹۷
سببِ زینت ۱۹۸
فرہنگِ اوقات ۱۹۹
اصلِ تغیرات ۲۰۰
مظہرِ مساوات۔ مقتضیِ رزقِ حلال ۲۰۱
سراسر وجود محوِ عبادت ۲۰۲
تعمیقِ اخلاق ۲۰۳
نماز بشرطِ حیات۔ سیرتِ اولیاء اللہ ۲۰۴
معمارِ مسجد ۲۰۵
اعلانِ حقانیت ۲۰۶
بلند ترین مرتبہ۔ علامتِ حنیفیت ۲۰۷
وسیلۂ اتمامِ حجت ۲۰۸
مظہرِ اسلامِ ناب محمدی ۲۰۹
سرچشمۂ طاقت ۲۱۰

علاجِ امراض ۲۱۱
تھرمامیٹر۔ ترکِ نماز وجہِ حسرت ۲۱۲
شکستِ سکوتِ شب۔ تنبیہ الغافلین ۲۱۳
حلِ مسائلِ سیاست ۲۱۴
روزہ ۲۱۶ — ۲۳۸
اہم ترین عبادت ۲۱۶
عمل بے ریا ۲۱۹
اخلاصِ محض ۲۲۰
لہجۂ وجوب ۲۲۱
سیرتِ امم ۲۲۲
خیرِ محض۔ وسیلۂ تقویٰ ۲۲۳
جرائم کُش ۲۲۴
بدلِ قربانی ۲۲۵
کفارۂ جرائم ۲۲۶
کفارۂ یمین۔ تنبیہ الغافلین ۲۲۷
وسیلۂ اثباتِ عصمتِ مریم ۲۲۸
احترامِ وقت ۲۲۹
تقویتِ قوتِ ارادہ ۲۳۰
ترکِ لذات ۲۳۱
وسیلۂ طہارت ۲۳۲
وسیلۂ تطہیرِ جذبات۔ وسیلۂ تطہیرِ زبان ۲۳۳
دعوتِ تلاوتِ قرآن ۲۳۴
توبہ و استغفار ۲۳۵
وسیلۂ اطعام۔ علامتِ ترحم ۲۳۶
ناقابلِ ترکِ عمل۔ غیر مخل ۲۳۷
زکوٰۃ ۲۳۹ — ۲۵۴
تزکیۂ نفس۔ حفاظتِ مال ۲۴۱
حفاظتِ اجر۔ باعثِ اجرِ عظیم ۲۴۲
کفارۂ گناہ ۲۴۳
بنیادِ ولایت۔ موجبِ رحمت ۲۴۴
موجبِ رہائی ۲۴۵
بنیادِ اخوت۔ وصیتِ پروردگار ۲۴۶
تقییدِ حیات۔ باعثِ عظمتِ کردار ۲۴۷
عملِ مرسلین۔ بنیادِ حکومت ۲۴۸
وسیلۂ کامیابی۔ علامتِ مردانگی ۲۴۹
وجہِ ہدایت و بشارت۔ اضافۂ خیرات ۲۵۰
فریضۂ زوجیتِ پیغمبر ۲۵۰
ترکِ زکوٰۃ علامتِ شرک ۲۵۱
کفارۂ ترکِ اولیٰ۔ بدلِ نمازِ شب ۲۵۲
علامتِ دینِ محکم۔ قوامِ معاشرہ ۲۵۳
بہر حالی خیر و برکت ۲۵۴
حج ۲۵۵ — ۲۹۱
عبادی و سیاسی عبادت ۲۵۵
عالمی اجتماع ۲۵۷
تعبیرِ صدائے خلیل ۲۵۹
اعلانِ برائتِ مشرکین ۲۶۰

تمہید قربانی	۲۶۱
حج للہ	۲۶۲
حج اور کائنات	۲۶۳
سفر الی اللہ	۲۶۵
مانع لغویات و خرافات	۲۶۶
فریضۂ انسانیت	۲۶۷
قیام للناس	۲۶۹
یادگار سلف صالحین	۲۷۰
یادگار قربانی	۲۷۱
برائت از شیطان	۲۷۲
سادگیٔ حیات	۲۷۴
دعوت الٰہی	۲۷۵
اصلاح مفہوم زینت	۲۷۶
تعیین محور حیات	۲۷۸
جستجوئے آب حیات	۲۷۹
وسیلہ استجابت دعا	۲۸۰
دعوت استغفار	۲۸۱
حل مشکلات اتحاد و امتحان نفسیات	۲۸۳
تعظیم شعائر اللہ	۲۸۷
تربیت طویل المدت	۲۸۹
احترام ارض حرم	۲۹۰
خمس	۲۹۲–۳۱۷
بہترین فریضہ	۲۹۲
تفسیر فلسفہ الٰہیات	۲۹۳
حکم عام۔ مالی عبادت	۲۹۵
عمومیت موارد	۲۹۶
علامت ایمان، ضمانت نقصان	۲۹۷
علاج حب مال	۲۹۸
تطہیر جہاد	۳۰۰
قدردانی خدمات	۳۰۲
احساس عظمت آل رسولؐ	۳۰۳
احساس درد انسانی	۳۰۴
نجات از جہنم	۳۰۵
اعتراف ملکیت حقیقی یا احساس ادائے حق	۳۰۶
حق مشترک	۳۰۷
اہمیت خمس	۳۰۸
وسیلہ تطہیر مال	۳۱۰
احتیاط تصرفات	۳۱۱
فرض و قرض	۳۱۲
تاکید عظمت امامت ضمانت بقاء دین	۳۱۳
ضمانت کارہائے علمی	۳۱۴
خزانۂ حکومت اسلامی، عظمت مقام نیابت	۳۱۵
تحریک اہلیت	۳۱۷
جہاد	۳۱۸–۳۴۱
معنی و اقسام جہاد	۳۱۸
عظیم ترین میدان عمل	۳۱۹

وسیلہ بقاء دین	۳۲۰
حوصلہ قربانی قومی سرمایہ کی فراہمی	۳۲۱
مظہر سیاست اسلام	۳۲۲
اسلامی اخلاق	۳۲۳
اشتغال قومی	۳۲۴
تطہیر معاشرہ	۳۲۵
افضل الاعمال	۳۲۶
امید رحمت	۳۲۷
وسیلہ جنت	۳۲۸
امتحان محبت	۳۲۹
علامت ایمان حقیقی	۳۳۰
ضروری امتحان۔ وجہ مغفرت	۳۳۱
دلیل صداقت	۳۳۲
کراہت جہاد علامت نفاق	۳۳۳
لا یخافون لومۃ لائم	۳۳۴
اہمیت موت	۳۳۵
عظیم ترین وسیلۂ فلاح	۳۳۶
جہاد اور دولت	۳۳۷
عظیم ترین محبوب	۳۳۸
جہاد فضیلت، مقصد امتحان و اختبار	۳۳۹
ترک جہاد سرمایۂ مصیبت	۳۴۰
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۳۴۲–۳۵۶
عظیم ترین واجبات	۳۴۲
شرائط	۳۴۳
مراتب عمل	۳۴۴
عمل معروف کی بعض مثالیں	۳۴۵
پروردگار سے وابستگی، خدا پر بھروسہ	
پروردگار سے حسن ظن	۳۴۵
مصیبتوں پر صبر، عفت اور پاکدامنی	
حلم و بردباری	۳۴۶
تواضع	۳۴۶
لوگوں کے ساتھ انصاف	۳۴۷
اپنے عیب پر نظر رکھنا	۳۴۷
اصلاح نفس	۳۴۷
دنیا کی طرف سے بے اعتنائی	۳۴۷
منکرات	۳۴۸
غضب اور غصہ۔ حسد	۳۴۸
ظلم، انسان کا خطرناک ہونا	۳۴۹
خصوصیات و امتیازات	۳۵۰
سنت الٰہیہ	۳۵۰
سیرت انبیاء و سیرت اولیاء، ہمیشہ ستمگار	۳۵۱
شرف انسانیت	۳۵۲
معاشرتی عمل، خیر خواہی	۳۵۳
خیرات، مقصد حکومت اسلامی	۳۵۴
وظیفۂ رسالت	۳۵۵
سبب خود سازی	۳۵۶

نجات از عذاب	۳۵۷
وجہ لعنت	۳۵۸
نجات از نفاق	۳۵۹
بنیاد خلافت فی الارض	۳۶۰
شان مجاہدین	۳۶۲
کمال نماز	۳۶۳
سبب تباہی اقوام	۳۶۴
اساس دین۔ رضائے الٰہی	۳۶۵
قباحت امور، افضل از جہاد	۳۶۶
رغم انف کفار	۳۶۷
مصدر خیرات و برکات	۳۶۸
نجات از جہنم	۳۶۹
مناہی رسول اکرمؐ	۳۷۰
تولاّ و تبرّا	۳۷۴-۳۸۶
معنی تولاّ و تبرّا	۳۷۴
امتیازات تولاّ و تبرّا	۳۷۴
سنت الٰہیہ	۳۷۵
سیرت انبیاء	۳۷۷
سیرت مرسل اعظم	۳۷۸
دعوت معرفت	۳۷۹
کردار سازی۔ صفائے نفس	۳۸۰
امتیاز خیر و شر۔ دعوت اتباع	۳۸۱
سبب مغفرت۔ ادا اجر رسالت	۳۸۲
دلیل عظمت کردار	۳۸۳
سبب نصرت الٰہی	۳۸۴
علامت ایمان	۳۸۵
شریف ترین عمل	۳۸۶
معاملات	۳۸۷-۴۰۰
معاملات جزو فروع دین	۳۸۷
اسلام کی جامعیت	۳۸۷
امتیازات و خصوصیات	۳۹۰
تفرقہ حلال و حرام۔ اخلاقیات	۳۹۱
طرفین کے شرائط	۳۹۲
اموال کے شرائط۔ اختیار فسخ	۳۹۳
لحاظ مستقبل۔ حق شفعہ	۳۹۵
حرمت اکل مال بالباطل	۳۹۶
ایجاب و قبول	۳۹۷
معتدل بنیادیں	۳۹۸

بسمہ سبحانہ

عرض تنظیم

خدا کا شکر ہے کہ تنظیم المکاتب اپنے صدر محترم حضرت علامہ جوادی دام ظلہٗ کے حقیقت نگار اور تیز رفتار قلم کی برکت سے مسلسل علمی اور تحقیقی شاہکار قوم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

سرکار محترم یوں تو گزشتہ ۳۰-۳۵ برس سے مسلسل قلمی خدمات میں مصروف ہیں اور چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں۔ لیکن ادھر دو چار سال سے آپ نے اپنے قلمی مجاہدات کو صرف ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے اور تقریباً ہر سال ایک عظیم علمی شاہکار ادارہ کی طرف سے شائع فرما رہے ہیں۔

اس سلسلہ کا سب سے پہلا افتخار آفریں کارنامہ ترجمہ و تفسیر قرآن مجید کا تھا۔ اس کے بعد "تمسک بالثقلین" کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے "نقوش عصمت" منظر عام پر آئی۔

اب یہ زیر نظر کتاب "اصول و فروع" آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب میں دو اہم امور پر توجہ دی گئی ہے:

۱۔ اسلامی عقائد صرف افکار و نظریات کی دنیا تک محدود نہ رہیں بلکہ ان کے عملی زندگی سے ارتباط اور ان کے نتائج کو بھی زیر بحث لایا جائے تاکہ مذہب ایک خیالی اور مثالی نظریہ نہ بن جائے بلکہ وہ زندگی کے تمام مشکلات کا حل قرار پائے

جس کی طرف سرکارِ دو عالم نے روزِ اول اشارہ فرمایا تھا کہ "کلمۂ توحید زبان پر جاری کرو، اسی میں فلاح اور کامیابی ہے اور یہی زندگی کے جملہ مسائل کا واقعی حل ہے۔"

۲۔ اسلامی عبادات کی واقعی عظمت و اہمیت کو واضح کیا جائے تاکہ عبادات رسمی اعمال نہ بن جائیں بلکہ ان کا واقعی اثر انسانی زندگی پر ہو اور انھیں کردار سازی کا بہترین ذریعہ تصور کیا جاسکے۔

عبادات کو ان کی واقعی روح سے الگ کر دینے کا نتیجہ ہے کہ بہترین قسم کا نمازی بھی بدترین قسم کا عیار نظر آتا ہے اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ پروردگار نے نماز کے برائیوں سے روک دینے کی ضمانت لی ہے اور میرا یہ کردار وعدۂ پروردگار کی تکذیب کی حدوں میں داخل ہو گیا ہے۔

علامہ جوادی دام ظلہ نے ان دونوں موضوعات کا حق ادا کیا ہے اور ہر عقیدہ اور ہر عبادت کے عملی زندگی پر اثرات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ ادارہ اپنے ناقص معلومات کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس طرح کی جامع کتاب عربی اور فارسی زبان میں بھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہے۔ اور یہ اردو دنیا کے لئے ایک سرمایۂ افتخار ہے۔

کاش ہمارے طلاب علوم دین جو بیرون ملک تحصیل علم میں مصروف ہیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کتاب کا عربی، فارسی اور انگریزی ترجمہ کر دیتے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی اشاعت ہو جاتی تو یہ دین اسلام کی عظیم خدمت بھی ہوتی اور اسے برصغیر کے پسماندہ ملکوں کے لئے سرمایۂ افتخار بھی قرار دیا جاتا جنھیں ہر اعتبار سے مفلس اور مفلوک الحال تصور کر لیا جا رہا ہے۔

ادارہ علامہ جوادی دام ظلہ کا بیحد شکر گذار ہے کہ انھوں نے ان خدمات کو ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے اور ان کی اشاعت کے انتظامات بھی اپنے ذاتی وسائل سے فراہم فرماتے ہیں۔

گذشتہ کتابوں کی طرح زیرِ نظر کتاب کی اشاعت بھی ارباب خیر کی کرم فرمائیوں ہی کا نتیجہ ہے۔ رب کریم محترم ڈاکٹر تہذیب الحسنین رضوی اور محترم ڈاکٹر ظفر جعفری کو جزائے خیر

عطا کرے۔ ان حضرات نے اس کارِ خیر کا بھی بیڑہ سنبھال لیا ہے اور ادارہ مزید بار اٹھائے بغیر اتنی عظیم علمی کتابوں کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کی طرح بعض دوسرے ارباب خیر نے بھی ہماری اس شعبہ میں اعانت فرمائی ہے اور مستقبل میں اعانت فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ جن کے ذریعہ ہم نے ایک نیا سلسلہ علامہ موصوف دام ظلہ کی کتب مجالس کی اشاعت کا شروع کر دیا ہے کہ تصنیفی کارنامہ صرف قارئین تک محدود رہ جاتا ہے اور مجالس کو منبر سے دہرایا جاتا ہے تو ان کی افادیت سیکڑوں گنا بڑھ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں "عقیدہ و جہاد" نامی مجموعہ مجالس گذشتہ برس شائع ہو چکا ہے اور امسال دو مجموعہ منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ ایک کی اشاعت کی ذمہ داری نیوجرسی کے مومن صالح ڈاکٹر اسد صادق دام عزہ نے لی ہے اور دوسرے کی ذمہ داری خوجہ ورلڈ فیڈریشن کے صدر محترم جناب ملا اصغر دام لطفہ نے لی ہے۔ رب کریم ان دونوں حضرات کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

اسی طرح قوم کے دیگر اصحاب خیر بھی اس سلسلہ میں حصہ لینا چاہیں تو علامہ موصوف کے متعدد مجموعہ تیار موجود ہیں۔ ان کی اشاعت کا کام انجام دیا جاسکتا ہے اور اس طرح کتاب کی اشاعت کے ساتھ ادارہ کی بالواسطہ امداد بھی ہو سکتی ہے جس سے ثواب آخرت یقیناً دوبالا ہو جائے گا۔

مومنین کرام سے گذارش ہے کہ ان کتابوں سے استفادہ بھی فرمائیں اور ادارہ کے توفیقات میں اضافہ کے ساتھ علامہ محترم کے طول عمر کے لئے دعا بھی فرمائیں تاکہ ہم ان کی سرپرستی میں مسلسل قدم آگے بڑھاتے رہیں اور منصوبہ کے مطابق نہج البلاغہ کے ترجمہ و تشریح کی اشاعت کا شرف بھی حاصل کر سکیں۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

(ادارہ)

احسن العقائد

اصولِ دین

توحید

عدل

نبوّت

امامت

معاد

اردو ترجمہ

شرح باب حادی عشر

تصنیف

سرکار علامہ حلّی علیہ الرحمۃ

شارح

علامہ فاضل مقداد علیہ الرحمۃ

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

فون ۲۴۳۱۵۷۷

بسمہ سبحانہ

پیش رس

انسانی کردار ایک سہ منزلہ عمارت ہے جس کی پہلی منزل کا نام ہے دماغ ۔ دوسری منزل ہے دل اور آخری منزل ہیں اعضاء و جوارح۔

اہل فلسفہ کا کہنا ہے کہ انسان جب کسی امر کا تصور کرتا ہے اور اس کے فوائد و منافع کا احساس کرتا ہے تو اس احساس کو دل کے حوالے کر دیتا ہے۔ اگر دل نے فائدہ کی تصدیق کر دی تو اعضاء و جوارح حرکت میں آجاتے ہیں۔ ورنہ فکر صرف ایک فکر بن کر رہ جاتی ہے اور کوئی عمل منظر عام پر نہیں آتا ہے۔

اعضاء و جوارح کو دل کا محکوم بنایا گیا ہے۔ دماغ کا نہیں۔ ان کی حرکت کے لئے دل کا اطمینان کرنا ضروری ہے ورنہ صرف فکر و نظر میں حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔

دین اسلام نے اس منطقی طریقہ حیات کو نگاہ میں رکھ کر اپنی تعلیمات کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ دماغ کے حوالے کیا ہے جس کا نام فکر و نظر اور معرفت ہے۔ دوسرا حصہ دل کے حوالے کیا ہے جس کا نام ہے عقیدہ اور آخری حصہ اعضاء و جوارح کے حوالے کر دیا ہے جس کا نام ہے عمل۔

اس کے بعد اس پورے کاروبار کو اس طرح منظم کیا کہ کردار کے تسلسل کو دماغ سے شروع ہو کر دل اور عمل پر تمام ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان کام شروع کر دے اور دل و دماغ معطل ہو کر رہ جائیں جو شیطانی گمراہی کا سب سے بڑا حربہ ہے کہ شیطان فکر و نظر کے مرحلے پر زیادہ طاقت صرف کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ انسان سے عملی میدان میں غلط اعمال صادر کرا دے اس کے بعد فکر و نظر کے میدان میں انسان خود ہی اپنے اعمال کی تاویل کرے گا اور اس کے فلسفے تیار کرے گا۔

انسانی زندگی کی ساری گمراہی اور تباہی اسی بدنظمی سے پیدا ہوتی ہے کہ عقیدہ فکر و نظر کے بغیر پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی عمل فکر و نظر یا عقیدہ کا انتظار نہیں کرتا ہے۔ ورنہ انسان کا نظام عمل مرتب ہو جائے تو گمراہی کو کسی راستہ سے داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔

اسلام نے سب سے پہلے معرفت خدا کو واجب قرار دیا "اوّل الدّین معرفتہ" تاکہ اسلامی عمل کا آغاز فکر و نظر سے ہو اور انسان شان ربوبیت سے باخبر ہو جائے اور پہلے مرحلہ پر کسی طرح کی غلطی کا شکار نہ ہو۔

اسے یہ اندازہ ہو جائے کہ مالک کائنات کے علاوہ کوئی بندگی کا اہل نہیں ہے۔ وہ رب العالمین اور تمام صفات جلال و جمال کا مالک ہے۔ تاکہ اس کے بعد دل میں عقیدۂ توحید راسخ ہو جائے اور کوئی شک و شبہ یا سفسطہ اس کے عقیدہ کو متزلزل نہ بنا سکے۔

عقیدہ فکر و نظر سے بے نیاز ہوگا تو کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتا ہے اور انسان کسی وقت بھی اس منزل پر گمراہ ہو سکتا ہے۔ عقیدہ کے لئے صحت فکر اور سلامتی نظر ایک بنیادی شے ہے اور اس کے بغیر عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

عقیدہ کے استحکام و استقلال کے بعد عمل کا سلسلہ شروع ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر عمل پر عقیدہ کی چھاپ رہے اور کوئی عمل بے بنیاد نہ ہونے پائے۔ عقیدہ کی طرف سے غفلت ہی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کے بے شمار اعمال اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور توحید پروردگار کا عقیدہ رکھنے والا ہزاروں طرح کے مشرکانہ خیالات یا اعمال کا حامل ہو جاتا ہے اور اسے اس امر کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی گمراہی کا سرچشمہ کہاں ہے اور وہ کس طرح گمراہ ہو گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دل و دماغ کی تسکین کا سامان ہے عقیدہ، اور اعضاء و جوارح کی تطہیر و تنویر کا ذریعہ ہیں اعمال۔

عقیدہ کا تعارف اصول دین کے لفظ سے کرایا جاتا ہے ــــ اور اعمال کا تعارف فروع دین کے لفظ سے ہوتا ہے۔

گویا دین ایک شجرۂ طیبہ ہے جس کی اصل ہے عقیدہ اور اس کی شاخ ہے عمل۔ جو

انسان بھی اصل و فرع دونوں سے وابستہ ہو جائے گا وہ ثمرات و نتائج سے بہر حال فیضیاب ہوگا اور جو انسان جڑوں کے اندر دفن ہو جائے گا۔ یا شاخوں پر معلق رہ جائے گا وہ ثمرات و نتائج سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام میں عقیدہ کا سلسلہ عمل سے الگ نہیں ہے اور عمل کا سلسلہ عقیدہ سے جدا نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات میں عقیدہ عمل کا محرک ہے اور عمل عقیدہ کا محافظ۔ عقیدہ نہ ہو تو حرکت اعمال کے رک جانے کا اندیشہ ہے اور عمل نہ ہو تو عقیدہ کے بے جان ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ضرورت ہے کہ انسان دونوں سے وابستہ رہے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز اور بار آور بنا رہے۔

ترجمہ و تفسیر قرآن مجید، نقوش عصمت اور مطالعہ قرآن کے بعد یہ چوتھی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے جس کا موضوع ہے اصول و فروع۔ اس موضوع پر اردو زبان میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جس انداز سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے اس کی نظیر حقیر کو عربی اور فارسی کتب میں بھی نہیں ملی ہے۔

اس موضوع پر ایک نئے انداز کی کوشش ہے اور ظاہر ہے کہ حرف اول کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہ تصنیف بھی "تحریک دینداری" کی ایک کڑی ہے جس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کا کوئی عقیدہ انسان کی عملی زندگی سے الگ اور لاتعلق نہیں ہے اور اسلام کی کوئی عبادت صرف ایک عبد و معبود کا رشتہ نہیں ہے بلکہ اس میں سیاست حیات اور تدبیر زندگی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں۔ اور انسان ان کی روح سے آشنا ہو جائے اور اسے اپنے اندر جذب کر لے تو ایک بہترین مسلمان اور واقعی صاحب ایمان ہو سکتا ہے۔

میری دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کی اشاعت پر بھی میرے دو کرم فرما محترم [illegible] الحسنین رضوی اور محترم ڈاکٹر ظفر جعفری کا دست کرم ہے جس نے کتاب کو

اشاعت کی منزل تک پہونچا دیا اور آج کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ بھی دعا فرمائیں کہ رب کریم دونوں حضرات کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دیگر حضرات کو بھی ایسے کارہائے خیر کی توفیق کرامت فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

جوادی

اصولِ دین

۱۔ توحید
۲۔ عدالت
۳۔ نبوت
۴۔ امامت
۵۔ قیامت

بسمہ سبحانہ

مسئلہ توحید

[illegible] اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ توحید پروردگار کا ہے جس پر تمام
[illegible] ہے اور درحقیقت تمام عقائد اسلامیہ کی بازگشت بھی اسی ایک عقیدہ کی طرف
[illegible] ہی کا ایک شعبہ ہے۔ نبوت و امامت توحید ہی کے آثار ہیں اور قیامت
[illegible] عدالت حقیقیہ کی مظہر ہے۔

[illegible] ہمارے بنیادی عقائد دو اصول دین کا آغاز وجود خدا کے بجائے توحید پروردگار
[illegible] وجود خدا کی ایک فرع ہے کہ وجود اصل ہے اور توحید اس کی صفت
[illegible] اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے وجود اس سے وجود خدا کے مسئلہ
[illegible] نہیں کیا ہے، وہ اس کا اظہار ہے کہ وجود خدا کا ادراک
[illegible] اصل ہے اور اس کے لئے کسی مذہب کی تعلیمات کی ضرورت نہیں ہے۔
[illegible] کی فطرت میں یہ ادراک اور شعور رکھ دیا ہے کہ کسی شے کا وجود
[illegible] ممکن نہیں ہے۔

[illegible] کے وجود کسی آدمی کوشش کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔
[illegible] پیچھے سے ٹھوکر کھانے کے بعد فوراً ٹھوکر دینے والے کی جستجو میں لگ جاتا
[illegible] والے فرد وقت کے آمد و رفت کی تلاش میں مصروف ہو جاتے
[illegible] رکتا ہے کہ ہر کام کسی انجام دینے والے کے بغیر نہیں ہو سکتا اور
[illegible] رہ کا کوئی ذمہ دار نہ ہو گا۔

... بس اس قدر واضح ہے کہ قرآن مجید نے بڑی کفار و مشرکین کو بھی اس ... یہ درست ہے کہ یہ اسلام صرف فطری ہونے کی بنا پر احکام کی بنیاد ...

... بار بار یہ اشارہ دیا ہے کہ ان کفار سے سوال کرو گے کہ زمین و آسمان ... کس کا نام لیں گے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ خالق کوئی نہیں ہے اور نہ ... اس کا امکان ثابت کر سکے گا۔

... کی ذمہ داری اس فطری مرحلہ کے بعد سے شروع ہوتی ہے جہاں خالقیت کا ... اور یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا خلق کرنے والا ایک ہے ... محتاج ہے یا بے نیاز — اس کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں — اس کا کوئی ہمسر ممکن ہے ...

... وہ سوالات تھے جن سے کفار کے ذہن کو منتشر بنا رکھا تھا اور وہ خالق ... کے قائل ہونے کے باوجود ان مقامات پر بہک جاتے تھے ... میں آ جاتی تھی۔

اسلام ... اپنی تعلیمات کا آغاز انہیں مراحل سے کیا ہے جہاں فطرت سلیمہ کے بھی بہک ... جانے ... کے صاف و شفاف فیصلہ میں اوہام و خیالات کی کثافت ... تھی۔

... سورہ توحید نے اسی حقیقت کی طرف بہت واضح انداز سے اشارہ کیا ہے کہ ... سورہ کے آغاز میں "قل اللہ احد" نہیں کہا ہے کہ ... کا تصور ہی اسلام ... بلکہ "قل ھو اللہ احد" کہا جس سے صاف واضح ہوتا ہے ... میں بھی ایک "ھو" کا تصور موجود تھا۔ خرابی صرف یہ تھی کہ وہ ... اور جاہلیت زدہ ذہن اس کی حقیقت کے تصور سے عاجز تھا۔ ... اس کا تعارف لفظ "اللہ" سے کرایا جس کا مفہوم تمام صفات کمال ... عیب سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کی ذات میں کسی طرح کا نقص اور عیب

... "ھو" کی حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم اشارہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد پھر ... اشارہ کو مخاطب کے لئے ناکافی قرار دیتے ہوئے تفصیلات کا سہارا لیا اور خالق کے ... کے سوالات کے جوابات فراہم کر دیئے کہ اگر مسئلہ اس کی ذات اور اس کے ... تو وہ "احد" ہے — اور اگر اس کی احتیاج سے متعلق ہے تو وہ "صمد" ہے — اور اگر مسئلہ اس کی رشتہ داری کا ہے تو وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا — ... اس کی ہمسری سے متعلق ہے تو کوئی اس کا ہمسر بھی نہیں ہے اور اس طرح توحید کی ... کو چند لفظوں میں واضح کر دیا گیا اور اس کے بعد سارے قرآن مجید کے جملہ بیانات ... توضیح و تشریح پر مبنی ہوں گے اور ان کے ذریعہ اسی ایک حقیقت کی مسلسل توضیح ... ہو گی۔

اقسام توحید

توحید کو بنیادی عقیدہ قرار دینے کے بعد اسلام نے اس کے اقسام کو بھی واضح کر دیا ... کے بارے میں کس طرح کی توحید کا قائل ہے اور وہ جہالت و جاہلیت ... کس حد سے واحد کا عقیدہ دینا چاہتا ہے۔

... نے یہی توحید کو چار حیثیت سے واضح کیا ہے

... وحدت

... اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل یکتا اور اکیلا ہے۔ اس کی وحدت ... کے بعد دو کا تصور ممکن ہو جائے اور نہ نوعیت والی ہے کہ جنس ... وجود مختلف افراد کی شکل ہو جائے۔

اس کی ... بھی واحد ہے ... اجزاء سے بھی ... اتحاد ... مختلف اجزاء سے مل کر بنی ہے کہ اس کا وجود ... ہمیشہ ... کا سلسلہ ... کسی وقت بھی اس ... اس کی تقسیم کا کوئی امکان پیدا ہو جائے۔

۲۔ توحید صفات

وہ اپنے صفات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے۔ دراصل ہر وہ دوئی جو [illegible] کائنات کی ہر شئے میں پائی جاتی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی اپنے وجود میں ایک دوئی رکھتا ہے کہ اس کی ذات الگ ہے اور اس کی صفت الگ ہے یا کسی وقت اس کی ذات صفت سے الگ رہ چکی ہے اور اب اس میں یہ کمال پیدا ہوا ہے یا کسی مرحلہ پر تصور میں اس کی ذات کا تصور اس کے کمال سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن پروردگار کی صفت کا یہ حال نہیں ہے۔ وہ اپنی صفت کے ساتھ اس طرح متحد ہے کہ ذات و صفت دو چیزیں نہیں ہیں اور نہ کسی طرح کی دوئی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ذات عین صفت ہے اور اس کی صفت عین ذات۔ وہ عالم نہیں ہے بلکہ حقیقت علم ہے۔ وہ قادر نہیں ہے بلکہ عین قدرت ہے۔ وہ زندہ نہیں ہے بلکہ اصل حیات ہے اور یہ مفاہیم بھی اس قدر آسان نہیں ہیں کہ ہر شخص ان کا ادراک کر سکے۔

اس کے بارے میں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ صفت جب تک مخلوقات سے وابستہ ہوتی ہے اور صفت حقیقت کا انداز اختیار کر لے تو ذات خالق کی تعبیر بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر عالم، قادر، حی جیسے الفاظ [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] استعمال ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ عین علم، عین قدرت اور عین حیات ہے اور ان صفات کا مفہوم وہ نہیں ہے جو عام صفات کا ہوتا ہے ورنہ صفت کے عین ذات بن جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۳۔ توحید عبادت

وہ جس طرح اپنی ذات و صفات میں وحدانیت و یکتائی رکھتا ہے۔ اسی طرح اپنی عبادت کے استحقاق میں بھی یکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔

عبادت کا مفہوم انتہائی خضوع و خشوع کا ہے اور انتہائی خضوع و خشوع کے لئے انتہائی کمال درکار ہوتا ہے ورنہ عقل کسی بھی بے کمال یا ناقص کے سامنے جھکنے پر راضی نہیں ہے۔ انتہائی کمال کے لئے خالقیت اور مالکیت درکار ہے ورنہ اپنے کمالات میں کسی خالق و مالک کا محتاج ہو، خود بھی ایک طرح کا نقص ہے جس کے بعد انتہائی کمال کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

[illegible] کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ توحید الٰہی کے عقیدہ کے بعد [illegible] کا تصور ناممکن ہے لیکن عبادت کے علاوہ غیر خدا کا احترام یا اس کی [illegible] عقیدۂ توحید کے منافی نہیں ہوتی ہے۔

[illegible] مفہوم انتہائی خضوع و خشوع اور عظمت مطلقہ کے تصور کے ساتھ بندگی [illegible] علاوہ کسی بھی اطاعت کو عبادت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔

[illegible] ہے کہ قرآن مجید نے غیر خدا کی عبادت کا انکار کرنے کے بعد بھی اطاعت رسول [illegible] اولی الامر کا حکم دیا ہے اور اسی طرح شعائر اللہ کی تعظیم کو تقوی الٰہی کی علامت [illegible] اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اور ہے اور اطاعت و احترام [illegible] دونوں کو مخلوط کر دینا اور اطاعت و احترام کو بھی حرام قرار دے دینا کسی [illegible] اسلام سے ہم آہنگ تصور نہیں ہے۔

[illegible] علاوہ اطاعت و احترام عام حالات میں حرام بھی ہوں تو [illegible] کام حکم خدا [illegible] تو اس کا نام بھی عبادت خدا ہی ہوگا۔ اسے عبادت غیر کے معنی نہیں [illegible]۔

[illegible] اسلام نے عبادت شیطان اور عبادت ہوا و ہوس کا شدت سے [illegible] خضوع و خشوع عبادت [illegible] ان کی ضد اور بندگی پروردگار کی [illegible] اطاعت مطلقہ عبادت ہی کہی جاتی ہے۔ اسے اطاعت کا درجہ نہیں [illegible] شیطان کرنے والے شیطان کے اطاعت گزار نہیں بلکہ عبادت گزار [illegible] ہیں کہ [illegible] حکم خدا سے اطاعت شیطان کی ہے [illegible] اطاعت کی ہے ورنہ حکم خدا کا تحفظ پیش نظر ہوتا تو اس اطاعت کی [illegible] پروردگار عالم نے شیطان کو کھلا ہوا دشمن قرار دے کر اس کی اطاعت [illegible] ہے اور اس کے بعد اس اطاعت کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

[illegible] اصول

[illegible] مقام عمل میں بھی اس بات کا اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ہر عمل کے پیچھے قوت پروردگار

سی کام کر رہی ہے اور انسان نہ مالک حقیقی ہے اور نہ آزاد مطلق۔ اس کا اختیار مجبوریوں سے بندھا ہوا ہے اور اس کی آزادی پابندیوں کی مرہون کرم ہے۔ اسے مالک نے مختار ضرور بنایا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ واقعتاً صاحب حق ہو گیا ہے۔ اس کی مثال اس نوکر کی ہے جو کسی دوسرے کے دیئے ہوئے چابک سے نوکری ہو جائے کہ اس سے وہ لکھوں کا حساب وصول کر سکتا ہے لیکن اسے لاکھوں کا مالک حقیقی نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

رب العالمین اپنے اعمال و افعال میں یکتا و بے نیاز ہے۔ اس کے اعمال میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس نے اپنی شان کے بارے میں خود یہ اعلان کر دیا ہے کہ میرے ان اعمال میں کوئی میرا شریک نہیں ہے اور نہ کوئی شخص میرے علاوہ ان اعمال کو انجام دے سکتا ہے۔ اس کی توحید افعال کی بے پناہ قسمیں ہیں جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

١۔ توحید خالقیت

وہ تخلیق کائنات میں اکیلا اور یکتا ہے۔ اس نے کل کائنات کو تنہا پیدا کیا ہے اور کوئی شخص بھی اس کے عمل تخلیق میں اس کا شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنے بندوں سے ظاہری تخلیق کا کام ضرور لیا ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ کام میرے حکم یا میری اجازت سے ہو رہا ہے اور پھر اپنے اولیاء کو حکم دے دیا ہے کہ ایسے مواقع پر برابر وضاحت کرتے رہیں کہ یہ کام اس کی اجازت اور اس کی دی ہوئی طاقت سے انجام پا رہا ہے ورنہ منزل تخلیق سے گزرنے والا انسان آگے بڑھ کر خالق نہیں ہو سکتا ہے۔

٢۔ توحید ربوبیت

وہ جس طرح تخلیق کی منزل میں اکیلا اور یکتا ہے اسی طرح ربوبیت کے مرحلہ پر بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس نے تنہا کائنات کو پیدا کیا ہے اور تنہا ربوبیت کا کام انجام دے رہا ہے۔ وہ بار بار اپنے کو رب العالمین کہہ کر یہی سمجھا رہا ہے کہ کوئی اس کی ربوبیت میں شریک نہیں ہو سکتا ہے۔

اس نے مختلف افراد کی تربیت کا کام مختلف افراد کے حوالے کیا ہے لیکن کسی کو رب العالمین نہیں قرار دیا ہے اور نہ کوئی اس کا امکان ہے کہ ایک دن تربیت کی منزل سے گزرنے والا

[illegible] میں اس منزل کو حاصل کرے۔

٣۔ توحید مالکیت

وہ ساری کائنات کا تنہا مالک ہے اور کوئی اس کی مالکیت میں بھی برابر کا شریک نہیں [illegible] کاروبار حیات کے نظم و ضبط کے لئے مالکیت کا قانون بنا دیا ہے اور مختلف [illegible] مختلف چیزوں کا مالک بنا دیا ہے لیکن یہ مالکیت صرف اعتباری اور فرضی کی دنیا تک [illegible] ہے اور اس کا حقیقی مالکیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقی مالکیت پروردگار کا حق ہے [illegible] کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا ہے تو یہ کام اس کی خلافت و نیابت میں انجام پائے گا۔ [illegible] حقیقی مالکیت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

٤۔ توحید تشریع

[illegible] ہے کہ جب کائنات رب العالمین کی بنائی ہوئی ہے تو اس کے چلانے کا نظام [illegible] کا بنایا ہوا ہوگا۔ دوسرے کے ملک میں اپنا قانون چلانا نا انصافی ہے اور غاصبانہ تصرف۔ [illegible] شریعت اور عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا ملک ہو اسی کا قانون نافذ ہو اور [illegible] نے منزل تشریع میں بھی توحید کا عقیدہ دیا ہے اور یہ کام صرف رب العالمین کے لئے مخصوص [illegible] مرسلین اور اولیاء و صالحین کا کام اس کے احکام پر عمل کرانا ہے اور یہی عمل وہ [illegible] سے خود بھی انجام دیتا ہے ورنہ کسی کو قانون سازی اور قانون گذاری کا حق نہیں ہے۔

٥۔ توحید حاکمیت

[illegible] مالک کائنات کے ملک میں کسی کو قانون گذاری کا حق نہیں ہے اسی طرح حاکمیت [illegible] بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ملک دوسرے کا ہو اور حاکم کوئی دوسرا ہو جائے۔ [illegible] اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور یہی اس کی [illegible] ورنہ کوئی انسان کسی انسان کا خالق ہے اور نہ کسی کو کسی پر حکومت کرنے کا حق [illegible] اختیار ہے وہ جس کو چاہے عطا کر سکتا ہے۔ [illegible] سے جمہوری حکومت بھی اسی وقت حکومت کرنے کا استحقاق پیدا کر سکتی [illegible] العالمین کی طرف سے حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے ورنہ اس کے بغیر

۹۹ فیصد افراد کی رائے بھی اس ایک فرد پر حکومت کرنے کا حق نہیں دے سکتی ہے جس نے رائے نہیں دی ہے یا مخالف رائے دی ہے۔ اکثریت کی رائے نہ حاکم کو خالق بنا سکتی ہے اور نہ مخالف سے اس کی فطری آزادی کا حق چھین سکتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے جمہوری حکومت کا جواز صرف یہ ہوتا ہے کہ مالک کائنات نے حکومت کا حق پیغمبر کو دے دیا ہے اور پیغمبر نے یہ حق اپنے بعد اپنے خلفاء و اولیاء کے حوالے کر دیا ہے اور انھوں نے اپنی غیبت کے دور میں یہ حق علماء اعلام کے حوالے کر دیا ہے۔ اور علماء اعلام نے اس طرز حکومت کو نفاذ کا حق دے دیا ہے ورنہ اس کے بغیر یہ نظام بھی اسی طرح غاصب کہا جائے گا جس طرح ساری قوم کی مخالفت کے باوجود کوئی شخص ان کی گردنوں پر مسلط ہو جائے اور بزور شمشیر ان پر حکومت کرنے لگے۔

۷۔ توحید اطاعت

توحید حاکمیت سے توحید اطاعت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ جس طرح غیر خالق کو حاکمیت کا حق نہیں ہے، اسی طرح غیر حاکم حقیقی کو مطالبہ اطاعت کا بھی حق نہیں ہے۔ حق اطاعت خالق کائنات کا بنیادی حق ہے۔ وہ جسے چاہے عطا کر سکتا ہے اور جب عطا کرے گا تو انسان قابل اطاعت ہو جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ اعلان ضروری ہوگا کہ جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ دیکھے کہ پروردگار کی اطاعت کر رہا ہے کہ یہ اسی کی اطاعت کا پرتو ہے ورنہ ذاتی طور پر رسول کو بھی پروردگار کے مقابلہ میں اطاعت کرانے کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ بھی مالک کائنات کی ایک مخلوق ہے اور مخلوق خالق کی ہم پلہ اور شریک و سہیم نہیں ہو سکتی ہے۔

دلائل توحید

۲۔ علماء و فلاسفہ نے توحید خالق کے سلسلہ میں مختلف دلائل کا تذکرہ کیا ہے جن کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

۱۔ دلیل صرف الوجود

[illegible] ذات کا خالق ایک وجود مطلق ہے جس میں کسی طرح کی محدودیت نہیں پائی جاتی [illegible] محدودیت اسے عدم سے آلودہ بنا دے گی اور جو عدم سے آلودہ ہو جائے گا وہ [illegible] ہونے کے قابل نہیں رہ جائے گا اور جب یہ بات طے شدہ ہے کہ خالق کائنات [illegible] ہونا چاہئے تا کہ وہ جملہ محدود وجودات کا سرچشمہ قرار دیا جا سکے اور ہر محدود [illegible] وجود نقص کا ایک قطرہ ہے تو یہ بات بغیر کہے ہوئے واضح ہے کہ وجود مطلق [illegible] اور ہر شریک دوسرے کی ذات سے عاری ہوگا اور اس کے نتیجہ میں [illegible] ہو جائے گا اور یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ جو محدود ہوگا وہ صرف الوجود نہیں ہو سکتا ہے۔

[illegible] الفاظ میں یوں کہا جائے کہ خالق کائنات یا واجب الوجود کا صحیح تصور ہی [illegible] اثبات کے لئے کافی ہے اور اس میں کسی طرح کی دوئی کا کوئی تصور [illegible] وجود کے تصور کرنے والے مفہوم خدا ہی سے ناآشنا ہیں اور انھوں نے ناقص تصور قائم کر لیا ہے جس میں تعدد کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں [illegible] کسی طرح کے تعدد کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ وحدت کائنات

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کائنات دیکھنے میں بالکل منتشر و پراگندہ ہے۔ کہ زمین الگ ہے اور آسمان الگ اور دونوں کے درمیان لاکھوں میل کا فاصلہ ہے۔ پہاڑوں کی بلندی الگ ہے اور دریاؤں کی روانی الگ۔ صحراؤں کے ذرات الگ ہیں اور گلستانوں کے میوہ و گل الگ۔ آسمانوں پر چاند کی دنیا الگ ہے اور سورج کا عالم الگ۔ ستاروں میں ثوابت الگ ہیں اور سیارات الگ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس پورے نظام میں ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے کہ آسمان پر چاند کا زوال و عروج دریا کے پانی میں جزر و مد پیدا کر دیتا ہے۔ اور درخت سے ایک سیب کا گر کر زمین کی طرف آنا پوری کائنات کے نظام کشش کا انکشاف کر سکتا ہے۔ ماہتاب آفتاب کا پرتو ہے اور ستاروں کا نظام آپس میں ایک دوسرے سے حد درجہ مربوط۔ جو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انواع و اقسام کے اعتبار سے اس کائنات کو عوالم و دنیاؤں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن نظام دقیق کے اعتبار سے کل کائنات ایک عالم ہے جس کا سلسلۂ مجردات روحانیات سے ملا ہوا ہے اور سلسلۂ ارواح اجسام سے مرتبط۔ اس کا نظام ارضی نظام سماوی سے مربوط ہے اور نظام سماوی نظام ارضی سے وابستہ۔ اس کے جمادات نباتات سے وابستہ ہیں اور نباتات حیوانات سے پیوستہ۔ اس کا عالم شہود عالم غیب سے ملا ہوا ہے اور عالم غیب عالم شہود سے متصل۔ اور جب کل کائنات کا عالم ایک ہے اور کل کائنات ایک سلسلۂ ربط و نسق میں پروئی ہوئی ہے تو دو خالقوں کا تصور ہی مہمل ہے۔ دو مخلوق ہوتے تو خالق بھی دو تسلیم کر لئے جاتے لیکن جب مخلوق ہی ایک ہے تو دو خالقوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

آسمان و زمین کے لئے دو خالقوں کا تصور اس دور جہالت کی پیداوار ہے جب انسان زمین و آسمان کے نظام سے ناواقف تھا اور اسے دو حصوں میں تقسیم کئے ہوئے تھا لیکن دور حاضر میں علمی ترقی کے بعد اس قسم کا تصور قائم کرنا اپنی جہالت کا اعلان [illegible] اور کچھ نہیں ہے۔

[illegible] اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ اگر ان میں [illegible] اللہ کے علاوہ بھی کوئی خدا ہوتا تو زمین و آسمان سب برباد ہو جاتے۔ اس [illegible] نظام اور تحریک نظام جاری رہنے کے لئے ایک محرک کی ضرورت [illegible] دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ دونوں ایک دوسرے کے [illegible] لگیں گے جو تقاضائے قدرت کے خلاف ہے [illegible] میں اختلاف پیدا ہو جائے گا [illegible] مشرق جانا چاہے گا اور دوسرا مغرب میں۔ اور اس طرح ایک کی [illegible] کائنات کی بربادی کا سامان ہو جائے گا۔ دو خداؤں کے وجود [illegible] برقرار رہنا ناممکن ہے۔ اس طرح یا کائنات تباہ ہو جائے گی یا [illegible] خدائی سے معزول ہو جائے گا۔

[illegible] نظام شریعت

[illegible] شک نہیں ہے کہ جسے خالق و مالک کائنات تسلیم کیا گیا ہے اس کی خالقیت [illegible] کہ اپنے مخلوقات پر مسلسل کرم کرے [illegible] پیدا کیا ہے [illegible] الوہیت کے خلاف [illegible] کا قائم رکھنا اس بات کا مقتضی ہے کہ جیسے خدا ہوں ویسے ہی آثار [illegible] طرح کی کائنات ہو اور عالم تشریع میں دو طرح کے نظام۔ [illegible] ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں سے ایک ہی طرح کا نظام [illegible] کا تواتر رہا ہے کہ ہر پہلے آنے والے نے بعد والے کی خبر دی ہے [illegible] پہلے والے کی تصدیق کی ہے۔ [illegible] کوئی اختلاف ہو [illegible] دوسرے نظام کی تشکیل جو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ [illegible] نہیں ہے جیسا کہ امیر المومنین نے مختصر الفاظ میں اپنے فرزند سے [illegible] تمہارے پروردگار کا کوئی شریک یعنی دوسرا خدا بھی ہوتا [illegible] بھی آتے اور تم دنیا میں اس کی سلطنت اور اس کے اقتدار

کے آثار بھی دیکھتے تھیں اس کے افعال و صفات کی خبر بھی دی جاتی اور کسی [illegible] نشاندہی بھی ہوتی — لیکن تکوین سے لے کر تشریع تک کسی مقام پر اس کا کوئی [illegible] نہیں ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا خدا ویسا ہی واحد و یکتا ہے جیسا اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے۔"

[illegible] نے اپنے بارے میں کیا بیان کیا ہے؟ اسے بھی امیر المومنینؑ ہی کی لفظوں [illegible] جا سکتا ہے۔

حضرت محمد بن الحنفیہ نے سوال کیا کہ بابا جان! خدا نے اپنے کو "صمد" قرار دیا ہے تو اس صمد کے معنی کیا ہیں؟

فرمایا — وہ نہ اسم ہے نہ جسم — نہ اس کا کوئی مثل ہے نہ نظیر — نہ اس کی کوئی صورت ہے نہ تمثال — نہ اس کی کوئی حد ہے نہ حدود — نہ اس کا کوئی رسم ہے نہ مکان وہ نہ یہاں ہے نہ وہاں — نہ پُر ہے نہ خالی — نہ کھڑا ہے نہ بیٹھا — نہ ساکن ہے نہ متحرک — نہ ظلمانی ہے نہ نورانی — نہ نفسانی — نہ کسی مکان میں ہے اور نہ کوئی جگہ اس سے خالی ہے نہ رنگ رکھتا ہے نہ بو — نہ کسی مادی چیز میں سماتا ہے اور نہ قلب انسان میں — اس کی ذات ان سے یہ تمام باتیں الگ ہیں اور یہی اس کی بے نیازی اور صمدیت کا مفہوم ہے۔

(بحار الانوار ۳/ ۲۳۰ حدیث ۲۲)

عقیدۂ توحید — نتائج و اثرات

[illegible] عام طور سے کسی بھی مذہب کے ان نظریات کو کہا جاتا ہے جن کا تسلیم کرنا ہر [illegible] ہے اور جن کے بغیر کوئی انسان دائرہ مذہب میں نہیں رہ سکتا ہے۔

[illegible] اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں عقیدہ ان حقیقی نظریات کا نام [illegible] فطرت بشر اور تعلیم عقل و منطق پر قائم ہوتی ہیں۔ انسان کا کام ان نظریات [illegible] کا اعتراف اور اقرار کر لینا ہوتا ہے۔

[illegible] اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیادیں فطرت بشر میں موجود [illegible] فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ اس کے بعد ماں باپ لے، دوسرے راستوں [illegible] اور وہ اپنی فطرت سے منحرف ہو جاتا ہے۔

[illegible] فطرت ہونے کے بعد اس کے حقائق و معارف کو تسلیم کرنا انسانی فطرت [illegible] بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فطرت پر مادیت کا غلاف چڑھ جاتا ہے اور [illegible] کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ ان [illegible] ان کے اثرات اور نتائج کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے تاکہ اگر [illegible] راہ میں حائل ہونا چاہے تو اثرات و نتائج انسان کا ہاتھ پکڑ لے اور حق [illegible]

[illegible] کے چند اثرات و نتائج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن سے اس [illegible] کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بلندیٔ فکر

انسان فطری طور سے اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اسے اس کائنات میں اشرف [illegible] ہونے کا شرف حاصل ہے اور کائنات کا کوئی عنصر اس سے بلند تر نہیں ہے۔

وہ جمادات سے بھی بالاتر ہے، وہ نباتات سے بھی۔ وہ حیوانات سے بھی بلند تر ہے اور جنات و ملائکہ سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود جب اس کی آنکھوں پر عقیدت کا غلاف چڑھ جاتا ہے تو وہ اس قدر پست ہو جاتا ہے کہ تمام مخلوقات سے اشرف اور بالاتر ہونے کے باوجود کبھی پتھروں کو سجدہ کرنے لگتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی حیوانات میں خدائی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے اور کبھی جنات و ملائکہ میں۔

اس میں یہ شعور بالکل مردہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مرتبہ ان تمام مخلوقات سے بالاتر ہے اور وہ اس بات کا حقدار ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے قبضہ میں ہو اور وہ تسخیر کائنات کا عمل انجام دے اور اس غفلت کے نتیجہ میں وہ ان سب کی خدائی کا اعتراف کر لیتا ہے

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ انسان کی فکر کو فطری بلندی سے آشنا بنانا چاہا ہے اور اسے یہ شعور دیا ہے کہ تیرا خضوع و خشوع اور تیری بندگی صرف اس ذات کو زیب دیتی ہے جو ساری کائنات سے بالاتر ہے اور اس کے علاوہ کائنات کی کوئی شے تیری بندگی کی حقدار نہیں ہے۔

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ — ایک مذہب اور ایک عقیدہ نہیں ہے، یہ ایک فطری شعور ہے جسے اسلام بیدار کرنا چاہتا ہے اور ایک فکری ارتقاء ہے جس سے اسلام آشنا بنانا چاہتا ہے۔

عقیدۂ توحید مٹ جائے تو انسانی شعور پست اور مردہ ہو جاتا ہے اور یہ عقیدہ زندہ ہو جائے تو انسانی شعور کو عجیب و غریب ارتقاء حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ان بلندیوں پر نگاہ رکھنے لگتا ہے جس کے آگے کل کائنات پست دکھائی دیتی ہے اور اس کی نگاہ کے سامنے مالک کائنات کے علاوہ کوئی شے نہیں رہ جاتی ہے۔

۲۔ امتیاز خالق و مخلوق

انسان کی ایک فکری کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ خالق اور مخلوق کے فرق سے بھی غافل ہو جاتا

[illegible] خالق کا درجہ دے دیتا ہے اور کبھی خالق کو مخلوق کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ [illegible] مذاہب میں بھی دونوں کمزوریاں پائی جاتی ہیں کہ بعض مذاہب نے مخلوقات [illegible] میں خالق کا درجہ دے دیا ہے جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب میں پتھر، درخت اور [illegible] اس منزل میں آ گئے ہیں، اور سارے دیوتاؤں میں شامل ہیں اس وجہ کے مالک [illegible] عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو یہ درجہ دے دیا ہے، اور یہودیوں نے حضرت عزیر [illegible] کر دیا ہے۔

[illegible] کے برعکس خدا کی تصویریں بنانے والے مذاہب نے ذہنی تصور کو خدا بنا کر [illegible] گویا خالق کو مخلوق کی صورت میں لے آئے ہیں۔

[illegible] عقیدۂ توحید کے ذریعہ ان دونوں کمزوریوں کا علاج کر دیا ہے [illegible] مخلوقات کی خدائی کا انکار کر کے مخلوق کو خالق بنانے سے روکا ہے [illegible] کو ان جنون و خیالات سے بالاتر قرار دے کر خالق کے ذہنی مخلوق بننے کا [illegible] حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "تمہارا ہر ذہنی تصور بھی [illegible] ہے اور وہ خدا نہیں ہو سکتا ہے کہ خدا ذہنوں کو پیدا کرنے والے [illegible] کا نام نہیں ہے۔

[illegible] عقیدۂ توحید نے خالق و مخلوق کے فرق کو سمجھنے کی دعوت دی ہے اور انسان [illegible] فکری کمزوری سے بچا لیا ہے۔

[illegible] خالق

[illegible] کا سوال یہ ہے کہ اگر دو خداؤں کا تصور کیا جائے تو [illegible] دونوں خداؤں میں یقیناً ایک شے مشترک ہو گی اور ایک شے امتیازی [illegible] جاتا ہے ورنہ دونوں ایک ہو جائیں گے، اور دوئی کا تصور ختم [illegible] مرکب ہوتی ہے تو اپنے اجزاء کی محتاج ہوتی ہے اور محتاج [illegible] مرکب ہے اس کو خدا ماننے [illegible] تنقیص [illegible]

نعمت سے بھی محروم کر دیتا ہے اور اس کی نظر میں [illegible] کے محتاج کا [illegible] مالک [illegible]
کا ادراک نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ بھی محتاج ہو جائے گا وجود سامان کائنات سے [illegible]
[illegible] کیسے پیدا ہوگی [illegible] کو اس سے بے نیاز بنا سکے گا۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان فطری طور پر گداگر ہو جائے گا اور [illegible] تصور کرنے لگے گا۔ اس لئے کہ گداگری خدائی میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ بھی [illegible] کی بھیک لے کر خدا بنتے [illegible]

لیکن اسلام کا عقیدۂ توحید اس سے کہیں زیادہ بلند تر اور پاکیزہ تر ہے۔ اس نے انسان کو ایک غنی مطلق اور بے نیاز حقیقی کا تصور دیا ہے جس سے اس کے ذہن میں بے نیازی کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس بے نیاز سے ربط پیدا کر لیا اور اس کا تقرب حاصل کر لیا تو ساری کائنات سے بے نیازی حاصل کی جا سکتی ہے اور انسان اس مرتبہ تک پہونچ سکتا ہے جس کا کوئی مشرک تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

۴۔ ارتباط با کمال مطلق

عالم شرک کے خدا محتاج ہونے کی بنا پر [illegible] نہیں سمجھے جا سکتے ہیں [illegible]۔ اس لئے کہ مالک مطلق کے سوا ہر [illegible] نقص اور عیب سے [illegible] محدود ہے اور محتاج ہوتا ہے اور ہر محتاج کا نقص ہوتا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید اس کمزوری سے کہیں زیادہ بلند رہے اور اس کا خدا کمال مطلق کا مالک ہے۔ جس میں کسی طرح کا کوئی عیب یا نقص نہیں پایا جاتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان جس قدر بھی اس سے قریب ہو جائے گا فطری طور پر اتنا ہی کمال سے قریب تر ہو جائے گا اور کمال سے قرب [illegible] کا شعور بھی عطا کر [illegible] دیتا ہے۔

کمال مطلق سے قریب تر ہونے کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے اور کوئی انسان نہیں ہے جو فطری طور پر زندہ رہنے [illegible] رکھتا ہو۔ لیکن [illegible] اس کے وسیلہ و ذریعہ سے ناآشنا ہے [illegible] سمجھتا ہے کہ یہ کام علم یا مال کے ذریعہ انجام [illegible] سکتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک خیال خام ہے۔ علم و مال میں بھی کمال مطلق کا تصور اس وقت

ممکن نہیں ہے جب تک خدائے وحدہٗ لاشریک کا تصور ذہن میں نہ ہو۔
اس لئے کہ اس کے علاوہ ہر ایک کا علم [illegible] ہے اور اس کے علاوہ ہر ایک [illegible] ہے اور جس کے پاس [illegible] دولت ہوتی ہے [illegible] کا مالک ہوتا ہے [illegible] مطلق کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔
کمال مطلق کے لئے مالک کائنات ہونا ضروری ہے اور یہ تصور [illegible] توحید [illegible] حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ یکسوئی

جناب یوسفؑ کے پاس قید خانہ میں قیدی خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لئے [illegible] کو تبلیغ دین کا بہترین موقع ہاتھ آگیا اور آپ نے قیدیوں کو پاس بٹھا کر ایک [illegible] ارشاد [illegible] ایک خدا [illegible] بہتر ہوتا ہے یا بہت سے متفرق [illegible] اس کے بعد قرآن حکیم نے [illegible] کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ اگر [illegible] شخص کے [illegible] ہو جائے اور ایک غلام کئی خداؤں کی مشترکہ ملکیت ہو تو [illegible] زندگی بہتر ہوتی ہے؟

ظاہر ہے کہ ایک [illegible] کا غلام [illegible] افراد کے غلام سے یقیناً بہتر ہوگا [illegible] کی زندگی [illegible] ایک ہی مالک کی [illegible] ایک ہی کے احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے [illegible] تمام [illegible] منشا کا [illegible] رہتا ہے [illegible] کی مرضی پر عمل کرنے کی فکر [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] یہی فرق ہے کہ مشرک مختلف خداؤں کا بندہ ہے اور اس کے [illegible] خداؤں کو راضی رکھنے کا خیال اور ان کی مرضی پر عمل کرنے کا تصور [illegible] سکون و اطمینان سے محروم کر دیتا ہے
[illegible] ایک خدا کا بندہ ہوتا ہے [illegible] ایک معبود کے احکام پر عمل کرتا

[illegible] کے لئے یہی عمل کافی ہوتا ہے، اور اسے کسی دوسرے خدا کو خوش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جو بات ذہن کو یکسوئی بھی عطا کرتی ہے وہ سکون و اطمینان بھی بخشتی ہے۔

دنیا کا ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ سکون و اطمینان کی زندگی گذارنے والا وہ عظیم کام [illegible] دے سکتا ہے جو [illegible] کا حامل انسان کبھی انجام نہیں دے سکتا ہے اور اس کے بے شمار نمونے پیغمبران توحید اور اصحاب شرک کی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور ان سے توحید اور شرک کے فرق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

توحید یک سکون و اطمینان کا سامان ہے اور شرک ایک انتشار و پراگندگی کا ذریعہ۔

۶۔ استمداد

خدائے وحدہٗ لاشریک کا عقیدہ انسان کے اندر یہ شعور بھی پیدا کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک قادر مطلق ہستی موجود ہے جو کسی وقت بھی اس کی امداد کر سکتی ہے اور وہ اس سے مدد طلب کر سکتا ہے اور یہ شعور انسان کی قوت ارادی میں ہزاروں گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ اور وہ کسی وقت بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔

اسلام میں "ایاک نستعین" کے ذریعہ پروردگار سے مدد مانگنے کا تصور یہی ہے کہ امداد کے لاکھوں چھوٹے بڑے وسائل سے بالاتر ایک قادر و توانا ہستی ہے جو ہر امداد کا مرکز اور منبع ہے اور اس کے علاوہ جن افراد سے بھی مدد مانگی جاتی ہے وہ خود بھی اسی کی امداد کے محتاج ہیں اور اسی کی بارگاہ میں دست طلب پھیلائے رہتے ہیں۔

لیکن جس کا عقیدہ یہ ہوگا اور صرف مخلوقات سے مدد مانگنے کا سلسلہ جاری رکھے گا تو اس کا [illegible] کسی وقت بھی مایوس ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ مخلوق کتنی ہی طاقتور اور [illegible] کیوں نہ ہو جائے اس سے بالاتر طاقت کا امکان باقی رہتا ہے۔ لیکن خالق سے بالاتر کسی طاقت کا تصور نہیں ہو سکتا ہے اور یہی عقیدہ انسان کو تمام طاقتوں کے مقابلہ میں عظیم ترین حوصلہ فراہم کر دیتا ہے جس کا کوئی جواب ممکن نہیں ہوتا ہے۔

۷۔ استسلام و سپردگی

دنیا کا نظام اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے ماننے والوں میں

[illegible] استسلام و سپردگی مزید ہو جائے۔ وحدانیت کی بقا قانون کی بقا کا سبب ہوتی ہے [illegible] انسان کو بغاوت پر آمادہ کر سکتی ہے۔ چاہے وہ بغاوت بعض احکام کے [illegible] پورے نظام کے مقابلہ میں۔

[illegible] توحید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان میں یہ احساس بیدار کر دیتا ہے [illegible] کو ماننے پر نہیں ہے، یہ خود بھی کسی مالک کی دین ہے کہ اس نے یہ وجود دے دیا [illegible] تصور بھی نہ ہوگا اور جب "انا" کا وجود بھی اسی کے ارادہ سے وابستہ ہے [illegible] تصور اس کے مقابلہ میں نہیں ہو سکتا ہے، اور جب اس کے مقابلہ میں [illegible] تو عقل و فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے کو اسی کے حوالہ کر دے [illegible] کام دیانت داری کے ساتھ اسی کی مرضی کے مطابق انجام دے اور [illegible] سپردگی ہے جو قانون کو صد فیصد رائج کر سکتا ہے اور اسے کامیابی کی ضمانت [illegible] سکتی ہے۔

[illegible] نجات از گروہ بندی

[illegible] خدائے وحدہٗ لاشریک سے کنارہ کش ہونے کے بعد جب انسان نے خدا بنانا شروع [illegible] عصبیت سے دوچار ہو گیا۔ خدا اس کا فردی عقیدہ [illegible] [illegible] دوسرے [illegible] [illegible] [illegible] کا کام شروع کر دیا [illegible] [illegible] کے نام پر جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

[illegible] توحید کا عقیدہ [illegible] کہ اس عصبیت کا بھی خاتمہ کر دیا [illegible] انسان کو یہ شعور [illegible] نہیں دلاتا ہے بلکہ [illegible] قوموں کو یہ [illegible] [illegible] [illegible] عظیم مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے [illegible] جس قوم کا خدا [illegible] [illegible] نہیں کر سکتا ہے۔ اسلام کا [illegible] توحید ہے اور اسلام کا نظام

توحید کا

۹۔ احساسِ مسئولیت

انسان کی صحیح [illegible] زندگی میں بہت بڑا ہوتا رہتا ہے کہ جس کے پاس دو طرح کے [illegible] ادنیٰ ہوتے ہیں، اس کا احساسِ ذمہ داری خود بخود کمزور ہو جاتا ہے، وہ کبھی اس کا سہارا لے کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور کبھی اس کی پناہ میں آکر اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ اس ذہنی بیماری کا بھی علاج کیا ہے اور انسان کو یہ تصور دیا ہے کہ تیرا خدا ایک ہی ہے اور اسی سے تجھے رجوع کرنا ہے اور اسی کی بارگاہ میں پیش کر جانا ہے۔ خبردار کبھی یہ احساس نہ ہو جائے کہ کوئی طاقت اس سے بھی بے نیاز بنا سکتی ہے اور جب ایسا کوئی امکان نہیں ہے تو عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کی بارگاہ میں جوابدہی کی پوری تیاری کے ساتھ حاضری دی جائے۔

۱۰۔ بقائے کائنات

عقیدۂ توحید نے انسان کو یہ شعور بھی دے دیا ہے کہ اس کائنات کی بقا کا راز "وحدت پروردگار" میں مضمر ہے ورنہ دو خدا ہوتے تو یا ان میں اختلاف کا شکار ہو جاتے یا ایک دوسرے کے مشورہ اور اس کی مدد سے کام کرتے۔

مشورہ اور مدد سے کام کرنے والے خدا نہیں ہوتے ہیں کہ خدا کسی کے مشورہ اور امداد کا محتاج نہیں ہوتا ہے اور محتاج کو خدا نہیں کہا جاتا ہے اور مستقل طور پر اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا کہ ایک کچھ کہتا اور دوسرا کچھ کہتا اور اس طرح یہ نظام درہم برہم ہو جاتا اور یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔ کائنات کی بقا اس بات کی دلیل ہے کہ مالکِ کائنات اور مدبرِ نظامِ عالم صرف ایک ہستی ہے اور اسی کے اشارے پر یہ کائنات چل رہی ہے۔

اور اسی دلیل سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی نظام کو باقی رکھنا ہے تو اس میں وحدت اور اتحاد پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔

[illegible] حکومت کی طاقت سے بے نیاز ہو جائے اس کے بعد [illegible] مشورہ [illegible] جیسے [illegible] کا مشورہ [illegible] کام شروع کرے [illegible] کام [illegible] کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

۱۱۔ سربلندی

عقیدۂ توحید کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ توحید کے ماننے والے کو دنیا کی کوئی طاقت جھکا نہیں [illegible] سکتی ہے [illegible] احساس رہتا ہے کہ میرے پاس [illegible] اور میں [illegible] سامنے خضوع و خشوع کا اقرار کر چکا ہوں اور اب کسی غیر کے سامنے سر جھکانے کا امکان نہیں ہے۔

اگر کسی شخص کو عقیدۂ توحید کی دولت حاصل نہیں ہے تو [illegible] کے سامنے [illegible] کا حوصلہ [illegible] کسی مخلوق کے آگے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ [illegible] مال و دولت، طاقت، منصب یا کسی اور وسیلہ سے اپنی برتری کا اثبات [illegible] حاجت روائی کرے گا اس کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ [illegible] ہے۔

توحید نے انسان کو اس منزل پر بھی سربلندی عطا کر دی ہے اور توحید کا [illegible] کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا ہے۔ امام حسین [illegible] کہ [illegible] ٹکڑے ٹکڑے [illegible] سر نہیں جھک سکتا ہے۔

۱۲۔ [illegible]ات از گداگری

[illegible] وحدہ لاشریک سے وابستگی کی طرف سے [illegible] آیا ہے [illegible] کو شرافت سمجھتا ہے اور اس سے بے نیازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا

[illegible] یہ کہ [illegible] ممکن بھی ہے اگر وجود پیدا ہو جاتا [illegible]
[illegible] اور جب یہ نہیں ہے تو اس کے سامنے دست سوال پھیلانے کا کام گداگری نہیں
بلکہ مطلب اصلی کی [illegible] بندگی کی اصالت کا مظہر ہے۔

لیکن اس [illegible] وجود [illegible] کی طرح یہ بھی ہے کہ کسی [illegible] کے سامنے ہاتھ پھیلانا
پڑے اور وہ ایک با شرافت اور باعزت زندگی گذارے کہ گداگری بہرحال ایک طرح کی ذلت ہے
جسے عزت دار [illegible] نہیں [illegible] سکتا ہے۔

اسلام نے اس مشکل کا بہترین حل عقیدۂ توحید کو قرار دیا ہے کہ انسان کے اندر ایک [illegible]
کا عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ غیر کو [illegible] نہیں سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے دست سوال [illegible]
کرے۔ [illegible] اس کے پروردگار سے ہے تو سے غیر کی ضرورت ہی کیا ہے [illegible] سوال
کرنے کو [illegible] ذلت اور اپنے عقیدہ کی کمزوری تصور کرتا ہے۔

[illegible] اس کے [illegible] کہ جیسے تیری ضرورت کا سامان فلاں شخص کے
پاس رکھ [illegible] سے جا کر طلب کرے تو سامان ضرور دے دیا جائے گا لیکن اس شخص کو مالک [illegible]
سمجھ کر نہیں بلکہ مالک کا امانت دار [illegible] سمجھ کر [illegible] اس طرح کسی احساس ذلت کا شکار نہ ہوگا
[illegible] درحقیقت مالک کا امانت [illegible] کے سامنے [illegible] تو ہاتھ پھیلایا ہے اور اسے جو کچھ ملا ہے وہ [illegible]
[illegible] بارگاہ سے ملا ہے۔

۱۳۔ امتیاز اصل و فرع

عقیدۂ توحید انسان کو یہ شعور بھی عطا کرتا ہے کہ سارے فضائل و کمالات و کرامات کا
سرچشمہ ایک ذات واجب ہے اور اس کے علاوہ کوئی فرد بھی ذاتی کمال کا مالک نہیں [illegible]
اور اس طرح اس عقیدہ کا مالک بڑی سے بڑی ہستی کو بھی دیکھ کر بلا کسی تحقیق کے [illegible]
کر دیتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ کسی کا دیا ہوا ہے اور یہ ذاتی کمال کا مالک نہیں [illegible]
اس کام کے لیے کسی مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص اس عقیدہ [illegible]
[illegible] وہ کسی وقت بھی دھوکہ کھا سکتا ہے اور بندہ کو خدا تصور کر سکتا ہے

[illegible] میں بعض کا وجود [illegible] میں توحید حقیقی کا فقدان ہی سبب بن گیا ہے کہ
[illegible] ہو گئے ہیں اور حضرت علی بن ابی طالب کو خدا کہہ دیا گیا ہے ورنہ توحید حقیقی کا
[illegible] ہوتا تو اس قسم کے بیمار تصورات نہ پیدا ہوتے، اور انسان ہمیشہ حقیقت آشنا رہتا۔

۱۴۔ [illegible] دقیق نظر

عقیدۂ توحید نے انسان کو [illegible] ایک بینش کی وہ دولت عطا کی ہے جس کا تصور بھی کسی دوسرے
[illegible] میں کیا جا سکتا ہے۔
[illegible] ہیں۔
۱۔ عوام الناس کی توحید، جس میں مخلوقات کا وجود ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ
[illegible] حاصل کی جاتی ہے۔ صرف یہ ضرورت ہے کہ اس مافوق وجود کو خالق نہیں کہا جاتا ہے۔
[illegible] کی توحید، جس میں مخلوقات کا وجود مستقل نہیں ہوتا ہے بلکہ خالق کے وجود کا ایک
[illegible] صفات کے مظہر کا درجہ رکھتی ہے۔
۳۔ [illegible] کی توحید جس میں مخلوقات کا وجود خالق کے اندر اس قدر فنا ہو جاتا ہے کہ
[illegible] ربوبیت نظر آتا ہے اور مخلوقات کا وجود اس طرح گم ہو جاتا ہے جس طرح
[illegible] صورت دیکھتا ہے اور [illegible] سے بالکل غافل ہو جاتا ہے

[illegible] دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

[illegible] شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

والسلام علی من اتبع الهدی

عدالت

توحید ہی کی طرح عدالت بھی پروردگار کی ایک صفت ہی ہے لیکن اسے بھی توحید ہی کی طرح اصولِ دین و مذہب کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح توحید پرست سے [illegible] اسلام [illegible] دین و مذہب کا [illegible] اسی طرح عدالت کے بغیر اسلام کے دوسرے سارے اصول بے بنیاد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نبوت کا دارومدار عدلِ الٰہی پر ہے۔ امامت کا سلسلہ عدلِ الٰہی کی بنیاد پر ہے۔ قیامت کا قیام اسی عدلِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ عدالت کے بغیر کسی عقیدہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے [illegible] دوسرے عقائد کا [illegible] رہ جاتا ہے۔

عدلِ الٰہی کے سلسلہ میں مختلف مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔

مفہومِ عدالت

عدالت [illegible] استقامت کا [illegible] [illegible] [illegible] کا [illegible] مخصوص [illegible]

[illegible] کی [illegible] جاتا ہے شریعت کی [illegible] واجبات پر عمل اور [illegible]

[illegible] معنی [illegible] حقوق کی [illegible] عدالت [illegible] حق کو اس کا حق [illegible]

[illegible] علم اخلاق کی اصطلاح میں عدالت ہر اچھی چیز کے اختیار کرنے [illegible] بری چیز سے [illegible]

[illegible] جس میں زندگی کا ہر شعبہ شامل ہو جاتا ہے اور عادل وہی ہے جس کی نگاہ میں کسی نیکی کو [illegible]

[illegible] حقوق [illegible] [illegible] رکھتا ہے

پروردگار کے بارے میں عدالت کا تصور تقریباً ایسا ہی ہے کہ اس کی عدالت [illegible] حقوق کی تقسیم تک محدود ہے اور [illegible] کا کوئی [illegible] درست ہے کہ اس کے بتائے ہوئے واجبات پر عمل کرے اور اس کے منع کئے ہوئے محرمات سے پرہیز کرے۔

یہ اور بات ہے کہ واجب اور حرام کا تعلق صرف شریعت سے نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی دوسری بنیادیں بھی ہوتی ہیں جن کا تصور پروردگار کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔

معیارِ حُسن و قبح

عدالت کے مفہوم میں اچھائی کے اختیار کرنے اور برائی سے الگ رہنے کے تصور کو شامل کرنے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟

اگر اچھائی اور برائی صرف شریعت سے پیدا ہوتی ہے تو صاحبِ شریعت پر اس کی کوئی [illegible] نہیں ہے اور وہ ہر طرح کے کام انجام دے سکتا ہے کہ برائی اسی وقت برائی بنے گی جب [illegible] برا کہہ دے گا ورنہ اس کے بغیر کوئی برائی برائی ہے اور نہ کوئی اچھائی اچھائی۔ تمام [illegible] اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ صرف شریعت کے احکام کے ذریعہ انہیں اچھائی [illegible] کا نام دے دیا ہے ورنہ اس کے علاوہ اچھائی اور برائی کی کوئی خبر نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کو تسلیم کر لینے کے بعد عدلِ الٰہی کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے ہیں کہ [illegible] پہلے کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہے کہ اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے کا نام [illegible]

[illegible] یہ ہے کہ یہ انداز فکر ایک مغالطہ اور فریب ہے [illegible] کو [illegible]

[illegible] کسی معنی میں فرض کی جائے۔ اس کا دائرہ شریعت کے [illegible] یقینی [illegible] کی حدود سے باہر ہے [illegible] افراد بھی حسن و قبح شیاء کے قائل ہیں [illegible]

[illegible] کے معنی یہ ہیں تو اس کا ادراک بھی تمام [illegible] فکر و نظر کو

حاصل ہے اور اس کا مفہوم استحقاق ثواب و عذاب کے معنی میں ہو تو اس کا ادراک بھی تمام انسانوں کو حاصل ہے اور سب اپنے اپنے نظریہ کے اعتبار سے عام دوسرا کا اعتقاد و تصور کرتے ہیں جا... اس کا نام شریعت کی زبان میں ثواب و عذاب رکھا جائے۔

ضرورت اور لزوم کا فیصلہ بھی صرف شریعت کے ہاتھوں میں نہیں ہے کہ شریعت کی حد سے باہر کوئی شے واجب ہو اور نہ حرام بلکہ اس کا دائرہ بھی شریعت سے زیادہ وسیع ہے... اس دنیا سے باہر رہنے والے بھی بعض امور کو واجبات کا درجہ دیتے ہیں اور بعض امور کو ... کا۔ مثال کے طور پر لامذہب اور بے دین افراد بھی بعض اخلاقیات کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور بعض غلافیات کے ترک کو لازم شمار کرتے ہیں، گرچہ ان کا کوئی عقیدہ کسی مذہب سے متعلق نہیں ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وجوب و حرمت کا ایک تصور شرعی ہے اور ایک تصور اخلاقی۔ ... انسان کی حکمت و حیثیت کے اعتبار سے بعض امور ضروری ہو جاتے ہیں اور بعض امور ممنوع اور حرام بن جاتے ہیں۔

رب العالمین کی عدالت کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے اوپر شرعی اعتبار سے کوئی شے واجب یا حرام نہیں ہے۔ لیکن حکمت و مصلحت کی بنیاد پر بعض امور کا اختیار ضروری ہے اور بعض کا ترک کرنا ضروری ہے۔ جس کا اظہار اس نے خود ... کیا ہے

- مثال کے طور پر ہدایت کے بارے میں اعلان کیا ہے "ان علینا للهدیٰ" ہدایت کرنا ہمارا فرض ہے۔
- "کتب ربکم علیٰ نفسه الرحمة" تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر لیا ہے۔
- "ومن یخرج من بیته مهاجراً الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله" جو شخص بھی اپنے گھر سے خدا ... کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے اور راستہ میں اسے موت آجائے اس کا اجر پروردگار کے ذمہ ہے۔

- ... الا علی الله رزقها" زمین پر چلنے والا ہے اس کا ... کا ... ہے
- ... ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار عالم نے بعض ... لازم قرار دے لیا ہے اور بعض امور کو قابل عمل بنا دیا ہے اور ... اپنے اعلان و انجام دیتا ہے اور یہی مفہوم اس کی عدالت کا ہے جس پر ... ہے۔
- ... بعد کو اپنے سے حرام کر لیتا تو معجزہ کا کوئی ... رہ جاتا۔
- ... تو نبوت و رسالت کا کوئی سلسلہ قائم نہ ہو سکتا۔
- ... اعمال پر جزا اور برے اعمال پر سزا کا وعدہ نہ ہو ... تو قیامت کی کوئی ... نہ ہوتا۔
- ... نہ ہوتا تو معجزات کے اظہار کا کوئی جواز نہ ہوتا۔
- ... کا پابند نہ ہوتا تو جنت و دوزخ کا تصور ایک بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ ... اسی عدالت سے وابستہ ہے اور اس کے بغیر کسی عقیدہ کا کوئی اعتبار ...

... یہ بھی ہے کہ حقوقی عدالت میں کسی بھی صاحب حق کو اس کا حق ... لازمی ہے ... لیکن کسی غیر صاحب حق کو وہ شے دیدینا ... دیا کوئی برا عمل نہیں ہے ... اگرچہ یہ بھی عدالت ... ہیں۔

... کا تقاضا ہے ... کے مرحلہ میں غیر حقدار کو حق ... دوسرے صاحب حق کی حق تلفی نہ ہو لیکن ...

یہی حال سزا کے مرحلہ کا ہے کہ سزا میں استحقاق سے زیادہ اضافہ کر دینا ظلم ہے لیکن [illegible] میں تخفیف کر دینا فضل و کرم کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ جس [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ عدالت کا دارومدار بقدر استحقاق دینے پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا [illegible] یہ ہے کہ جزا کا مرحلہ ہو تو اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی جائے اور سزا کا مرحلہ ہو تو اس میں کسی طرح [illegible] زیادتی نہ کی جائے ورنہ جزا میں اضافہ کر دینا یا سزا میں کمی کر دینا کسی عقل و منطق کے قانون میں [illegible] نہیں سمجھا جاتا ہے۔

معیارِ استحقاق

عدالت اور استحقاق کے رابطے کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے [illegible] [illegible] کی بنا پر سزا کا بہرحال حقدار ہوتا ہے — لیکن اچھے نیک اعمال کی بنا پر کسی جزا کا استحقاق نہیں رکھتا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس کا سارا وجود پروردگار عالم کا عطیہ ہے — لہٰذا اس کا فرض ہے کہ پورے وجود کو اس کی مرضی کے مطابق صرف کرے اور ہر لمحہ اس کی اطاعت کرے۔ اب اگر نافرمانی اور معصیت کرتا ہے تو یقیناً خلاف ورزی کی بنا پر سزا کا حقدار ہے لیکن اگر تمام زندگی اطاعت میں گزار دیتا ہے تو اس نے اپنے پاس سے کچھ نہیں [illegible] ہے جس کی اجرت یا قیمت کا حقدار ہو جائے بلکہ خدا کی دی ہوئی طاقت کو اس کی راہ میں صرف کیا ہے اور اس سے کسی طرح کا استحقاق نہیں پیدا ہوتا ہے۔

لیکن رب العالمین کو معلوم تھا کہ فلسفۂ استحقاق انسان کو مایوسی سے ہمکنار کر دے [illegible] اور اس میں کسی طرح کی تحریک عمل نہ پیدا ہو گی۔ اسے ہر آن سزا کا خوف [illegible] رہے گا لیکن [illegible] اور انعام کا اعتبار نہ پیدا ہوگا اور اس طرح ساری قوت عمل مفلوج ہو کر رہ جائے [illegible] اس لئے اس نے بندہ کو منزل اطمینان میں لانے کے لئے اور اس کی قوت عمل میں اضافہ [illegible] خاطر اس نے ثواب اجر اور انعام کا وعدہ کر لیا۔ تاکہ انسان کو یہ اطمینان ہو جائے کہ [illegible] طور پر اجر و ثواب کا حقدار نہیں بھی ہے تو پروردگار صادق الوعد ہے اپنے وعدہ کو ضرور [illegible] کرے گا اور اس طرح انسان کا کوئی عمل محروم اجر و ثواب نہ رہ سکے گا لیکن یہ بات بھی [illegible]

[illegible] کہ اس کی عدالت کا تقاضہ [illegible] یہ تسلیم کیا جائے کہ عدالت کی صورت میں [illegible] حقدار ہو گا اور ہر قسم کی ظلم و زیادتی سے پرہیز کرنا ہو گا تاکہ وعدہ کرنے والے پر وعدہ واجب ہو جائے [illegible] اطمینان قلب حاصل ہو جائے ورنہ عدالت کا انکار کر دیا گیا تو جس طرح عقل [illegible] اور اعتبار [illegible] ہو سکے گا اور ساری قوت عمل معطل ہو کر رہ جائے گی۔

[illegible] کے اس نکتہ کو نگاہ میں رکھنے کے بعد یہ حقیقت بھی واضح ہو [illegible] [illegible] کا حق اطاعت دیگر دوسرے حکام و والی کے حق اطاعت سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے حکام اور والیوں کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ انہیں بیان کے بغیر عذاب [illegible] نہیں ہے — اور حکام کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے غلام کو اپنے احکام سے آگاہ کریں [illegible] کہ اگر وہ کریں ورنہ اگر بیان ناتمام رہ گیا اور غلام پر حجت تمام نہ ہو [illegible] عدم امتثال پر سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔ صرف آقا کے حکم کا امکان اور احتمال [illegible] نہیں ہو سکتا ہے اس کی وسیع اور واضح تشریح ہو سکتی ہے۔ لیکن رب العالمین کا معاملہ [illegible] ہے وہ مالک حقیقی ہے۔ اس کی حکومت صرف احسان پر نہیں ہے بلکہ [illegible] ہے لہٰذا جب بھی اس کے کسی حکم کا احتمال و امکان پیدا ہو جائے بندہ کا فرض [illegible] ہے اس سلسلہ میں مولا کا کوئی واضح بیان موجود ہو یا نہ ہو — [illegible] [illegible] وجود پر حکومت نہیں ہوتی ہے۔

[illegible] کی اطاعت بیان کی محتاج نہیں ہے اس کی اطاعت امکان اور احتمال کی صورت [illegible] ہے کہ اس نے خود فضل و کرم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اس حق کو [illegible] رہے کہ جب تک حکم الٰہی تمام نہ ہو جائے وہ تمہیں عذاب کی طرف [illegible] حب نہیں ہے لیکن یہ فضل و کرم [illegible] [illegible] استحقاق کے اعتبار سے اس کا حق برقرار ہے [illegible] حق کو معاف [illegible] اعتبار سے اس کے حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے

عقیدۂ عدالت ——— نتائج و اثرات

توحید پروردگار کی طرح عدالت الٰہیہ کا عقیدہ بھی اسلام کا ایجاد کردہ [illegible] کی طرف سے ذہنوں پر مسلط کردہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کائناتی حقیقت کا اعتراف ہے جس پر [illegible] کا اتفاق ہے اور سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ کائنات کا نظام اس قدر مرتب و منظم ہے کہ اگر کوئی شے اپنی جگہ سے ایک انچ آگے پیچھے کر دی جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ سورج زمین سے ایک انچ قریب تر ہو جائے تو زمین جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے اور ایک انچ دور تر کر دیا جائے تو کائنات [illegible] منجمد ہو کر رہ جائے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے [illegible] انتہائی درجہ کا عادل ہے اور اس نے ہر شے کو اس کی واقعی جگہ پر رکھا ہے [illegible] کے عقیدہ سے [illegible] نہیں عدالت پروردگار کا کیا اعادہ ہوگا [illegible] توحید ہی کے مفہوم سے [illegible] کے بعد عدالت کا اقرار [illegible] فطری اور لازمی [illegible] جس میں کسی طرح کا تکلف نہیں ہوتا ہے۔

عالم اسلام کا بھی عدالت الٰہی کے مسئلہ میں مختلف اور واضح طریقہ پر [illegible] چند فلسفیانہ شبہات [illegible] کی مصالح پر مبنی ہے [illegible] اس حقیقت سے [illegible] کا سبب ہے [illegible] کی جگہ پر رکھی ہے اور [illegible] کی جگہ سے کوئی دوسرا [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] مخلوقات کی [illegible]

ابلیس اسی نکتہ سے غافل ہو گیا تھا کہ بنانے والا اس کی حیثیت سے بھی [illegible] اور [illegible] کی پاکیزگی سے بھی باخبر ہے [illegible] حق [illegible] آگ کی مخلوق کو خاک کی مخلوق کے سامنے جھکائے [illegible] سجدہ [illegible] انکار [illegible] عدالت الٰہیہ سے انکار کر [illegible]

(۲۲) انجام بھی [illegible] ہے۔

بہرحال عدالت الٰہی کا عقیدہ ایک ذہنی حقیقت ہونے کے علاوہ اپنے اندر چند فوائد و اثرات بھی رکھتا ہے جن کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کبریٰ کی طرف توجہ کرے اور اس کا اعتراف کر کے [illegible] اثرات سے استفادہ کرے۔

۱۔ اعتماد بر خدا

عدالت کا سب سے پہلا اثر یہ ہے کہ یہ عقیدہ انسان میں رب العالمین کی ذات اقدس اور اس کے احکام پر اعتماد پیدا کرتا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کو جب تک کسی ہستی کے کام پر اعتماد نہیں ہوتا ہے وہ نفسیاتی طور پر اس کی اطاعت کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے اور [illegible] عبادت [illegible] سرکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

[illegible] یہی ہے کہ عوام [illegible] کی عدالت پر [illegible] اس طرح [illegible] کی طرح [illegible] کر سکتے ہیں لیکن [illegible] طور پر [illegible] ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں [illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible] دلیل نہیں ہوتی ہے جو [illegible] شعور [illegible]

[illegible] دونوں [illegible] ہوتے ہیں [illegible] مذہب میں عدالت کو [illegible] اس کے احکام کے خلاف [illegible]

[illegible] عقیدہ [illegible] ایک حقیقت کے اعتراف کے [illegible] جعلی ہونے کی دلیل ہے [illegible] اسلام [illegible] حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ [illegible]

[illegible] کا قانون [illegible] نظم کائنات کا حق ادا کرنے والا [illegible] شعور [illegible]
کا [illegible] نہیں کر سکتا ہے ورنہ اس کے نظام کو طاقت [illegible] سکتا ہے۔

۲۔ عقیدۂ نبوت

انسان کا براہ راست اپنے پروردگار سے [illegible] نہیں ہو سکتا ہے ورنہ وہ اس سے براہ راست
[illegible] حاصل کر سکتا ہے۔

[illegible] ہیں [illegible] احکام کی ترسیل و تبلیغ کے لئے نبوتوں کو ذریعہ قرار دیا ہے [illegible]
[illegible] قوانین اور تعلیمات [illegible] کے ذریعہ بھیجے [illegible] احکام [illegible]
[illegible] قابل اعتماد ہو [illegible] احکام کا کوئی [illegible] رہ جائے گا۔
[illegible] کے قابل اعتماد ہونے کے [illegible] کہ ہر نبوت کا دعویدار کوئی ایسا
[illegible] کائنات [illegible] کے امکان میں نہ ہو تا کہ [illegible] کر سکے [illegible]
[illegible] سے الگ [illegible]
ہے۔

اس [illegible] کا نام اصطلاح مذہب میں معجزہ رکھی گئی ہے [illegible] اس کا اعتقاد [illegible]
[illegible] کہ پروردگار [illegible]
[illegible]
پروردگار نے اسے [illegible] اس طرح نبوتوں کا اعتبار [illegible]
اعتبار ختم ہو جائے گا۔
[illegible] اختیار کردہ کسی [illegible] دعوے [illegible] کسی
[illegible] کر لیا جائے [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] سکتا ہے [illegible]
[illegible] اعتماد [illegible]
[illegible] انسان [illegible] نظام کائنات کو دیکھنے کے [illegible]

[illegible] کی [illegible] کے عطا کئے ہوئے [illegible] پر اعتبار کر سکے۔

۳۔ احساس مسئولیت

کسی [illegible] کو غیر عادل اور ظالم تصور کر لیا جائے تو اس کے احکام کی طرف سے کسی طرح
[illegible] ذمہ داری کا احساس نہیں پیدا ہوتا ہے کہ وہ جب خود ہی کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا ہے
[illegible] کے کسی کام کا [illegible] نہیں ہے تو اس کی طرف سے اس میں ذمہ داری پیدا کرنے اور اس سے
[illegible] کی توقع کرنے [illegible] نہیں ہے۔
[illegible] نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے [illegible] کے عقیدہ کو اپنے بنیادی عقائد
[illegible] تاکہ انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو [illegible] سمجھے کہ جب مالک کائنات
[illegible] ہونے کے بعد بھی ذمہ داریاں خود قرار دیتا ہے اور [illegible] عمل بھی کرتا ہے تو دیگر افراد کا
[illegible] ہر حال ذمہ داری کا احساس [illegible] عالم کا وجود
[illegible]

تحریک عمل

[illegible] ہو جاتا ہے کہ ہمارا کوئی نیک عمل ضائع ہونے والا نہیں
[illegible] اس کا انعام ضرور ملے گا [illegible] طرح ہماری کوئی برائی یا کمزوری
[illegible]
[illegible] کی طرف قدم بڑھنے لگتا ہے [illegible]

[illegible] کے کام [illegible]
[illegible]

[illegible] کے پاس [illegible]
[illegible] کرنے کے [illegible] تلاش کرتا ہے

دونوں کے انجام دینے کی فکر میں رہتا ہے

اسلام اس فطری کمزوری سے باخبر تھا لہٰذا اس نے اصولی طور پر عدالت الٰہی کا عقیدہ ذہن انسانی کے حوالے کر دیا تاکہ اسے جزا و سزا کا مکمل عرفان رہے اور اس طرح اس کے قدم راہ خیر و اصلاح میں برابر آگے بڑھتے رہیں اور کبھی کسی برائی کا ارادہ بھی نہ کرے۔

۵۔ اعتماد بر مواعید

پروردگار عالم نے دوسرے جزا کے علاوہ بھی انسان سے بے شمار احسانات و انعامات کا وعدہ کیا ہے جو مختلف اعمال پر عطا کرنے والا ہے اور یہی وعدہ وہ ہے جو انسان کی قوت عمل کو تیز تر کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ خیرات و صدقات پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن خود اس وعدہ کا اعتبار بھی اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب صاحب وعدہ کو عادل تسلیم کر لیا جائے ورنہ اس کی عدالت کا انکار کر دیا گیا اور اس میں شبہ پیدا ہو گیا تو اس کے وعدہ کا بھی اعتبار ختم ہو جائے گا اور اس طرح قوت عمل خود بخود کمزور ہو جائے گی اور عالم کائنات بے شمار فوائد سے محروم ہو جائے گا۔

۶۔ ایجاد عدالت در حیات

مثل مشہور ہے کہ انگور کی بیل درخت کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے۔ درخت لمبا ہوتا ہے تو بیل دور تک آگے بڑھ جاتی ہے اور درخت کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں تو بیل کی ترقی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس مثل کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے ایک نمونہ عمل بہرحال درکار ہے اور اس کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

یہ نمونہ کبھی نظریہ کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی کردار کی شکل میں — اور دونوں کی الگ الگ تاثیر ہوتی ہے۔

اسلام نے اسی نقطہ نظر کے تحت انسان کو عدالت الٰہیہ کا عقیدہ [illegible] ایک مثالیہ [illegible] اور وہ اس مثالیہ کی روشنی میں قدم آگے بڑھائے [illegible] کائنات میں [illegible]

کائنات ظلم کے راستے پر چل پڑے گی، اور اس کی عدالت کا احساس اور عقیدہ پیدا ہو جائے گا تو انسان اپنی ذاتی زندگی میں بھی عدل و انصاف کا خیال رکھے گا اور نظام کے بارے میں بھی عدل و انصاف سے کام لے گا۔

عدالت الٰہیہ سے محرومی نے انسان کی زندگی کو بالکل غیر متوازن بنا کر رکھ دیا ہے اور یہی عقیدہ ہے جو انسان کو دوبارہ قانون حیات اور عدالت نظام کے راستے پر لا سکتا ہے۔

۷۔ فنائے ظلم

عدالت الٰہیہ کا عقیدہ جہاں ایک طرف زندگی میں عدالت پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے وہاں دوسری طرف ہر قسم کے ظلم سے اجتناب اور اس کے فنا کرنے کی کوشش پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح اگر سارے معاشرہ میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے اور سب عدالت کے پابند ہو کر ظلم سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو سماج اور معاشرہ سے ظلم یکسر فنا ہو سکتا ہے اور انسانیت کو امن و سکون و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

دنیا کے سارے مفکرین اور سارے نظام ہائے حیات کی مسلسل کوشش کے باوجود ظلم کا [illegible] اس بات کی علامت ہے کہ سماج کے ذہن میں عدالت الٰہیہ کا عقیدہ نہیں ہے اور اس کے [illegible] مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے ورنہ جب یہ عقیدہ عام ہو جائے گا تو ظلم وجود [illegible] اور عدل و عدالت کا نظام قائم ہو جائے گا۔

[illegible]وا باخلاق اللہ

[illegible] کا تقاضا ہے کہ انسان عظمت اور سربلندی حاصل کرنے کے لئے [illegible]
[illegible] اور اس کے طریقہ کار کو اپنانے کی کوشش کرے [illegible] اسلام نے بھی
[illegible] سے تعبیر کر کے اس کی دعوت دی ہے تاکہ [illegible]
[illegible] کردار کو اپنانا چاہئے اور مالک کائنات سے [illegible]

[illegible] انسان کو خلافِ الٰہی اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

اب اگر دوسری طرف عدلِ الٰہی کا عقیدہ نہ ہوگا تو ہر انسان عظمت حاصل کرنے کے لئے ظلم و ستم کی روش اختیار کرے گا اور جس قدر ظلم بڑھتا جائے گا اپنے کو اسی قدر عظیم شخصیت کا حامل تصور کریگا لیکن اگر عدالتِ الٰہیہ کا عقیدہ پیدا ہو گیا تو فطری طور پر عظمت و برتری کے لئے عدل و انصاف کی روش اختیار کرے گا اور اس طرح معاشرہ میں "اخلاق الٰہیہ" اختیار کرنے کے نام پر عدل و انصاف عام ہو جائے گا۔

۹۔ نفرت از ظالمین

یہ بھی ایک فطری مسئلہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے محبوب سے محبت اور اس کے دشمن سے دشمنی کرنے لگتا ہے۔ بندہ خدا فطری طور پر اپنے پروردگار سے محبت کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کے محبوب سے محبت کرتا ہے۔ اب اگر پروردگار کی عدالت کا عقیدہ رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ اس کا محبوب بھی عدل و انصاف کرنے والا ہی ہوگا، اور وہ ظالم اور ستمگر سے محبت نہ کرے گا بلکہ نفرت ہی کرے گا اور اس طرح اس کے دل میں فطری طور پر انصاف پسند افراد سے محبت پیدا ہوگی اور ظالمین سے نفرت و بیزاری کا جذبہ بیدار ہو جائے گا جو سماج و معاشرہ کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہوگا۔

۱۰۔ احساسِ قوت

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عدل و انصاف کا جذبہ کمزور افراد کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور جب انسان قوت و طاقت حاصل کر لیتا ہے تو ظلم و ستم کی روش اختیار کر لیتا ہے لیکن ائمہ معصومین کے بیانات میں اس کے بالکل برعکس جو بات پائی جاتی ہے جہاں اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ "[illegible] محتاج الی الظلم الضعیف" ظلم کی ضرورت صرف کمزور افراد کو ہوتی ہے۔ ورنہ طاقتور افراد ظلم و ستم کی روش اختیار نہیں کرتے ہیں۔

ظالم اپنی کمزوری کے احساس پر پردہ ڈالنے کے لئے ظلم و ستم کا طریقہ اختیار کرتا ہے تاکہ کوئی شخص اس کی داخلی کمزوری کا اندازہ نہ لگا سکے اور اس کا ذہن ظاہری طاقت میں گم ہو جائے۔

مذہب عدالتِ الٰہیہ کا عقیدہ رکھنے والا عدل کی طرف سے باخبر ہے، [illegible] سمجھ سکتا ہے کہ داخلی کمزوری سے نجات حاصل کرنا ہے تو عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرنا ہوگا کہ "علیٰ کل شیء قدیر" پروردگار بھی عدل و انصاف [illegible] ہے اور ظلم و ستم نہیں کرتا یہ اس بات کی علامت ہے کہ عدل و انصاف طاقت کی علامت ہے کمزوری کی علامت نہیں ہے۔

۱۱۔ قدرِ احسان

اسلامی روایات میں ایک حدیث یہ بھی وارد ہوئی ہے کہ مزدور سے کام لینے سے پہلے اس کی اجرت طے کر لو، کہ اجرت طے نہ کرنے کی صورت میں جس قدر بھی دے دو گے مزدور مطمئن نہیں ہوگا اور اسے یہی خیال رہے گا کہ میرا حق اس سے زیادہ ہے۔ لیکن اگر اجرت پہلے سے مقرر ہو گئی ہے تو [illegible] عدل و انصاف کا حق ادا ہو جائے گا اور اس کے بعد بھی کچھ زیادہ دیا جائے گا تو اس کا حساب [illegible] احسان ہوگا اور وہ [illegible] شکر گزار [illegible] جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جب تک عدل کا تصور نہیں ہوتا ہے احسان کی قدر [illegible] ہے۔

[illegible] عدالت کا عقیدہ اس لئے [illegible] ہے کہ انسان [illegible] کے احسانات [illegible] اور شکر گزار [illegible] کی طاقت زیادہ ہو جائے۔

[illegible]بات

[illegible] حضرت علی بن ابی طالب نے عدل و ظلم کا فرق واضح کرتے ہوئے [illegible] عدل [illegible] ہوگی [illegible] ظلم [illegible] تنگی

عام طور سے لوگوں کا خیال یہی ہوتا ہے کہ ظلم کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے اور دوسری تنگ عدل و انصاف کی ہوتی ہے جہاں انسان کے ہاتھ چاروں طرف سے بندھے ہوئے ہیں۔ ورنہ انسان ظلم و جور پر اتر آتا ہے تو اس کے ہاتھ بالکل کھل جاتے ہیں اور جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے جس کی طرف سے لوگوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

ظلم ظالم کے لئے وسعت اور آزادی پیدا بھی کر دے تو دیگر افراد کے لئے عرصۂ حیات یقیناً تنگ ہو جائے گا۔ عدل و انصاف کے برتاؤ کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے، ورنہ وہ بھی معین ہوتا ہے کہ اسی تصور میں مقتضائے عدل و انصاف کیا ہے۔ لیکن ظلم و جور کے ہزار راستے ہوتے ہیں اور ان کا کوئی معین نہیں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد ایک مستقل بے چینی کا شکار رہتے ہیں اور کسی کو سکون کا احساس نصیب نہیں ہوتا ہے

عرصۂ حیات کو تنگ کر دینے کا نام ہے ظلم اور زندگی کے سلوک میں وسعت، سکون، اطمینان کے پیدا کر دینے کا نام ہے عدل و انصاف۔ اسلام کا عقیدۂ عدل انسان کے نفس میں ایک طرح کا سکون و اطمینان پیدا کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی عمل ضائع ہونے والا نہیں ہے اور اس پر ظلم کرنے والا مستقل سکون و اطمینان حاصل کرنے والا نہیں ہے۔ ایک نہ ایک دن اپنے ظلم کا انجام ضرور دیکھے گا اور دوسروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے والے پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔

۱۳۔ سعی پیہم

انسانی زندگی کا فطری قانون ہے کہ اس دار دنیا میں انسان کا حصہ بقدر سعی و کوشش ہی ہوتا ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ" انسان جس قدر بھی کوشش کرتا ہے اسی قدر نتیجہ حاصل کرتا ہے۔ کوشش سے زیادہ نتیجہ کی توقع کرنا ایک قسم کا وہم اور جنون ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

یہی حال عالم جزا و سزا کا بھی ہے کہ یہ نظام قوانین فطرت کے عین مطابق ہے۔ انسان کو اصولی طور پر اتنے ہی انعام کی توقع رکھنی چاہئے جتنا اس نے عمل کیا ہے۔ عمل کے

[illegible] انعام کی توقع ایک خیال خام سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر بھی نتائج کا امیدوار ہوگا اسی قدر عمل بھی کرے گا اور اسے یہ احساس رہے گا کہ اگر رفتار عمل سست ہو گئی تو نتائج کی توقع بھی ایک وہم و خیال ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن یہ سب اسی وقت ہوگا جب انسان کے ذہن میں عقیدۂ عدل ہوگا۔ ورنہ یہ عقیدہ [illegible] تو انسان کو یہ خوف رہے گا کہ انسان محنت کرے گا لیکن نتیجہ سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح رفتار عمل خود بخود سست ہو جائے گی اور دنیا بے عملی کا شکار ہو جائے گی۔

۱۴۔ اہمیت مصالح

عدالت "وضع الشیئ فی محلہ" ہر چیز کو اس کے محل و مقام پر رکھنے کا نام ہے۔ اور محل و مقام کی تعیین کوئی ریاضی کا مسئلہ نہیں ہے کہ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں۔ کبھی پانچ بھی ہو سکتے [illegible] زندگی کا مسئلہ ہے جس میں اخلاقیات، سیاسیات، اقتصادیات، نظریات اور تمام شعبہ ہائے [illegible] ہوتا ہے جس کو جمع کر کے کسی شے کے محل و مقام کا تعین کیا جاتا ہے اور اس طرح عدالت میں مصالح کا بہت بڑا دخل ہو جاتا ہے کہ ایک شے مصالح سے الگ ہو کر دوسرا مقام رکھتی ہے [illegible] لحاظ کے ساتھ دوسرا مقام رکھتی ہے۔

[illegible] کرنے کے لئے حالات سے قطع نظر دوسرا مقام ہے اور حالات کے لحاظ سے دوسرا مقام [illegible] حالات کے اعتبار سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اکثر و بیشتر مسائل میں [illegible] سے صحیح منزل و مقام کا تعین بدل جاتا ہے۔

[illegible] جا سکتا ہے کہ عدل و ظلم کی دنیا میں مصالح و مفاسد کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے [illegible] راسخ ہوتا جائے گا مصالح کی اہمیت اور ان کا اعتبار بڑھتا جائے گا، اور [illegible] ان کو مصالح کی اہمیت سے آشنا بنا دیتا ہے اور اسے کسی وقت بھی اس [illegible] دیتا ہے۔

[illegible] رکھنے کے بعد یہ فیصلہ بہت آسان ہے کہ اسلام میں عقیدۂ عدالت [illegible] تعلیمات سے بھی ہے، اور نظام حیات سے بھی ہے۔ عدالت کا اثر

فطرت بشر کے مسلمات سے بھی انکار ہے اور نظامِ زندگی کی اصلاح سے بھی انحراف ہے۔

عالمِ اسلام کی ایک بڑی اکثریت نے یونانی شبہات یا سیاسی مصالح کی بنا پر عدالتِ الٰہیہ سے انکار کر کے اس قدر نقصان برداشت کیا ہے جس کی تلافی تا قیامت ممکن نہیں ہے۔

اس مہمل اور بے معنی انکار نے نبوتوں کا اعتبار ختم کر دیا ہے اور عقیدۂ المسلمین کے لئے رسالتِ الٰہیہ کو بنی ہاشم کا کھیل کہنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس مہمل انکار نے مسئولیت کا احساس ختم کر دیا ہے جس کی بنا پر ابوسفیان خلیفۂ ثالث کو مشورہ دینے لگا ہے کہ سلطنت کو گیند کی طرح نچاؤ اور مرکزی مقام بنی امیہ کے حوالے کر دو کہ جنت و جہنم کا تصور ایک مہمل وہم و خیال کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے عذاب کا خوف ختم کر دیا ہے اور تحریکِ عمل کو معطل کر دیا ہے وہ صوفیوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی زندگی کا مقصد مکاری اور عیاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے ظلم کو رواج دے دیا ہے اور عدل و انصاف کو بے سر و سامان بنا دیا ہے کہ ظالموں کے ساتھ ایک پوری دنیا ہے اور مظلوم کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔

اس مہمل انکار نے ظالمین سے نفرت کا جذبہ فنا کر دیا ہے اور انہیں کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔

اس مہمل انکار نے انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے اور ظالموں کے لئے میدان حیات کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اس مہمل انکار نے قوائے عمل کو معطل کر دیا ہے اور مصالح کی عظمت و اہمیت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ عدالت کا عقیدہ اسلامی عقائد میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ عقیدہ فنا ہو گیا تو سارا دین خاک میں مل جائے گا اور اسلام کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔

رب کریم امتِ اسلامیہ کو بیدار ہونے کی توفیق کرامت فرمائے اور شعورِ عدالت کی سے بہرہ ور فرمائے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

نبوّت

... کوئی شک نہیں ہے کہ کائنات بشریت کے پیدا کرنے والے نے ہے گوناگوں ... کو اس عالم میں پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی ذات سے بھی بے خبر تھا۔ لیکن ... بھی پیدا کی ... نے مستقبل میں بے خبری کو خبر دار اور واقعیت کو واقعیت ... ہی طرح کی صلاحیتوں سے سرفراز فرما دیا۔

... علم سماعت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لہذا پہلے سماعت کی طاقت دی کہ اگر ... کو قوت عنایت فرمائی اور آخر میں دل و دماغ دے کر علم و اطمینان کا ...

... ری ہے کہ حسب صلاحیت دھیرے دھیرے ان طاقتوں کو استعمال ... بات کو علم میں تبدیل کرے۔ یہ کوشش تمام ... کے لئے ضروری تھی کہ وہ ... ٹھانے کے قابل نہیں تھے ... جہالت کو علم سے تبدیل کر ... زندگی کا ساتھ دینے کے لئے علم ضروری ہے۔ علم کے علاوہ زندگی

... ت اور قوت دل و دماغ کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ ... دینے والا تیر نے کے لئے پانی بھی پیدا کرے۔"

... م کی اشیاء پر منقسم ہوتی اور اس کی مادی سمعیات بصریات ... اور ... عالم و حکمت سے عاری ہو جاتا اور اس کی تخلیق کا سبب ... سلامتی ... نے مصرت اور بعض اعضاء فضول پیدا کر دیئے ہیں اور یہ

ایک حکیم علی الاطلاق ہستی کی ذات سے بعید ہے۔

جس نے اپنی حکمت و عدالت کے تحفظ کے لئے اس کائنات کو تین حصوں پر تقسیم کر [illegible]

— بعض چیزوں کا علم سن کر حاصل ہوتا ہے اور یہ انسان کا سب سے پہلا وسیلۂ علم [illegible] آغوش مادر میں پلنے والا بچہ — دیکھنے، دیکھنے کے لائق بھی ہو تو پکارنے والے کی آواز [illegible] اور خطرہ کی آہٹ محسوس کر لیتا ہے۔

— بعض چیزوں کا علم دیکھ کر حاصل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ بعض اوقات سموعات [illegible] وسیع تر ہو جاتا ہے کہ سماعت کا زور چند گز سے زیادہ کے فاصلہ کو برداشت نہیں کرتا ہے [illegible] کی زد میں شمس و قمر، نجوم و کواکب بھی آ جاتے ہیں، اور اسی لئے اس طاقت کی کارکر[illegible] سلسلہ بعد میں شروع ہوتا ہے کہ جتنے وسیع تر عمل کے لئے توانائی اور طاقت کی ضرورت ہے [illegible] جب تک اتنی وسیع دنیا کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو اسے اس قدر وسیع علم نہیں دیا جا سکتا —

— ان دونوں محسوسات کے علاوہ ایک عالم معقولات کا ہے جو نہ سماعت کی زد میں [illegible] اور نہ بصارت کی — [illegible] کا ذہن کی رسائی ہے اور نہ آنکھوں کی — آنکھیں نظام شمسی [illegible] چھوٹے چھوٹے ستاروں کا مشاہدہ کر سکتی ہیں — لیکن اس کے دروبست پر وہ جو ہستی ہے اور [illegible] کن سے یہ کائنات عالم وجود میں آئی ہے اور جس کے تقاضائے فضل و کرم سے یہ نظام چل رہا ہے — اس تک نظر کی رسائی نہیں ہے، اور اس کے عرفان کے لئے عقل کی رہنمائی [illegible] دماغ کی راہ پیمائی کی ضرورت ہے اور وہ دیکھا جا سکتا ہے لیکن [illegible] سے [illegible] کے ذریعہ —

لہٰذا کائنات کو تین حصوں پر تقسیم کر کے اور انسان کو تین طرح کی صلاحیتوں سے نواز [illegible] میں بھیجنے والے کی نگاہ میں ایک مسئلہ اور بھی تھا کہ وسائل ابتدائی طور پر صرف عالم تکوین [illegible] سکتے ہیں، اور ان سے [illegible] کائنات کے ادراک کا کام لیا جا سکتا ہے — لیکن اس کی [illegible] کا طریقہ کیا ہوگا۔ اس کے حق میں کون سے محسوسات یا مرئیات خیر ہیں اور کون [illegible] اس کا مستقبل حیات و موت کن امور سے وابستہ ہے — وہ اعمال و افعال کی دنیا میں کن کو اختیار کر سکتا ہے اور کن سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ وسائل سماعت و بصارت اور [illegible]

[illegible] — اور اس کا ثبوت خیر و شر، صلاح و فساد اور حسن و قبح [illegible] کا اختلاف ہے جو اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مسائل ہر عقل کے [illegible] و عقلاء عالم کے درمیان اس قدر شدید اختلافات رہا ہے۔ یہ اختلاف پکار [illegible] اپنے صلاح و فساد اور اپنے مستقبل کے فیصلہ سے عاجز ہے۔ وہ اپنی [illegible] ہے — اس کے حقیقی تقاضوں سے کس طرح آشنا ہو جائے گا۔

[illegible] ہے کہ پیدا کرنے والا ہے اس کے خیر و شر اور صلاح و فساد سے باخبر [illegible] ہو تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی [illegible] کے پیدا کرنے

[illegible] کر انسان کو اس سے باخبر کیا جائے تو مجرم [illegible] کو شمار کیا [illegible] ایک واقعہ نہیں ہے [illegible] کرم پروردگار کی [illegible] آگیا ہے اور اس دنیا میں زندگی گزار رہا ہے جہاں چاروں طرف [illegible] زہر پایا جاتا ہے — لہٰذا اب بنانے والے کی ذمہ داری ہے [illegible] کہ وہ ہلاک بھی ہو تو تمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور دعوت [illegible] ذمہ داری ادا ہو جائے۔

[illegible] و حکمت و مقتضائے فضل و کرم کو پورا کرنے کے لئے [illegible] واقف رکھتے ہیں — وہ انھیں خیر و شر اور [illegible] تاکہ وہ خود تباہ و برباد نہ ہو سکیں اور [illegible] ہوں۔

[illegible] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سب کی مشترک صفت یہ ہے کہ [illegible] سے براہ راست بغیر کسی انسانی وسیلہ کے حاصل کرتے ہیں [illegible] ہو جاتے ہیں۔

[illegible] کے عمل کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو خیر و صلاح و فلاح [illegible]

— بعض سب سے زیادہ ذمہ داری رکھتے ہیں کہ اپنے ذاتی عمل کے علاوہ [illegible]
کو بھی دوسرے آگاہ کرتے رہیں تاکہ جاہل انسان تباہ و برباد نہ ہونے پائے [illegible]
کو رسول کہا جاتا ہے۔
— بعض مرسلین، ان سے بھی بالاتر ہوتے ہیں کہ انہیں صرف تبلیغ
کی ذمہ داری نہیں [illegible] جانب سے مکمل قانون بھی دیا جاتا ہے جس کی تبلیغ [illegible]
دوسرے مرسلین بھی کرتے ہیں [illegible] اس کی تبلیغ و ترویج [illegible] اور مرسلین کی ذمہ داری
ہے۔ ایسے افراد کو پیغمبر [illegible] اولوالعزم کہا جاتا ہے۔ جن میں [illegible] جناب ابراہیم [illegible]
جناب عیسیٰ اور سرکار دو عالم کا اسم گرامی شامل ہے اور انہیں پانچ حضرات کو صاحبان [illegible]
کہا جاتا ہے۔

ضرورت نبوت

انسانی علم خیر و شر اور صلاح و فساد کے تمام امکانات کے لیے کافی ہوتا تو [illegible]
کی کوئی ضرورت نہ ہوتی — لیکن تجربہ کی بنیاد پر بھی انسانی علم اس قدر [illegible]
کا مختصر [illegible] تجربات پر [illegible] اجتماعی مسائل کے تجربہ کے لیے نسلیں درکار ہوتی ہیں
کوئی ایک شخص تجربہ کر سکتا ہے [illegible] انسانیت صلاح و کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔
اجتماعی خیر و شر کا مسئلہ [illegible] کے تجربہ کا نہیں ہے [illegible] ایک آدمی کی زندگی [illegible]
مکمل کر سکتا ہے [illegible] کا تجربہ [illegible] سماج پر تطبیق کرنا ہوگا [illegible]
ردعمل کا جائزہ لینا ہوگا [illegible] ہونے کا فیصلہ [illegible]
[illegible] کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوگا [illegible] دوسرا شخص [illegible] تجربہ [illegible]
کے تجربات کا طفیلی [illegible] تیار کیا جائے گا جس کا علم قطعی اور یقینی [illegible]
[illegible] ضرورت [illegible] ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی اور سماجی مسائل
کی [illegible] ایک آدمی [illegible] ہے۔ انہیں اس کا [illegible]
[illegible] یہ کام [illegible] کے تجربہ کے لیے رسول [illegible]

[illegible] تجربہ ناتمام یا غیر یقینی ہی رہ جاتا ہے۔
[illegible] لازم تھا کہ اس انسان کو ان تمام زحمتوں سے بچائے اور [illegible]
[illegible] سلسلہ قائم کر دیا جس سے عام انسانیت خیر و شر اور صلاح و فساد کا علم
[illegible] اس طرح [illegible] اور بربادی کا شکار نہ ہو سکے۔ انبیاء و مرسلین کی ضرورت
[illegible] اس طرح انسانی عقل معطل ہو کر رہ جائے گی اور سارا ہم فکر و نظر چند
[illegible] کا ایک مجموعہ اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ زندگی کے سارے
[illegible] دوسروں پر اعتماد کرتے رہیں اور کہیں بھی اس اعتماد کو اپنی عقل و فکر کی
[illegible]

[illegible] جانتے [illegible] سبزی فروش سے دریافت کرتا ہے کہ کون سی سبزی
[illegible] سی سبزی سرد ہے یا گرم، مفید ہے یا مضر — اور ایسے مرد عاقل کے عاقلانہ
[illegible] دانشوری کی توہین تصور نہیں کرتا ہے۔
[illegible] بار میں یہ احساس رہتا ہے کہ دانشوری کا میدان الگ ہے اور
[illegible] کی دنیا الگ ہے — لیکن جیسے ہی زندگی کے میدان میں قدم رکھتا
[illegible] کہ انبیاء و مرسلین پر اعتماد در حقیقت عقل بشری کی توہین ہے۔
[illegible] مرسلین عام [illegible] نہیں ہیں [illegible]
[illegible] کے پاس وہ علم ہے جو مالک کائنات نے براہ راست
[illegible] کی تمام کمزوریوں کا علم نہیں خود ان کی طرف سے [illegible]
[illegible] جس طرح خود خالق پر [illegible] ضروری ہے کہ [illegible]
[illegible] کے نیچے [illegible] ہوئے وہم [illegible] کے مقابلے میں
[illegible] کا نام ہے — لیکن جب ان کے پاس خدائی علم [illegible] احکام
[illegible] ہوتا ہے۔
[illegible] ان کے پاس خدائی بارگاہ سے آئے اور علم و عمل ہمراہ [illegible]
[illegible] پاس سرمایہ ختم کر دے۔

مذہب نے اس مسئلہ کا حل معجزات کے ذریعہ نکالا ہے۔ اور معجزہ دراصل اس خارق عادت کام کا نام ہے جس کا جواب اس دور کے انسانوں سے ممکن نہ ہو، تاکہ دنیا یہ اعتراف کر سکے کہ اس شخص کا تعلق کسی مافوق بشر طاقت سے ہے اور اس کا کوئی عمل اس کی بشری طاقت کا نتیجہ نہیں ہے۔

معجزہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے نبی نمائندگی کا دعویٰ کیا جائے۔ اس کے بعد معجزہ پیش کیا جائے تاکہ مالک کائنات پر یہ ذمہ داری ہو کہ یہ شخص غلط بیانی کر رہا ہے تو اس کی تکذیب کی جائے ورنہ عالم انسانیت کی گمراہی کی ذمہ داری خود اس کی ذات اقدس پر آجائے گی۔ اور اگر عالم غیر معمولی عمل انجام دینے کے بعد کوئی شخص اپنے کو نمائندۂ پروردگار کہہ دے تو اس عمل کو معجزہ نہیں کہا جائے گا اور ایسی صورت میں رب العالمین پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسانوں کے ادراک کی حدود کے اندر ہو ورنہ سماجی زندگی سے بالکل اجنبی عمل ہوگا تو لوگ اس کے پیش کرنے والے کو مجنون اور دیوانہ کہیں گے، نبی یا رسول تسلیم نہیں کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ رب العالمین نے ہمیشہ معجزات حالات کو دیکھ کر عنایت کیے ہیں اور جس دور میں جس طرح کے کمال کا رواج تھا اس دور کے پیغمبر کو ویسا ہی معجزہ عنایت فرمایا ہے تاکہ سماج اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی عاجزی کا اقرار کر سکے اور اس طرح معجزہ صاحب معجزہ کو نمائندۂ پروردگار ثابت کر سکے۔

اس موقع پر یہ بات ضرور باقی رہ جاتی ہے کہ اس طرح وقتی معجزہ قانون [illegible] علامت ہو سکتا ہے اور کیسے دائمی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ جس طرح کا قانون بنایا جائے اسی حساب سے نمائندہ کو معجزہ عنایت کیا جائے۔ چنانچہ رب العالمین نے گذشتہ انبیاء کو ایسے معجزے عنایت کئے جو انہیں کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئے کہ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئے [illegible] قانون [illegible] کی زندگی کے اثبات کے لئے کوئی معجزہ ضروری تھا۔ لیکن سرکار دو عالم کے قانون کو [illegible] معجزات عنایت کئے جن میں [illegible] آپ کو ایک طرف قرآن حکیم کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ [illegible] مقابلہ پر [illegible] طلب [illegible] اور انھیں مطلب [illegible]

[illegible] جا سکے۔ اور دوسری طرف اسی قرآن کو قانون زندگی اور [illegible] کا مجموعہ بھی بنا دیا تاکہ [illegible] حیثیت صرف عرب کے دور [illegible] قابل تسلیم نہ ہو بلکہ باہر کی دنیا بھی اس کے سامنے تسلیم خم [illegible] اور مستقبل بھی اس کی بلندی کی گواہی دے سکے۔

اس کے ساتھ کچھ دوسرے معجزات عنایت کرتے جو ہر دور کی ترقی کا جواب دیتے رہیں اور [illegible] قانون و رسالت کا اعلان کرتے رہیں۔ [illegible] کے دور میں معجزہ کام آ سکے اور [illegible] کی ترقی کے دور میں سنگریزوں کی تسبیح دلیل عظمت بن سکے۔ اگرچہ ان معجزات کا اتباع [illegible] کی مسئلہ ہے لیکن تاریخی ثبوت فراہم ہو جانے کے بعد ہر معجزہ ایک مستقل دلیل عظمت اور ہر [illegible] ایک مستقل چیلنج ہے جس کا مقابلہ کسی دور میں ممکن نہیں ہے۔

قانون کے شعبے

اگرچہ مالک کائنات نے انسان کو ناواقفیت کے ماحول میں پیدا کیا ہے لیکن اسے [illegible] علم سے نواز دیا ہے اور پھر صلاح و فساد سے باخبر کرنے کے لئے ایک مکمل نظام حیات بھی دے دیا ہے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ یہ نظام حیات بھی علم کے تمام شعبوں پر حاوی ہو تاکہ انسان [illegible] قوت ادراک [illegible] ہوتے پا سکے۔

[illegible] قرآن حکیم کو قانون کا ذریعہ بتایا ہے تو اس کے بعض شعبے [illegible] دیکھا جاتا ہے [illegible] تین شعبے ہیں [illegible] قول و فعل و تقریر معصوم کا مجموعہ ہے جہاں قول معصوم [illegible] ہوتا ہے اور فعل کا [illegible] تقریر و سکوت کا تعلق [illegible] معصوم [illegible] سکوت اختیار کیا ہے اور [illegible] سکوت رضامندی کی علامت ہے یا کسی مجبوری اور [illegible] کی [illegible]

اس طرح کے [illegible] بغیر [illegible] کوئی [illegible] جا سکتا ہے اور اس سے [illegible] کا [illegible] ممکن نہیں ہے۔

مسئولیت

اتمام حجت کے اس مکمل سلسلہ کے بعد پروردگار نے مسئولیت کو بھی تین حصوں پر تقسیم کیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ ہم نے انسان کو ناواقف پیدا کرنے کے بعد بھی اسے تین طرح کے وسائل علم دے دیئے ہیں اور پھر یہ [illegible] کہ ان سماعت، بصارت اور دل و دماغ تینوں کے بارے میں سوال بھی کیا جائے گا۔ اور پھر دوسرے مقام پر اس مسئولیت کے انجام کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ "بہت سے افراد گویا کہ جہنم ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن وہ حقائق کی طرف نگاہ نہیں کرتے ہیں۔ کان ہیں لیکن وہ کچھ سنتے نہیں ہیں۔ قوت علم و ادراک ہے لیکن اسے استعمال نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس طرح ان کا حال دو وروں جیسا ہو گیا ہے بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ بہکے ہوئے ہیں۔"

اتمام حجت

مالک کائنات نے اس مکمل نظام پر عمل درآمد کرانے کے لئے سرکار دو عالمؐ سے جس بہترین طرح کے وسائل کو استعمال کرایا ہے وہ اہل نظر کے سامنے ہیں [illegible] اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر عقل گواہی دے [illegible] اور ہر ہوش مند کو پیغام سے آشنا بنا دیا ہے۔

قرآن مجید [illegible] بعض احکام کو صاحب کے ذریعہ پہونچایا ہے۔ بعض کو جبرئیل کے حوالے کیا اور بعض کی ترسیل میں مخاطب کے دل و دماغ کا سہارا لیا ہے۔ لیکن جب کوئی ایسا اہم حکم آگیا جس کے بارے میں خود پروردگار نے فرما دیا کہ "اگر اسے نہ پہونچایا تو گویا تبلیغ رسالت کا حق ادا نہیں کیا" تو اس کی تبلیغ و ترسیل میں تمام طاقتوں کو گویا جمع کر دیا گیا اور غدیر خم کے میدان میں ٹھیک دوپہر کے وقت جب آفتاب نصف النہار کی منزل سے گذر رہا تھا، مولائے کائنات کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے اعلان کر دیا کہ "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی بھی مولا ہے" تاکہ صاحبان بصارت بھی منظر کو دیکھ لیں اور اگر کوئی نابینا ہے یا اس کی آنکھیں [illegible] تو وہ اس پیغام ولایت کو سن لے [illegible] حالات [illegible] کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لیں کہ یہ مولایت [illegible]

[illegible] دوستی کا اعلان نہیں ہے جس کے واسطے [illegible] ہے اور ایک دوست کی دوستی کا اعلان کرنے کے لئے [illegible] کو اس پریشانی میں [illegible] کوئی سنگین ترین پیغام ہے جس کے مقابلہ میں اس زحمت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس کی حمایت کا اندازہ [illegible] کرنا زحمت نہیں ہے لیکن [illegible] کام کرنا بھی [illegible] زحمت شمار ہوتا ہے

خود اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے [illegible] اور مجاہدین کو [illegible] برداشت کرنے کی دعوت دی ہے۔ [illegible] لیکن یہ ساری باتیں زحمت نہیں ہیں [illegible] اسلام کے [illegible] کوئی زحمت نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب مجاہد کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میری زندگی کا خاتمہ اسلام کی بقا کا ذریعہ ہے [illegible] میرے جسم پر جب زخم لگیں گے تو اسلام کے باغ میں پھول کھلیں گے [illegible] دشمن سے آزاد وطن [illegible] تو وہ ان زحمتوں کو ہنس کر برداشت کرتا ہے [illegible] اسے مکمل [illegible] ایک بڑے مقصد کے کام آ رہا ہے [illegible] بڑی سعادت و راحت ہے [illegible] مشقت نہیں ہے [illegible] جیسے جیسے زخم کھاتا جاتا ہے [illegible] ویسے ویسے زندگی آخری لمحات سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اس کے نفس کا اطمینان [illegible] چہرہ [illegible] جاتی ہے [illegible] سے خوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

غدیر خم کی صورت حال بالکل [illegible] ایک پیغام کی تبلیغ کا مسئلہ نہیں [illegible] کی بقا کی ضمانت کا انتظام کرنا تھا [illegible] بڑی بات ہے کہ جس انسان کو [illegible] دھوپ میں کھڑے رہنے [illegible] قیام کرنے [illegible] کی ضمانت حاصل ہو جائے گی۔ [illegible] احساس [illegible] اسلام [illegible] کسی شخص کو [illegible] کوئی دلچسپی نہ ہو [illegible] اسلام [illegible] کی بربادی سمجھتا ہو [illegible] پریشان [illegible] زحمت کا احساس [illegible] پر افسوس بھی

ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں وقت کی صورت حقیقت امر ہے ماضی مختلف ہے اور وہ مستقبل کو بھی چشمے سے دیکھتا ہے جس پر گرد و غبار کی گرد بھی نہیں ہے اور جس کے شیشوں پر بہت سی [illegible] دنیا کی خراشیں لگ گئی ہیں۔

سرکار دو عالمؐ کا یہ اسم و مقام اس امر کی روشن علامت ہے کہ [illegible] [illegible] صرف [illegible] نہیں ہے — بلکہ یہ ایک ملکیت ہے جس کے تحت ساری [illegible] کام کرتے ہیں۔ یہ ایک صفات ہے جس کے ذریعہ [illegible] اور [illegible] سے [illegible] رکھتا ہے اور اس حقیقت کا ادراک [illegible] دل و دماغ کی [illegible] ہے جس کا انجام [illegible] کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

صفات نبوت

جس طرح وجود پروردگار کا ادراک رکھنے والا اور واجب الوجود کے مفہوم سے آشنا انسان اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا ہے کہ واجب الوجود کی ہستی میں نقص، عیب، تجسم، [illegible]، حلول، غفلت، مجبوری، موت [illegible] اور صفات [illegible] کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ تمام باتیں اس مفہوم کے خلاف ہیں جسے واجب الوجود کہا جاتا ہے اور اس عظمت کے خلاف ہیں جسے سلام سے [illegible] سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح نبوت کے مفہوم [illegible] کی صورت [illegible] کی حیثیت سے [illegible] تمام اوصاف و کمالات کی ضرورت خود بخود محسوس کرتا ہے جو ایسے عظیم کام کے لئے درکار ہیں اور جن کے لئے کسی دلیل [illegible] کی ضرورت نہیں ہے۔

نبوت اگر خدائی پیغام حاصل کرکے بندوں تک پہنچانے کا نام ہے تو نبی کا ایک [illegible] ہونا بہرحال ضروری ہے تاکہ اس سے وہ پیغام حاصل کر سکے جو عالم بشریت میں کوئی [illegible] نہیں کر سکتا اور اس طرح اس کے کردار میں ایسا تقویٰ اور تقدس ہو کہ پروردگار اس کے سینے میں پیغام [illegible]۔

۱۔ [illegible] ہونا چاہیے کہ امانت الٰہی میں خیانت نہ کرے۔

اسے ایسا صادق القول ہونا چاہیے کہ پیغام رسانی میں غلط بیانی سے کام نہ لے۔

اسے اتنا عظیم ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آفاقی پیغام کو سمجھ سکے اور پھر لوگوں کو سمجھا سکے۔

اسے اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ حالات کے دباؤ، شیاطین کے رعب [illegible] میں [illegible] پیغام میں تبدیلی پیدا کر دے۔

اسے [illegible] ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے بیان پر اعتبار کر سکیں۔

اسے [illegible] سے اس قدر منزہ و مبرّا ہونا چاہیے کہ پیغام دینے والا اس کے [illegible] کر سکے۔

اسے نسبی اعتبار سے اتنا پاکیزہ اور طاہر ہونا چاہیے کہ لوگ اس کی اطاعت کی طرف مائل ہو سکیں اور اس کے پیغام کو [illegible] کا پیغام [illegible] سکیں۔

اسے اپنے دور کے تمام افراد سے افضل ہونا چاہیے تاکہ اس کا پیغام ہر ایک کے لئے قابل قبول ہو اور قوم میں [illegible] تفرقہ پیدا نہ ہو سکے۔

یہ تمام وہ عناصر ہیں جن کے لئے آیات و روایات یا دلائل عقل کی [illegible] نہیں [illegible] اس کلام کے [illegible] نبوت کے بارے میں پیش کی گئی ہے [illegible] اگر نبوت کا مفہوم [illegible] [illegible] ان کے [illegible] سے انکار کر دیا جائے تو بحث کا دامن بہت وسیع ہے [illegible] بھی ایک طرح کی مقلد بحث ہوگی [illegible] عقل سے کوئی [illegible] ایک مفہوم کا اثبات کرے گا [illegible] انکار کرے [illegible] دوسرے مفہوم کا [illegible] مختصر [illegible] ہے جیسا کہ امت اسلامیہ کے حالات میں [illegible] سابق مذہب کے حالات میں بھی دیکھا گیا ہے کہ [illegible] یا [illegible] بھی [illegible] تشکیک کرتے رہے ہیں [illegible] اسی طرح نبوت کے مفہوم سے [illegible] کا اعلان [illegible] کسی خاص [illegible] کا تحفظ کرتے رہے ہیں جو حقیقی مفہوم سے حاصل ہوئے [illegible]۔

[illegible] خلاصہ

۱۔ [illegible] سے شروع ہونے والا سلسلہ نبوت سرکار دو عالمؐ پر تمام ہوگیا [illegible] کا ساتھ [illegible]

صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ ... ہیں، وہ خاتم النبیین بھی۔ ان پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ ایک وقت نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔ صاحب شریعت بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی۔ ان کا قانون آخری قانون ہے ... ان کی رسالت کا دائرہ عام ... ہے ... سے بھی تعلق رکھتا ہے، ... وہ انسانوں کے رسول بھی ہیں اور جنات کے بھی۔

کیا ماننے کے تمام صحف و کتب کا تحفظ قرآن کی قدرت پر ہو گیا ہے اور اب ... لانے والا کوئی انسان عالم وجود میں آنے والا نہیں ہے۔ انہیں معراج کی حدوں تک ... پہنچا دیا گیا ہے تاکہ ... کوئی انسان ممکن نہیں ہے اور ان کے معجزہ کو ابدی باقی رکھا گیا ہے تاکہ کسی دور میں ... انکار نہ کیا جا سکے۔ ان کا قرآن عظیم ہر دور میں آواز دے رہا ہے کہ اب بھی اگر ممکن ہے تو اس کا جواب ... سب مل کر بھی لا سکتے ہیں تو اس کا جواب لے آئیں۔

سرکار دو عالم کی نبوت کی خصوصیت یہ ہے کہ گذشتہ تمام انبیاء نے اس نبوت کی خبر دی ہے اور ہر نبی نے ... نبوت کی بشارت ... ہے۔ حضرت عیسیٰ نے تو صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "میں ایک ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آنے والا ہے اور اس کا نام احمد ہوگا۔"

دوسری طرف اس نبوت نے تمام انبیاء کی تصدیق بھی کی ہے اور ان کے عقیدہ کو زندہ بھی کیا ہے۔ ورنہ یہی نہ ہوتا اور اس کی کتاب نے گذشتہ انبیاء کا تذکرہ نہ کیا ہوتا تو ان کی نبوت اور رسالت کا کوئی قطعی علم نہیں ہو سکتا تھا اور کسی نبی کی نبوت پر ایمان کا کوئی لزوم نہیں تھا۔ یہ صرف سرکار دو عالم کا فیض ہے کہ ان کے ذریعہ گذشتہ انبیاء کی نبوتوں کا علم ہو گیا اور آپ نے سب پر ایمان کو ضروری بھی قرار دے دیا کہ اگر کوئی شخص کسی ایک نبی کا بھی انکار کر دے تو گویا اس نے آپ کی رسالت کا بھی انکار کر دیا اور اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

دائمی اور ابدی ہونے کے اعتبار سے بھی یہ نبوت ایک امتیاز رکھتی ہے کہ مالک کائنات نے اس کے احکام میں قیامت تک کے حالات کا لحاظ رکھا ہے اور کوئی دور تاریخ ایسا نہیں آ سکتا ہے جب اس کے احکام معطل اور بیکار ہو جائیں اور اس کے قوانین عالم انسانیت کی رہنمائی نہ کر سکیں۔

آپ کی نبوت کو "نبوت خاصہ" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے امت اسلامیہ کا براہ راست

تعلق ہے اور دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبوت سے ہمارا رشتہ صرف ایمان کا ہے عمل کا نہیں ہے۔ ہم انبیاء سابقین پر ایمان ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کی شریعت کے احکام پر عمل نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں یا اپنی تجدید میں موجودہ شریعت کی تائید کے محتاج ہیں۔ لیکن سرکار دو عالم کی شریعت سے ہمارا ... عمل کا رابطہ ہے۔ ہم جس طرح آپ کی نبوت کا اقرار کرتا ہے اسی طرح آپ کے احکام پر عمل بھی کرتا ہے۔ ہم عمل سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ عمل کے بغیر آپ کے پیروں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ آپ کا ہر قول ہمارے لئے سند اور آپ کا ہر عمل ہمارے لئے حجت ہے۔ کسی انسان کو آپ کے خلاف ایک لفظ زبان سے ادا کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ کوئی آپ کے حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنا سکتا ہے۔

عقیدۂ نبوت ـــــ نتائج و اثرات

۱۔ تائیدِ عقل

بعض آزاد فکر انسانوں کا خیال ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے نبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نبی کی رہنمائی دیوانوں کے لئے ہے تو دیوانے قابلِ ہدایت نہیں ہوتے ہیں اور اگر رہنمائی کا تعلق صاحبانِ عقل سے ہے تو صاحبانِ عقل کی عقل ہی ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ انہیں کسی نبی یا رسول کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن درحقیقت یہ خیال ایک مغالطہ اور فریبِ نظر ہے [illegible] کوئی [illegible] اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان عاقل [illegible] قوتِ عقل [illegible] عقل [illegible] نہیں ہو سکتا ہے۔ عقل نہ علم ہے اور نہ عمل۔

علم و عمل عقل کے کام [illegible] ہیں ـــ اس کے معنی [illegible] وجہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں صاحبانِ عقل جاہل و بے عمل پائے جاتے ہیں۔ ان [illegible] ہی قوتِ ادراک و شعور کیوں نہ رکھتا ہو [illegible] علم [illegible] ہوتا ہے اور کتنا ہی بڑا صاحبِ علم کیوں نہ ہو اس کا علم [illegible] عمل کرنے کے لئے کافی [illegible] اور شر سے روکنے کے لئے۔

وہ منزلِ علم میں معلم کا محتاج ہے اور منزلِ عمل میں صاحبِ کردار محرک کا۔

اسلام کی زبان میں اسی معلم اور محرک کو نبی کہا جاتا ہے لہٰذا نبوت عقل کی مخالفت کا نام نہیں ہے۔ عقل کی تائید کا نام ہے جس کے بعد عقل بے سہارا نہیں رہ جاتی ہے اور انسان کو علم و عمل دونوں میں ایک رہنما مل جاتا ہے۔

آپ اس ماحول کے بارے میں سوچیں جہاں لاکھوں صاحبانِ عقل ایک ساتھ پیدا کر دیئے [illegible] اور ان کے درمیان ایک بھی صاحبِ علم مخلوق نہ ہو تو ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ صرف عقل کی بنا پر [illegible] اور خیر و شر کا مکمل ادراک ہرگز نہیں کر سکتا ہے۔ اور نہ خیر کی راہوں پر چل سکتا ہے۔

ہمیں نبوت کی عظمت اور اہمیت کا احساس اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے [illegible] سے پہلے ایک معلم و مرشد حضرت آدمؑ کی شکل میں بھیج دیا تھا اور ہم [illegible] اسی سے پیدا کیا ہے ورنہ آج سارا عالم نہایت جاہل اور [illegible] اور دنیا میں [illegible] نہ ہوتا وہ سب ایک دوسرے کو فنا کر چکے ہوتے۔

[illegible] با خدا

[illegible] خالق پروردگار کی طرف سے کسی رہنما کی آمد ہیں سے ہے جہاں انسان کے ذہن میں [illegible] ہوتا چلا جائے گا اس کا ارتباط پروردگار سے بڑھتا جائے گا [illegible] پیدا کرنے والا کس قدر رحیم و کریم ہے کہ اس نے ہمیں لاوارث نہیں [illegible] ہماری رہنمائی کا انتظام کر دیا ہے۔

[illegible] کا ارتباط پروردگار سے بڑھتا جائے گا اسی قدر ذہنی اعتبار [illegible] جائے گا اور یہ زندگی کا بہترین انداز ہے کہ [illegible] طور پر [illegible] رہ سکے۔

[illegible] کہ علم ہماری امانت اور مرد ہے کہ ہم ہر وقت [illegible] کوئی نہیں ہے اور میرا فیصلہ دنیا کے ہر انسان کے

فیصلہ سے زیادہ صحیح اور صائب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے فیصلوں پر اعتراض بھی کرے تو انھیں حقارت اور ذلالت کی نگاہ سے ضرور دیکھتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنی فکر پر مغرور ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی کی فکر کو کچھ نہیں سمجھتا ہے۔

یہ غرور انسان کے حق میں مفید بھی ہے کہ اسی کے سہارے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مضر بھی ہے کہ انسان غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

عقیدۂ نبوت انسان میں یہ احساس پیدا کراتا ہے کہ مجھ سے بالاتر افراد بھی اس کائنات بشریت میں موجود ہیں۔ جنھیں اسی پروردگار نے علم عطا کیا ہے جس نے مجھے "لا تعلمون شیئا" کے انداز سے پیدا کیا ہے۔ اور اس طرح ایک روحانی کمی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی غرور و تکبر سے نجات حاصل کر لیتا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔

۴۔ معرفت رمز الٰہی

بندہ اور خدا کے درمیان کتنے تعلقات ہیں اور پروردگار اپنے بندوں کی کس کس طرح امداد اور رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا مکمل شعور کسی انسان کو نہیں ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس نے ہماری فطرت میں خیر و شر کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اس نے ہماری عقل کے اندر خیر و نقص کے حاصل کرنے کی طاقت رکھ دی ہے۔ ہمیں یہ اندازہ ہے کہ وہ ہماری فکر پر مسلسل نگاہ کرتا رہتا ہے لیکن اس کی طرف سے ایک مکمل نظام تربیت کی موجودگی کا کوئی احساس ہمارے اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ ذہن سے کبھی اس کا ادراک نہیں کر سکا ہے۔

لیکن عقیدۂ نبوت اس احساس کو بھی پیدا کرتا ہے کہ مالک کائنات نے جزئی انعامات کے علاوہ ایک مکمل نظام تربیت بھی مرتب کر رکھا ہے جس کی روشنی میں انسان بہترین پرسکون زندگی گزار سکتا ہے اور اس نظام کے اسرار کے دریچے ہم کو عطا کر دیا جاتا ہے جسے وحی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

نبوت کا عقیدہ نہ ہوتا تو انسان اس رمز الٰہی کے تصور سے بھی محروم ہو جاتا اور اس

نظام تربیت سے بھی محروم ہو جاتا جو مالک کائنات نے اپنے بندوں کے لیے مرتب کر کے انبیاء کرام [illegible] کر دیا ہے۔

۵۔ وجود حلال مشکلات

نبی اس انسان کو کہا جاتا ہے جو اپنے دور کے تمام علمی و عملی مشکلات کو حل کر سکتا ہو۔ [illegible] میں یہ تو ممکن ہے کہ اس کی نبوت کا دائرہ اس کی ذات یا اس کے گھر تک محدود ہو لیکن یہ [illegible] ہے کہ اس کے کمالات میں کوئی نقص پایا جاتا ہو۔ اس لیے کہ اگر معاشرہ میں اس سے [illegible] افراد پائے جاتے ہیں اور انھیں شرف نبوت سے محروم کر دیا گیا ہے تو یہ ان کے حق میں ظلم ہے اور پروردگار ظلم نہیں کر سکتا ہے۔

[illegible] کا تقاضا ہے کہ وہ نبوت کا منصب اس انسان کے حوالے کرے جو تمام افراد [illegible] اس طرح عقیدۂ نبوت رکھنے والے کو یہ سکون و اطمینان رہتا ہے کہ [illegible] مشکل پیش آ جائے ہمارے دور میں اس کا حل کرنے والا موجود ہے اور [illegible] کیوں نہ ہو جائے ایک صاحب عقل و فہم موجود ہے جو ہر مشکل کی [illegible] ہر مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

[illegible] سکون کا اندازہ وہی افراد کر سکتے ہیں جن کے پاس عقیدۂ نبوت ہے [illegible] کو اس نعمت کا ادراک بھی نہیں ہو سکتا ہے اور وہ درحقیقت اس

[illegible] کم

[illegible] جو ہمدردی اور سکون بخش ہوتا ہے اسی قدر عالم کا وجود [illegible] کو مشکل [illegible] میں جائے تو وہ کسی طرح کی تباہی بھی پیدا

[illegible] نہیں ہر فعل [illegible] کرتا ہے اور وہ کبھی

طرح کی جہالت و حماقت سے باز نہیں آتے ہیں۔

اس کے اس برعکس حاکمیت میں کسی بلند ترہستی کی حاکمیت، وراہی محکومیت کا احساس شامل ہوجائے تو [illegible] سے بہت حاصل کی جاسکتی ہے۔ عقیدۂ نبوت انسان میں یہی احساس پیدا کرتا ہے کہ تم سے بالاتر کوئی اور بھی ہے جو [illegible] تم سے کہیں زیادہ [illegible] ہے [illegible] اس طرح تم پہ احسان [illegible] اور وہ [illegible] طور پر [illegible] نہیں ہو [illegible] بھی [illegible] طاقت ہے جس طرح تم دوسروں سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہو۔

اس حقیقت کا عکس [illegible] کی تاریخ کی [illegible] صورت حال سے لیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی قوم کے سامنے جب تک نبی موجود رہا اس کو بعد کی صورت کا احساس رہا اس کے حالات اس قدر بد تر نہیں ہوئے جس قدر حالات نبی کی عدم موجودگی میں بد تر ہوگئے یا اس قریب نظر کے بعد ترجب ہوگئے کہ ہم سے بالاتر کوئی نہیں ہے اور ہم نے جیسے انسان کو ہی تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں اس [illegible] کا واضح [illegible] ہے کہ سلسلہ نبوت کے خاتمے کے [illegible] انقلاب پیدا ہوگیا جو دوسری تاریخ میں [illegible] اور [illegible] سے تبدیلی حیرت کا [illegible] اور [illegible] کے ساتھ بھی [illegible] تاریخ میں [illegible] کی [illegible] کے ساتھ بھی بدترین [illegible] جاتا ہے۔

نبوت کا عقیدہ [illegible] تمام سعادت کی روح اور تمام کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ یہ عقیدہ دماغ کی گہرائی میں ہو اور صرف زبان کی چاشنی کے لئے نہ ہو۔

۷۔ فیضانِ الٰہی

انسان اگر باہوش و حواس ہے تو اپنی ذاتی کمزوری کا احساس رکھتا ہے کہ اس کے پاس [illegible] ہے۔ وجود سے لے کر آخری سانس تک اور ظاہری نعمتوں سے لے کر باطنی [illegible] سب کسی دوسرے [illegible] کا نتیجہ فیض و کرم ہیں جس نے دنیا میں بھیج دیا ہے اور پھر [illegible] بھی [illegible] اس کے باوجود [illegible] احساس [illegible] اور فطری [illegible] سے متعلق ہے [illegible] کی رہنمائی کے بارے [illegible] احساس ہے کہ اسے جو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ جس طرح چاہے [illegible]

جیسے اپنے کردار کے بدترین درجہ تک پہونچ جاتے یا اسفل السافلین میں آجائے۔

اس بات کا پتہ [illegible] انسان [illegible] فکر و شعور کر کے جو حق ہونا ہے اور [illegible] آزادی کو [illegible] انسان ایک قسم کی لاوارثی تصور کرتا ہے کہ گویا مادی عنصروں سے [illegible] کر دیے واسطے معنوی منزل میں ہر فضل و کرم سے محروم کر دیا ہے [illegible] کو اس کی [illegible] کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن یہی احساس کے ساتھ اگر عقیدۂ نبوت کو شامل کر لیا جائے تو یہ صاحب محرومی [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] کو یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے کا فضل و کرم مسلسل جاری ہے [illegible] کسی مرحلہ پر بھی اپنے بندہ کو [illegible] محروم کرم نہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔

۸۔ نمونۂ کردار

انسانی زندگی کی فطری رفتار یہ ہے کہ وہ زبانی تعلیمات سے کم سیکھتا ہے اور کردار سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب کردار تعلیمات سے الگ ہو جاتا ہے تو ذہن منتشر اور [illegible] کا شکار ہو جاتا ہے اور انسان کچھ بھی حاصل کرنے کے قابل نہیں رہ جاتا ہے۔

کائنات نے انسان کو [illegible] کی گود میں اسی لئے رکھا ہے کہ اس کے سامنے [illegible] کو دیکھ کر کوئی اپنے سونے جاگنے [illegible] زندگی کے [illegible] حاصل کرے۔

[illegible] ہے کہ [illegible] عمل حاصل ہوگئی [illegible] اس سے زندگی کا [illegible] لئے [illegible] اسلام [illegible] اور [illegible] خود ذاتی [illegible] و تصورات کے رحم و کرم [illegible] دوسرے افراد کے حوالے [illegible] ہے جو ذاتی کمزوری کی [illegible]

[illegible] کا واضح جواب ہے کہ قدرت نے ہر دور میں [illegible] بہ تمام علم و عمل [illegible] ترقی کے [illegible] کر سکتا ہے [illegible] کے [illegible] قدر [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] صاحب عرفان کی منزل تک پہونچا سکتا ہے۔

۹۔ دعوتی کردار

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نمونۂ عمل نگاہ کے سامنے ہوتا ہے لیکن انسان کا عمل اس نمونے کے مطابق نہیں ہوتا ہے اور نمونے میں بھی ٹوکنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ سامنے جو مکان کا نقشہ رکھا جاتا ہے وہ اس سے ہٹ کر بھی مکان بنا دے تو نقشہ اس کو ٹوکنے والا نہیں ہے اور اس حیثیت سے محض خاموش کردار ہے۔

لیکن عقیدۂ نبوت انسان کو اس نکتہ کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ یہ نمونہ کردار ساکت و صامت نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری دعوتی کردار بھی ہے اور وہ بشارت اور انذار کے ذریعہ اسے اپنے اتباع کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔

نبوت کے علاوہ اس دنیا کا منشاء یہ ہے کہ جو نمونۂ کردار بھی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ دوسرے افراد کو دعوتِ اتباع دے بلکہ بسا اوقات جب کردار اس طرح بات بن کر سماج سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن نبی اس صاحبِ کردار کا نام ہوتا ہے جس کی خلقت کے تحت کی تعلیم و تربیت کے لئے ہوتی ہے اور وہ ہر آن معاشرہ پر نگاہ رکھتا ہے کانٹوں پر چل سکتا ہے لیکن معاشرہ کو گمراہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا، چاہتا ہے کہ وہ خود مصیبت برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن معاشرہ کو ہر مصیبت سے نجات دلا دے اس کی دعوت یہی ہے "قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا"۔

۱۰۔ ارتباطِ ارض و سما

مادی طور پر یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ زمین و آسمان دو مختلف مخلوقات نہیں ہیں کہ تخلیق میں گہرا ربط پایا جاتا ہے اور آسمان کی ہر حرکت زمین پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا نقشہ آسان پر دیکھا جا سکتا ہے۔

زمین کے رہنے والے آسمان کے چاند سورج ہی سے سردی اور گرمی کا احساس کرتے ہیں اور آسمان کے ستاروں ہی کی مدد سے راستہ طے کرتے ہیں۔

چاند کی رفتار دریا کے مد و جزر پر اثر کرتی ہے اور اس کے رو بہ آفتاب ہونے والا اندھیرا اور اجالا انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن یہ ساری باتیں مادی دنیا کی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا روحانی اعتبار سے زمین کی دنیا آسمان سے بالکل الگ ہے یا اب بھی دونوں میں کوئی رابطہ پایا جاتا ہے؟

گردوں کا عالم ملک الگ ہے تو یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے۔ اس لئے کہ ہم نے دونوں [illegible] کا احساس پیدا کیا ہے اور اگر دونوں میں ارتباط پایا جاتا ہے تو اس ارتباط کا نتیجہ کیا ہے اور اس کا اندازہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

عقیدۂ نبوت اس سوال کا یہی جواب ہے کہ آسمان کے رہنے والے زمین والوں کی [illegible] کے لئے بھیجے جاتے ہیں جس طرح مردہ زمینوں کو زندہ کرنے کے لئے آسمان سے بارش [illegible]

[illegible] زندگی میں آفتاب جاند کی خشکی ہے اور [illegible] تحریف آفتاب کی حرارت ہے۔ [illegible] عدالت کرتا ہے اور برق تپاں کی طرح "فمن مواعظی" کا حکم [illegible]

۱۱۔ [illegible] تعداد

[illegible] ہر قسم اعداد الٰہی کا تقاضا ہے۔ اسے فطری طور پر اس میں [illegible] اور صفات کو علم سے مبدل کرتے ہیں دہ شکل میں [illegible] ان کو نمائے جا رہا ہے کہ جو نعمتیں مالک کے رحم و کرم کا تقاضا [illegible] انہیں تو ہر حال عطا کرے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی نعمت [illegible] کیا ہوگا؟ میری سماعت میں تو ایسی بات نہیں ہے [illegible] قابل قبول ہو جائے وہ میری نگاہ رحمت پر تقدس [illegible] ہوگا۔

[illegible] بھی علاج ہے جو اسے اطمینان دلاتا ہے کہ اگر

میری دنیا میں تاثیر اور تغیر پیدا کر دا ریں۔ م انہیں ہے تو یک اب بندۂ خدا بھی موجود ہے جو مستجاب الدعوات ہے اور جس کی کوئی دعا رد نہیں ہو سکتی ہے اور اس طرح کسی وقت بھی گڑگڑا کر وسیلہ بنائے گا اور وہ بارگاہ احدیت میں عرض مدعا کرے گا تو اس کی دعا رد نہیں ہو سکتی ہے اور تغیر و عالم بہر حال حاصل ہو جائے گا۔

۱۳۔ احساسِ عظمتِ بشر

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ جب دوسرے فرد کے مقابلہ میں اپنے کو ذاتی طور پر کمزور پاتا ہے، وہ اپنے اندر کوئی بات قابل افتخار نہیں پاتا ہے تو دوسرے فرد یا خاندان کا سہارا لیتا ہے اور برادری میں کسی ایک کے بھی صاحب شرف ہو جانے کو اپنے لئے باعث عزت و افتخار قرار دے لیتا ہے۔

عقیدۂ مہدویت انسان کے اس فطری جذبہ کی تسکین کا بھی سامان فراہم کرتا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اگر میں ذاتی طور پر جاہل، ناقص، بدعمل، [illegible] اور میرا کل [illegible] ہے کہ میری طاقت [illegible] کے برابر ہو جائے یا [illegible] سے فرشتہ صفت انسان کا لقب دیا جائے [illegible] جاتے ہیں جو "معصوم" ہونے کے باوجود [illegible] شرف [illegible] انسان کو قرار دیا گیا ہے [illegible] نہیں سمجھا [illegible] ہوتا ہے جسے عظمت بشر کہا جاتا ہے جس کے مقابلہ میں [illegible] کی کوئی قیمت [illegible] ملائکہ کے کردار کی۔

وہ عظمت [illegible] کی [illegible] کوشش کرے [illegible] کا اعلان کر دیتے ہیں۔ [illegible] ملائکہ کا [illegible] ہے تو [illegible] گشت بھی [illegible] کے مالک ہوں [illegible]

۱۲۔ توازنِ حیات

انسانی زندگی کے نقائص میں ایک نقص یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں توازن قائم نہیں کر پاتا ہے، اور جیسے جیسے کمالات کی دنیا میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس کا معیار زندگی [illegible] ہوتا جاتا ہے۔

معمولی ملازمت کرنے والا انسان معمولی زندگی گزار سکتا ہے لیکن افسر ہونے کے بعد طریقۂ زندگی بدل جاتا ہے۔

فقیر کا لباس اور ہوتا ہے اور دولت مند کا لباس اور۔

رعایا کا مکان اور ہوتا ہے اور بادشاہ وقت کا محل اور۔

غرض کہ انسانی زندگی کا عام مزاج ہو گیا ہے کہ ترقی کے ساتھ [illegible] سادگی ختم ہو جاتی ہے اور حقیقت کی جگہ پر تصنع اور بناوٹ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

مہدویت کے عقیدہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ ایک ایسی زندگی سے روشناس کراتا ہے کہ کمال سادگی حیات کی راہ میں حائل نہیں ہوتا ہے بلکہ کمال خود بھی سادگی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کمال سادگی ہی سے پیدا ہوتا ہے اور تصنع زندگی کو کھوکھلا [illegible] بنا دیتا ہے۔

[illegible] ہوتے ہیں [illegible] نے یہی تصور پیش کیا ہے [illegible] کا لباس وسیلہ [illegible] سادہ ہے [illegible] کے قابل نہیں ہیں [illegible] کی سادہ زندگی [illegible] بناوٹ [illegible] کر [illegible] میں [illegible] ہو جاتا ہے۔

[illegible] سلام سے سرکار دو عالم کے بارے میں اسی نکتہ پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی ہے [illegible] کا یہ عالم تھا کہ بکری کا دودھ خود دوہ لیتے تھے [illegible] کا پیوند خود لگاتے [illegible] اصلاح خود کرتے تھے" اور اس طرح انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے [illegible] جانتے تھے کہ ساتوں آسمان زیر قدم ہیں اور عرش الٰہی نگاہ کے سامنے

نبوت کے عقیدہ سے عظمت کا یہ جو ہے کہ انسان نے تفسیح کرکے سمجھ لیا ہے اور جتنی [illegible] کے گڑھے میں گرتی جا رہی ہے۔ مصائب حیات کا بوجھ [illegible] بڑھ گیا ہے کہ کسی [illegible] سے سنبھالنے کے لائق نہیں ہے اور اس طرح مالک انسان کی بیچارگی یہ ہو گئی ہے کہ قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہو [illegible] دوسروں کے ہاتھوں بکا ہوا ہو — اور جہالت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اپنے کو آزاد اور ترقی یافتہ تصور کرتا ہے۔

۱۴۔ منصب اور خدمت

انسان کی جہاں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ [illegible] ہونے کے بعد اپنی زندگی کی سادگی اور احساس کھو بیٹھتا تھا وہاں دوسری کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ منصب کو خدمت کے منافی سمجھتا ہے۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کے پاس خدمت گزار ہوں اور لوگ اس کی خدمت کرتے ہوں۔ بڑا آدمی وہ نہیں ہے جو دوسروں کی خدمت کرتا ہو۔

عقیدۂ نبوت نے اس خیال خام کو بھی یکسر باطل قرار دے دیا ہے اور انسان کو اس بلند تر حقیقت سے آشنا بنایا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدمت میں ہے [illegible] خدمت کی [illegible] "سید القوم خادمهم" قوم کا سردار قوم کا خدمتگار ہوتا ہے۔ [illegible] بالاتر رہنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔

یہ بات [illegible] کے علاوہ کسی صاحب [illegible] میں نہیں پائی جاتی اور ہر شخص اپنی عظمت کا نمونہ اپنے کو خدمت سے بالاتر بنا دینے ہی کو قرار دیتا ہے [illegible] اس کے بالکل برعکس ہے اور [illegible] ثابت کر رہے ہیں کہ [illegible] عظمت [illegible] ہے اور خدمت خلق کسی انسان کو اس کے مرتبے سے کمتر نہیں بناتی ہے [illegible] [illegible]

اور تاریخ بشریت انھیں کے کردار پر ناز کر رہی ہے۔

رب کریم امت اسلامیہ کو اتباع نبوت کا شعور عطا فرمائے اور اسے یہ توفیق دے کہ مذہب کو سلطنت و اقتدار کے اندھیروں سے نکال کر سیرت و کردار کے اجالوں میں رکھے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی سعی کرے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

مسئلہ امامت

نبوت کے خاتمہ کے ساتھ وحی الٰہی پیغامات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور قدرت کی طرف سے اعلان ہو جاتا ہے کہ "اب دین کامل ہو چکا اور نعمتیں تمام ہو چکیں اور پروردگار دین اسلام سے راضی ہو چکا"۔ اب مسئلہ صرف پیغام کے تحفظ اور اس پر عملدرآمد کا باقی ہے اور یہ کام بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بعض اعتبارات سے نبوت سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

۱۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا ربط براہ راست پروردگار سے ہوتا ہے اور اس پر مسلسل وحی الٰہی کا نزول ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اسے ایک مافوق قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کی تائید میں ایک مستقل مدد بھی رہتی ہے۔ تو جب ہر طرح کے اسباب سے نبی محروم ہوتا ہے اور ہر خطرے کے موقع پر "معصومیت" [illegible] ہمارا الٰہی [illegible] ہوتا ہے لیکن [illegible] امامت [illegible] حاصل نہیں ہے۔

۲۔ نبوت پر پیغامات کا نزول [illegible] ختم ہوتا ہے لیکن [illegible] کے بعد کے مسائل پر [illegible] پیغامات کے تحفظ کی ذمہ داری [illegible] جاتی ہے۔

۳۔ نبوت کا سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے [illegible] اس کی زحمتوں کا سلسلہ بھی محدود ہوتا ہے لیکن اس کے بعد تو پیغام کو صبح قیامت تک باقی رہنا ہے جس کے محافظوں کے لئے خطرات زیادہ ہوں گے اور ان کا سلسلہ صبح قیامت تک باقی رہے گا۔

ایسے حالات میں اس پیغام کے علمی اور عملی تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی [illegible] ایسے افراد کو دی جائے جنھیں پروردگار نے ایسا علم دیا ہو کہ سارے پیغام کو سمجھ سکیں اور [illegible]

تحفظ کر سکیں۔ پھر ان کی قوت حافظہ بھی ایسی ہو کہ کسی پیغام کو فراموش نہ کر سکیں ورنہ دین الٰہی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

علم و حافظہ کے علاوہ قوت جسمانی اور روحانی شجاعت بھی مکمل ہو ورنہ اسلام دشمن عناصر کسی وقت بھی کسی دباؤ میں اگر پیغام میں تبدیلی پیدا کر دیں گے اور مذہب اسلام کی [illegible] ضائع و برباد ہو کر رہ جائے گی۔

ان اعتبارات سے پروردگار کے [illegible] ہوتا ہے کہ تحفظ دین و شریعت کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے [illegible] علمائے کرام و دانشوران ملت، علماء اعلام انجام دے سکتے ہیں۔ علمائے اعلام کا کام استنباط و تخریج ہے۔ ان کا تحفظ شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھیں [illegible] شریعت [illegible] کے پاس سارا علم شریعت محفوظ ہوتا۔ انھیں استنباط و استخراج کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ استنباط و تخریج کا عمل خود اس بات کا شاہد ہے کہ انھیں قدرت کی طرف سے کامل شریعت نہیں ملی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شریعت کے ظاہری تحفظ میں ان کے علمی خدمات [illegible] کا بہت بڑا دخل ہے اور یہ استنباط و استخراج کی حد تک شریعت کا تحفظ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا [illegible] اور انھیں سہو و نسیان اور خطا و [illegible] سے بالاتر تصور کیا جا سکتا ہے [illegible] شریعت کے لئے ان دونوں امور کا ہونا ضروری ہے جس کے [illegible] معصوم نہیں ہیں [illegible] شریعت کی [illegible] پروردگار [illegible] حقوق [illegible]

اس سلسلہ میں حفظ شریعت کے علاوہ ایک مرحلہ شریعت پر عملدرآمد کا بھی ہے [illegible] پیغام [illegible] پہنچا دینے کے بعد [illegible] ذمہ داری ختم ہو جائے بلکہ اس کا اصل مقصد پیغام پر عملدرآمد کرانا ہوتا ہے جس کے لئے اس پیغام کو نازل کیا ہے۔

[illegible] اسلام تو تمام مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے آزاد نہیں کر سکتا ہے تو [illegible] اسلام کی [illegible] سے کس طرح آزاد کر سکتا ہے [illegible] تنفیذ احکام کا مسئلہ [illegible]

انسان خود مکمل طور پر احکام پر عمل کرتا ہو ورنہ اس کا قول کسی صورت سے بھی قابل قبول نہ ہوگا۔

۲۔ اس میں تنفیذ احکام کی قوت بھی پائی جاتی ہو ورنہ وہ طاقت کے دباؤ میں اگر قانون کو تبدیل بھی کر سکتا ہے اور حالات و مفادات کے پیش نظر تنفیذ احکام کے عمل کو روک بھی سکتا ہے۔

۳۔ وہ احکام کا مکمل علم رکھتا ہو تاکہ اسی طرح نافذ کرے جس طرح وہ احکام نازل ہوئے ہیں ورنہ ان میں تبدیلی بھی پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ اس کی زندگی میں جسمی، نفسی، معاشرتی، سماجی کوئی ایسا نقص نہ پایا جاتا ہو جو اس کے اقوال و احکام کو بے اثر بنا دے اور کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہو۔

۵۔ وہ اپنے دور کے تمام افراد سے افضل و برتر ہو تاکہ لوگ اس کے احکام کو تسلیم کر سکیں اور کوئی شخص علم یا عمل کسی اعتبار سے اسے چیلنج نہ کر سکے ورنہ پیغام کا سارا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

مسئلہ امامت درحقیقت مسئلہ [illegible] کا ایک شعبہ ہے اور اسی لئے اسے امامت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس کا کام قیادت امت ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ بندہ کو خدا تک پہنچا دے۔ دوسرے لفظوں میں ادھر کے پیغام کو ادھر لے کر آنا رسالت ہے اور ادھر کے انسان کو ادھر لے جانا امامت و قیادت ہے۔

تحفظ شریعت امامت کا تمہیدی عمل ہے کہ اس سے قانون محفوظ رہ سکے گا ورنہ کسی سے پرکھ لیا جائے گا اور اس کی رحمتوں کا حصول کیا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ پہلے علم و عمل سے آراستہ ہو کر اور سہو و نسیان، خطا و اشتباہ سے بالاتر ہو کر قانون کا عملی تحفظ کرے اور اس کے بعد خود اس پر عمل کر کے امت کو دعوت عمل اور عملی دعوت دے کہ اس کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امامت کا کام بعض اعتبارات سے نبوت و رسالت سے زیادہ مشکل کام ہے اور اسی لئے پروردگار نے جناب ابراہیم کو نبی اور

اور خلیل بنانے کے بعد امامت کا کام سپرد کیا اور پھر بار بار [illegible] کر کے ہم کو یہ کام سپرد بھی نہیں کیا ہے۔

امامت کے ساتھ ایک دلالت یہ بھی ہے کہ اس کا سلسلہ وحی کے منقطع ہو جانے کے بعد شروع ہوتا ہے لہٰذا اس کا امکان بھی نہیں ہے کہ امام غلطی کرے گا تو وحی اس کی اصلاح کرے گی۔ اب تو غلطی کو تا قیامت برداشت کرنا پڑے گا۔ جبکہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ یہ کام ایسے فرد کے حوالے کرے جس کی زندگی میں کسی طرح کے نقص و عیب کا امکان نہ ہو ورنہ مقصد شریعت برباد ہو کر رہ جائے گا اور چند افراد کی شخصیت کے تحفظ میں سارا اسلام تباہی کے گھاٹ اتر جائے گا۔

شرائط امامت

امامت کا مقصد اور اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے بعد اس کے شرائط اسی طرح واضح ہو جاتے ہیں جس طرح نبوت کے مفہوم کا ادراک شرائط نبوت کی وضاحت کر دیتا ہے اور الوہیت و ربوبیت کا مفہوم اس کے اوصاف و کمالات کا اعلان کر دیتا ہے۔

امامت کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریوں کے پیش نظر امام کا عاقل، عادل، معصوم، افضل خلائق ہونا اسی طرح ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کے مقصد کا حصول اور اس کی [illegible] ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد تاریخ کے واقعات، حادثات، بیانات و اعترافات طے کریں گے کہ [illegible] کا حامل کون تھا اور کس فرد کی طرف اس منصب سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

[illegible]

یہاں تاریخ سے پہلے یہ فرض صاحب منصب پر عائد ہوتا ہے کہ وہ پہلے [illegible] تیار کرے اور پھر ان کی شخصیت کا تعارف کرائے تاکہ اپنی طرف سے [illegible] ہو جائے اور اس کے بعد [illegible] کی ذمہ داری معصوم پر عائد ہو صاحب قانون

یہی وجہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے بھی جانشینِ پیغام کا بندوبست کیا اور ان کے فضائل و کمالات کا تعارف کرایا کہ آیتِ تطہیر کے ذریعہ ان کی طہارت و عصمت کا اعلان کیا۔ آیتِ مباہلہ کے ذریعہ ان کی صداقت کا تعارف کرایا۔ آیتِ مودت کے ذریعہ ان کی قرابت و خصوصیت کا اظہار کیا۔ اور آیتِ ولایت کے ذریعہ ان کے عہدہ کا بھی اعلان کر دیا۔ اس کے بعد عمل پیغام سے بھی تمام ہنگام تعارف کرایا اور مختلف انداز سے ان کی خصوصیت کا تعارف کرایا۔

کبھی باب مدینۃ العلم قرار دیا۔ کبھی سفینۂ نوح سے تشبیہ دی۔ کبھی ثقلین [illegible] کبھی اپنا جز قرار دیا کبھی اپنا نفس قرار دیا۔ اور کبھی عملی طور پر منبر پر بلند کر کے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی بھی مولا ہے۔ اور کبھی کسی کو [illegible] پر بٹھا کر ان کے ہاتھوں میں [illegible] کر ان کے [illegible] کی پاکیزگی کا اعلان کیا۔ [illegible] مختلف [illegible] سے اعلان کر دیا کہ میں دنیا سے چلا بھی جاؤں تو اسلام لاوارث نہیں ہوگا [illegible] کے [illegible] موجود رہیں گے جو ہر قسم کی تبلیغ و تبیین میں کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں گے۔ [illegible] بدر و احد کے معرکے سر کر سکتے ہیں۔ یہ خیبر کا قلعہ فتح کر سکتے ہیں۔ یہ [illegible] دم پر حق [illegible] کر سکتے ہیں۔ یہ مشرکین کے مجمع میں ان کی نجاست کا اعلان کر سکتے ہیں [illegible] کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ صداقت کی منزل پر مباہلہ کے میدان میں [illegible] کی عزت کر سکتے ہیں۔ یہ زندگی کے ہر معرکہ میں [illegible] کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں کسی طرح کا خوف لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے میدان میں [illegible] بھی [illegible] کو [illegible] کی نظر انداز کر سکتے ہیں، تحت و تاج کو ٹھکرا سکتے ہیں۔ گھر [illegible] سکتے ہیں۔ صبر کے ساتھ برداشت رکھتے ہیں [illegible] زندگی گزار سکتے ہیں۔ [illegible] رہ سکتے ہیں — وہ سیکڑوں سال [illegible] کی نگاہوں سے دور [illegible] کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن دین کی بربادی برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور بے سکین حالات میں بھی ایسے باہمت افراد مہیا کرتے رہیں گے جو دین کا تحفظ کرتے رہیں اور اس راہ میں ہر طرح کی قربانی دیتے رہیں!

ائمہ اثنا عشر

یہ بات تمام عالمِ اسلام میں متفق علیہ ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے اپنے بعد کے لئے بارہ خلفاء اور بارہ ائمہ کی خبر دی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ جب تک یہ عدد پورا نہ ہوگا قیامت نہیں آسکتی ہے۔ [illegible] کائنات [illegible] کا دارومدار انہیں بارہ افراد کی امامت اور خلافت پر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ الخلفاء کے مصنف نے بارہ خلفاء کے انتخاب کی کوشش کی ہے اور سرکارِ دو عالمؐ کے ارشادِ گرامی کو اپنے مسلک پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ [illegible] یہ ہوئی ہے کہ خلفاء کا سلسلہ کم کر دیا جائے یا حضورؐ کی حدیث میں تحریف کر دی جائے۔ البتہ [illegible] ہوئی ہے کہ [illegible] کی بھیڑ بھاڑ میں سے بارہ کا انتخاب کر لیا جائے اور یہ انتخاب [illegible] کسی مذہبی بنیاد پر نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے مصنف کا ذوق کارفرما ہو یا وہ حق نمک محرک رہا ہو جس کی بنا پر کتاب تالیف کی گئی ہے۔

[illegible] یہ عدد بھی [illegible] پورا کیا ہے اور بنی امیہ و بنی عباس سے ہے — لیکن [illegible] ہے کہ پوری تاریخ اسلام میں آج تک کسی فرقہ کو اثنا عشری نہیں کہا گیا ہے کسی نے "خلافت راشدہ" کو اہمیت دی ہے تو چار یاری ہو کر رہ گیا ہے اور کسی نے جملہ [illegible] اسلام سے رشتہ قائم کیا ہے تو وہ اپنا عقائدی نام بھی نہیں طے کر سکا اور اصول میں اشعری یا معتزلی بن گیا اور فروع میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کا لقب اختیار کر لیا [illegible] مسند خلافت و [illegible] سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

[illegible] پیدا ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے بارہ خلفاء یا بارہ [illegible] کی خبر دی تھی اور [illegible] کے وجود سے وابستہ کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس رشتہ کو نظر انداز کر دیا اور [illegible] اصولِ دین سے اپنا نام نکال لیا اور کسی نے فروعِ دین سے جب کہ سرکارِ دو عالمؐ کے ارشادات میں نہ اصولِ دین کے محققین کا کوئی تذکرہ تھا اور نہ فروعِ دین کے مجتہدین کا۔ [illegible] اصل مذہب کی بقا کے بعد شروع ہوتا ہے — [illegible] فرد جن سے بقائے مذہب کا [illegible] ان کی عدد تو بہر حال بارہ ہے — پھر مسلمانوں کی تاریخ میں بارہ کا ذکر کیا

نہیں آتا ہے اور یہ حدیث صرف کتابوں کی زینت کیوں بن گئی ہے اور یہ عقیدہ صرف تاریخ خلفاء لکھنے والوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ کیا مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کیا مسلمان کا فرض اس ارشاد رسالت پر ایمان نہیں ہے؟

خدا گواہ ہے کہ یہ ایک کمزوری ہے ملت اسلام کے بکھراؤ کے دور میں قول فیصل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور حل کے ... پھر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے تمام فرقوں نے سرکار دو عالمؐ کے انتظام ہدایت سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے لئے وہ نام تک برداشت نہیں کیا ہے جو سرکار دو عالمؐ عنایت فرما کر گئے تھے۔

یہ صرف مذہب اہلبیتؑ کا امتیاز ہے کہ وہ اپنے کو اثنا عشری کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس خطاب پر ناز کرتا ہے جو سرکار دو عالمؐ حقیقی مسلمان کو دے گئے تھے کہ حقیقی مسلمانوں کے رہنما اور امام بارہ ہی ہوں گے جن میں کسی کمی یا زیادتی کا امکان نہیں ہے۔

کسی بھی مسلمان کو ائمہ اثنا عشر کے ناموں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان عدد سے اختلاف نہیں ہو سکتا ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کی لاج رکھنے کے لئے اور اپنے کو سچا اور حقیقی مسلمان ثابت کرنے کے لئے اثنا عشری بنے ورنہ اس کے بغیر سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی اور حقیقی اسلام سے کوئی رابطہ نہیں رہ سکتا ہے۔

ائمہ اثنا عشر کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کا تفصیلی ارشاد گرامی اہلسنت کی مشہور و معروف کتاب "ینابیع المودۃ" میں موجود ہے جہاں آپ نے تمام افراد کے ناموں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے بعض صفات و خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور آخری حجت پروردگار کے بارے میں تو برابر یہ فرماتے رہے ہیں کہ دنیا اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتی ہے جب تک ایک مہدی کا ظہور نہ ہو جائے جس کا نام میرا نام ہوگا اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی۔ وہ اولاد فاطمہؑ میں ہوگا اور پھر اولاد حسینؑ میں ہوگا اور اولاد حسینؑ میں نویں کے اعتبار سے نواں ہوگا۔ تاکہ کسی طرح کا التباس اور اشتباہ نہ رہ جائے اور حقیقت بالکل واضح ہو جائے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جن حضرات کا سرکار دو عالمؐ نے نام بنام تذکرہ فرمایا تھا۔ ان کا کوئی تذکرہ عالم اسلام میں نہیں ہے اور جنھیں اقتدار نے جنم دیا ہے ان کے

نام سنہرے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے حالات زندگی پر کتابیں تالیف کر دی گئی ہیں۔

اسلام کے لئے اس سے بڑا حادثہ کیا ہوگا کہ امت نے بارہ ائمہ اور بارہ خلفاء پر اتفاق کرنے کے بعد بھی اتنا عظیم انحراف اختیار کیا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی یکسر پردۂ خفا میں چلے گئے اور "ادارۂ انحطاط" کا کام دوسری شخصیتوں سے وابستہ ہو گیا۔

در حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل انجام دینے والے فرد بھی اپنے کو اہلسنت کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سنت پیغمبرؐ پر عمل کر رہے ہیں اور ان کے علاوہ اس سنت پر عمل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سچ کہا گیا ہے:

"برعکس نہند نام زنگی کافور"

سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق ائمہ اسلام کی شخصیتیں حضرت علی ابن ابی طالبؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام علی ابن الحسینؑ، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام علی رضاؑ، امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ اور حضرت مہدی آخر الزمانؑ ہیں۔ جن کی امامت کا اعلان بھی سرکار دو عالمؐ نے کیا ہے اور تفصیلی طور پر بھی ہر امام نے اپنے بعد والے امام کے بارے میں تصریح کی ہے یا اپنے بعد کے پورے سلسلہ کی وضاحت کر دی ہے جن کا تذکرہ کتب احادیث میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

بالخصوص ان تصریحات کے علاوہ ائمہ اثنا عشرؑ کے علاوہ تاریخ اسلام میں کوئی ایسا شخص بھی ان صفات و خصوصیات کا حامل نہیں پیدا ہوا ہے جنھیں امامت و قیادت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کے بغیر حفظ شریعت اور تنفیذ احکام کا عمل انجام نہیں پا سکتا ہے۔

ان میں سے ہر امام اپنے دور کا عظیم ترین انسان، صاحب عصمت و کردار، عالم علوم قرآن، شارح احکام اور حسب و نسب کے خاص سے بالاتر کسی کا نسب تھا نہ حسب، ... کردار کے اعتبار۔

اس کی تمام بڑی شخصیتوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ حکام وقت نے ان کے علوم

سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ائمہ اسلام نے ان کی شاگردی پر ناز کیا ہے۔ بادشاہان وقت و سلاطین اسلام
نے انہیں کسی میں دا... دنیا نے ان پر فخر کیا ہے اور ہر صاحب کمال نے ان کے عظیم ترین کمال کا
اعتراف کیا ہے۔ ایسے افراد کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو امام قرار دینا اور اسے
ان شخصیتوں پر مقدم کر دینا عقل و منطق کا بھی خون ہے اور عدل و انصاف کا بھی۔ رب کریم
امت اسلامیہ کو حقائق شناسی کی توفیق عنایت فرمائے اور ان کی چشم اعتبار کو وا کرے تاکہ
حقائق کا بغور مطالعہ کر سکیں اور انہیں کی روشنی میں حق و باطل کا فیصلہ کریں۔!

عقیدۂ امامت ___ نتائج اور اثرات

انسان اور پروردگار کے رابطے کے قیام اور استحکام کے لئے دو وسائل کا ہونا بید
ضروری ہے۔

ایک وسیلہ وہ ہو جو اُدھر کا پیغام اِدھر لے آئے تاکہ انسان الٰہی ہدایات کی روشنی
میں زندگی گزار سکے اور اس کا رابطہ پروردگار سے برقرار رہے۔

اور ایک وسیلہ وہ ہو جو اِدھر کے انسان کو احکام الٰہی پر عمل کرا کے پروردگار کی بارگاہ
تک لے جائے تاکہ انسان کا سفر تکامل مکمل ہو جائے۔ اور پروردگار کی بارگاہ سے شروع
ہونے والا سفر حیات اسی کی بارگاہ پر جا کر تمام ہو جائے۔

اسلام نے پہلا کام نبوت اور رسالت کے حوالے کیا ہے اور دوسرا کام امامت کے سپرد
امامت۔ نبی و رسول اُدھر کا پیغام اِدھر لے آتا ہے، اور امام اِدھر کے انسان کو اُدھر لے جاتا
ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات امامت کی ذمہ داری نبوت سے زیادہ سنگین ہو جاتی ہے
اور امامت کا کام نبوت و رسالت کے بعد عطا کیا جاتا ہے جیسا کہ جناب ابراہیم کے واقعہ میں
ہے، جہاں امامت کا کام نبوت و خلّت و رسالت و شریعت کے بعد عطا کیا گیا ہے۔ یا
... حسین کے بارے میں اعلان ہوا ہے کہ "ہم نے ان میں سے بعض کو امام اور قائد قرار
دیا ... کی بنیاد یہ تھی کہ ان میں قوت صبر اور صفت یقین پائی جاتی تھی۔ گویا کہ امامت
کا کام صبر و تحمل کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ چاہے نبوت کا عہدہ دے دیا جائے کہ نبوت
... عصمت و طہارت وغیرہ موجود ہیں۔

بعض روایات میں علماء امت کے انبیاء بنی اسرائیل جیسا قرار دینے کا مقصد بھی غالباً یہی

ہے کہ اُن کا کام اُدھر کا پیغام لے آنا نہیں ہے۔ پیغام الٰہی آچکا ہے اور دین مکمل ہو چکا ہے۔ ان کا کام امت کو پروردگار کی بارگاہ کی طرف لے جانا ہے اور یہ ذمہ داری امت کی ہے جس کا فریضہ بسا اوقات نبوت اور رسالت سے بھی زیادہ مشکل تر ہو جاتا ہے۔

دور حاضر میں بعض علماء امت کو لفظ امام سے اسی لئے تعبیر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قیادت امت کا فرض انجام دیا ہے ورنہ امامت کی بنیاد قیادت و رہنمائی پر ہے وہ صلاحیت تمام انبیاء کرام میں پائی جاتی ہے چاہے انھیں امامت کا کام سپرد کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

بہرحال امامت ایک منصب ہے جو انبیاء کرام کو ان کی نبوت کے بعد عطا کیا جاتا ہے اور دیگر افراد کو نبوت کے خاتمہ کے بعد دیا گیا ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ امت کو احکام الٰہیہ پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے اور اس طرح انھیں بارگاہ احدیت میں لا کر کھڑا کر دیا جائے اور اس کا وسیلہ صرف ان کے بیانات اور خطبات نہ ہوں بلکہ ان کا ذاتی عمل اور کردار بھی ہو تاکہ انسان یہ محسوس کر سکے کہ بارگاہ الٰہی تک پہنچنے والے انسان کا کردار کیسا ہوتا ہے اور ہم اس کی بارگاہ تک جانے کے قابل ہو گئے تو ہماری زندگی کا حسین ترین نقشہ کیا ہوگا۔

امامت کا عقیدہ اپنے مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر چند مخصوص نتائج و اثرات کا حامل ہے جن میں بعض نتائج و ثمرات کی طرف نبوت کے سلسلہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کی تفصیل اس مقام پر درج کی جا رہی ہے

۱۔ نجات از فتن

انسانی زندگی میں مختلف قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں جو اکثر اوقات فتنوں کی شکل میں سر اٹھاتے ہیں اور قوم کو بدترین مصائب سے دوچار کر دیتے ہیں۔ انہیں عناصر میں نفس پرستی، جاہ پرستی، ہوس جاہ و منصب، قبائلیت وغیرہ جیسے جراثیم شامل ہیں جو انسان کے مختلف گوشوں میں چھپے رہتے ہیں اور جیسے ہی کسی بڑے فائدہ کا چہرہ دکھائی دیتا ہے سب نکل کر باہر آ جاتے ہیں اور عالم انسانیت کو ایک عظیم تباہی سے دوچار کر دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں انتخابات کے موقع پر ہونے والی دھاندلیاں اس حقیقت کا بہترین ثبوت ہیں

کوئی شخص بھی اپنے ضمیر کی آواز کو سند نہیں کرتا ہے بلکہ ہر شخص مصلحت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے جس سے رائے عامہ کو ہموار کیا جا سکے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔ عقیدۂ امامت ان تمام مصائب سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے جب امام کے تقرر کا کام نبی کے تقرر کی طرح پروردگار انجام دیتا ہے اور امت تمام قبائلی، عنصری، قومی اور نفسی [illegible] سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

دور حاضر کے نام نہاد دانشور [illegible] اور استعمار کے بدترین ضمیر فروش ایجنٹ موسیٰ موسوی نے اپنی کتاب "مسلک اعتدال" میں یہ نقطہ بھی اٹھایا ہے کہ امامت کا عقیدہ دور امیر المومنینؑ میں نہیں تھا اور بعد کے شیعوں نے پیدا کر لیا ہے۔

اس جاہل مطلق کو دعوت ذوالعشیرہ کی بھی خبر نہیں ہے جہاں سے تاریخ اسلام شروع ہوتی ہے اور جہاں پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کی وصایت، وزارت اور خلافت کا اعلان [illegible] اور قوم پر ان کی اطاعت فرض قرار دی تھی۔

اسے اُن بے شمار احادیث کی بھی اطلاع نہیں ہے جن میں حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی امامت کا صریحی اعلان کیا گیا ہے اور انھیں قوم کے لئے قائد قرار دیا گیا ہے۔

[illegible] مستشرق [illegible] کا خیال یہ ہے کہ صدر اسلام میں صرف حضرت علیؑ کی فضیلت اور [illegible] کا عقیدہ تھا [illegible] کی امامت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بات بے شمار تاریخی [illegible] کے خلاف ہونے کے علاوہ [illegible] منطق کے بھی خلاف ہے کہ حضرت علیؑ کا یہ تصور فضیلت [illegible] واقع تھا یا خلاف واقع؟

[illegible] مطابق واقع تھا تو [illegible] فضیلت کی مخالفت کرنے والے [illegible] صحابہ کرامؓ [illegible] نہیں ہیں بلکہ [illegible] حق و صداقت کے مجرم ہیں جنہیں [illegible] جرم کی سزا [illegible] کہ انہیں امت [illegible] قیادت کا شرف عطا ہونا چاہیے تھا۔

[illegible] خلاف واقع تھا تو یہی [illegible] حضرت علیؑ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور انھیں [illegible] کی بنا پر ہمیشہ کے لئے خلافت سے محروم کر دینا چاہیے تھا نہ یہ کہ انھیں چوتھے [illegible] بنا دیا جاتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مذہب شیعہ اور قوم شیعہ کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا ایک ایسی سازش ہے جس کا مقصد صرف شیعہ کو بدنام کرنا ہی نہیں ہے کہ اس نے مسلک اہلبیتؑ سے انحراف کی روش اختیار کر لی ہے اور اپنے لئے منافقین کی طرح ایک پناہ گاہ بھی تلاش کر لی ہے تاکہ تشیع کا مسئلہ الگ رہے اور اس طرح امت میں تفرقہ پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ ہاتھ میں رہے۔

دور قدیم میں منافقین کا طریقہ کار بھی یہی تھا کہ وہ اسلام کی ایک ایسی تعبیر کرتے تھے جس میں نفاق کی گنجائش رہے اور حقیقی مخلص مسلمانوں کو بنیاد پرست متعصب اور تنگ نظر کہا کرتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی منافق کا نفاق کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ اعتقاد بر احکام

دنیا کی ساری حکومتوں میں ناکامی کا ایک بڑا راز یہ ہوتا ہے کہ عوام کو موجودہ احکام پر اعتماد نہیں ہوتا ہے اور وہ بعض احکام کو بہرحال غلط تصور کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں یا تو ان پر بادل ناخواستہ عمل کرتے ہیں یا حتی الامکان عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح نظام فیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقیدۂ امامت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے عوام کی نگاہ میں حاکم معصوم ہوتا ہے اور اس کے جملہ احکام پروردگار کے احکام ہوتے ہیں اور اس کی حیثیت صرف ترجمان ہوتی ہے۔ جس کے بعد اس کی مخالفت پروردگار کی مخالفت ہوتی ہے اور اس سے بغاوت پروردگار سے بغاوت ہوتی ہے اور اس کے زیر اثر انسان نہایت درجہ خضوع و خشوع سے عمل کرنے پر تیار رہتا ہے اور نظام اپنے ماننے والوں کے درمیان ناقابل عمل نہیں ہوتا ہے۔

اس کی بہترین مثال مسئلہ خمس ہے کہ عقیدۂ امامت سے محروم افراد نے اسے نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ان کے پاس فقراء اور ضرورت سب کچھ موجود ہے اور عقیدہ والوں نے اس فریضہ کو آج تک زندہ رکھا ہے جب تک حکومت نے ان کی [illegible] بھی نہیں کی ہے بظاہر مال کا نقصان بھی ہے لیکن عقیدہ کی راہ میں ان قربانیوں میں لذت کا احساس ہوتا ہے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ اعتقاد بر عدل

قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی امامت کے ذیل میں واضح لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ امامت کا شرف ظالم افراد کو نہیں مل سکتا ہے اور پروردگار کسی ظالم کو یہ عہدۂ امامت نہیں دے سکتا ہے۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عقیدۂ امامت انسان میں یہ اعتماد پیدا کراتا ہے کہ امام کی زندگی میں کسی طرح کے ظلم کا امکان نہیں ہے اور اس کی زندگی سراپا عدل و انصاف ہے جب کہ دیگر افراد اور حکام کے بارے میں بہرحال یہ امکان رہتا ہے کہ ان کی زندگی میں ظلم و ستم شامل ہو جائے اور اس طرح ان کے کردار کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔

اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قدر حاکم کے عدل و انصاف پر اعتماد ہوگا اسی قدر عوام کے اندر عدل و انصاف کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے قائد کے کردار کو نمونۂ عمل بنا سکیں گے۔

امامت کا یہی امتیاز تھا کہ پروردگار نے ساری کائنات کو عدل و انصاف سے بھر دینے کا کام کسی اور انسان کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ سلسلۂ امامت ہی کے حوالے کیا ہے کہ نظام دنیا اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک کوئی امام قائم عدل و انصاف سے بھر دے اور دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

۴۔ ضرورت ابتلاء

انسان دنیا میں ہر چیز سے انس و محبت پیدا کر سکتا ہے مگر ابتلاء و آزمائش سے ہمیشہ دور بھاگتا ہے اور [illegible] شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے زندگی میں کسی آزمائش سے نہ گذرنا پڑے۔

جب کہ یہ معلوم ہے کہ یہ بات ناممکن ہے اور وہ زندگی زندگی کہے جانے کے قابل نہیں ہے جس میں ابتلاء و آزمائش کا گذر نہ ہو۔ آزمائش ہی سے انسان کے کمالات کے جوہر کھلتے ہیں اور آزمائش ہی سے باکمال اور بے کمال کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے۔ لیکن [illegible] ابتلاء و آزمائش کے نام سے وحشت محسوس کرتا ہے اور اس طرح قوت عمل کمزور

ہوجاتی ہے۔ لیکن عقیدۂ امامت اس مسئلہ کو بھی حل کر دیتا ہے اور انسان جب قرآن مجید میں اس اعلان کو دیکھتا ہے کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد بھی اس وقت تک امامت کا کام سپرد نہیں کیا گیا جب تک ان کا امتحان نہیں لے لیا گیا اور وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہو گئے ــــ تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ ابتلاء و آزمائش انسانی زندگی میں عظیم ترین شرف کی بنیاد ہے اور اس سے خاصان خدا کو الگ نہیں رکھا گیا ہے تو عام انسانوں کا کیا ذکر ہے۔ اس طرح وہ ہر آزمائش کے لئے تیار ہو جاتا ہے، وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مصیبت آزمائش میں نہیں ہے بلکہ مصیبت ناکامی میں ہے جس کے بعد کامیابی کی فکر میں لگ جاتا ہے اور رفتار عمل خود بخود تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔

۵۔ حل مشکلات

امام دنیا کے دیگر حکام سے یہ امتیاز بھی رکھتا ہے کہ حکام زمانہ میں جہالت و نادانی کا عنصر بہرحال پایا جاتا ہے کہ وہ بعض مسائل کے اعتبار سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں اور بعض معاملات ان کے حدود اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور اس طرح جملہ مشکلات حیات کو حل کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ کسی مقام پر حساب کا عذر پیش کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور کسی منزل پر ناتوانی کا اظہار کر دیتے ہیں جس کے بعد بہت سے مسائل حیات ناقابل حل رہ جاتے ہیں۔

عقیدۂ امامت انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اس کے دور میں ایک ایسا قائد بھی موجود ہے جو ہر مسئلہ حیات کو حل کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ہر بڑے اقدام کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور کسی منزل پر مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

۶۔ امکان تحقق نظام عدل

امامت میں عدالت اور عدم ظلم کی شرط کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ امام کے قول و فعل پر مکمل اعتماد کے امکانات ہوتے ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس شرط کی بنیاد پر امام

یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دنیا میں نظام عدل و انصاف قائم کر سکے گا۔ اس لئے کہ جس شخص کے قول یا عمل میں ذرا بھی انحراف اور ناانصافی کا امکان ہوتا ہے وہ ظلم و جور کے خلاف قیام اور عدل و انصاف کا نظام قائم نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن جس شخص کے عدل و انصاف کی ضمانت پروردگار نے لی ہو اور اسی نے اسے امام بنا دیا ہو اس سے سو فیصد توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نظام عدل و انصاف قائم کر دے گا۔ اس لئے کہ خود اس کے کردار میں کسی قسم کا ظلم یا انحراف نہیں ہے۔

واضح رہے کہ یہ بات صرف امامت اور قیادت کے عقیدہ سے نہیں پیدا ہو سکتی ہے بلکہ اس کے لئے منصوص من اللہ امامت کی ضرورت ہے تاکہ پروردگار کی طرف سے تقرر کردار کی عدالت کی ضمانت دے سکے اور اس اعلان کا تحقق ہو سکے جو جناب ابراہیمؑ کے دور میں کر دیا گیا تھا کہ میرا عہدہ ظالمین کو نہیں مل سکتا ہے۔

۷۔ قیادت معصوم

امامت کے شرائط میں عدالت کے علاوہ عصمت کی شرط بھی پائی جاتی ہے اور عدالت و عصمت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ عدالت میں عمداً انحراف کا امکان نہیں ہوتا ہے لیکن سہو و نسیان اور بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ اس کے برخلاف عصمت میں سہو و نسیان کا امکان بھی نہیں رہتا ہے لہٰذا جس قدر اعتماد معصوم کے قول و عمل پر ہو سکتا ہے اس قدر اعتماد و اعتبار مرد عادل کے قول و عمل پر نہیں ہو سکتا ہے۔ عدالت کے ساتھ سہو و نسیان کا امکان بے اعتمادی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لیکن عصمت کے بعد ایسا کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس امامت معصوم کا عقیدہ ہے تو اسے اپنے قائد پر اس قدر اعتماد ہوگا جو دنیا کے کسی انسان کو نہیں ہو سکتا ہے اور اس طرح معصوم قیادت وہ تمام اصلاحات کر سکتی ہے جو غیر معصوم قیادت کے امکان میں نہیں ہے۔

۸۔ وجود عالم الغیب

امامت کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ غیب کا ذاتی علم صرف پروردگار کو ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی

سکتی ہے تاہم وہ علمِ غیب کا حامل نہیں ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پروردگار
اپنے پسندیدہ بندوں کو اپنے غیب پر مطلع کردیتا ہے اور انہیں ان تمام اسرار کائنات سے باخبر
کردیتا ہے جن کی جانب اصلاح عالم کے لئے ضروری ہو یا جن کی کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہو۔
امام پروردگار کی طرف سے مقرر کردہ نمائندہ ہوتا ہے لہٰذا اس کے پسندیدہ ہونے میں کسی
شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس طرح اس کا غیب سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے لہٰذا اس
عقیدہ کا عقیدہ انسان میں یہ اطمینان نفس بھی پیدا کردیتا ہے کہ جس کا قائد کسی وقت بھی دھوکہ
نہیں کھا سکتا ہے اور اس سے بہتر قیادت کا فرض کوئی شخص انجام نہیں دے سکتا ہے۔
مستقبل سے باخبر اور کائنات کی اطلاع رکھنے والے کی قیادت کا عقیدہ انسان کو کس قدر
مطمئن اور مسرور رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی افراد کرسکتے ہیں جو اس عظیم ترین عقیدہ
کے حامل ہوں ورنہ دوسرے افراد اس کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ نہیں کرسکتے ہیں۔

۹۔ نمونۂ کمال کردار

ختم نبوت کے عقیدہ نے انسان کو ایک عظیم ترین نمونۂ کردار سے محروم کردیا تھا وہ انسان جس کے
زیر سایہ سکون و اطمینان کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ یکایک نبوت کا سلسلہ ختم
ہوگیا اب اگر مسلمانوں کا امت کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کی
گاڑی ریورس (Reverse) میں چلنے لگی اور معصوم کو دیکھ کر آگے بڑھنے والا مسافر
ایک ایسے مرکز پر پہونچ گیا جہاں آگے راستہ بند ہے اور آگے بڑھنے کا کوئی امکان
نہیں ہے۔
ظاہر ہے کہ یہ نام انسانیت کی انتہائی بدبختی کا منظر ہوگا جہاں تیز رفتاری سے آگے
بڑھنے والا مسافر دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو جائے اور پھر سے اُلٹے پاؤں پلٹنا پڑے۔
اس بدبختی سے نجات کا واحد ذریعہ عقیدۂ امامت ہے جہاں سلسلۂ نبوت کے
خاتمہ کے بعد بھی ایک مکمل نمونۂ کردار نگاہوں کے سامنے موجود رہتا ہے اور ہر دور میں
کردار کی مثال پیش کرتا رہتا ہے۔

۱۰۔ وحدت کردار

عقیدۂ امامت میں یہ نکتہ بھی پایا جاتا ہے کہ بارہ امام بقول پیغمبر اسلامؐ بارہ ہیں اور
دورِ حیات ظاہری طور پر سیکڑوں سال پر اور واقعی طور پر ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس
کے باوجود ان کے کردار پر نہ علاقوں کا اثر ہوا ہے اور نہ ادوار و زمان کا۔ انہوں نے سہولت کا
دور بھی دیکھا ہے اور مشقت کا بھی ۔۔۔ وہ تحت حکومت بھی رہے ہیں اور قید خانہ میں بھی۔
ان کے دور میں ان کے ہزاروں شاگرد بھی رہے ہیں اور مکمل طور پر گوشہ نشین بھی رہے لیکن ان
تمام امور کے باوجود ان کے کردار میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پیدا ہو سکا۔ انہوں نے
اسلام کا فکر تحریر کیا ہے اور طرز عمل بدلا ہے۔ کسی نے دوسرے پر تنقید کی ہے اور نہ
کسی نے بحث کرکے دوسرے پر اعتراض کیا ہے۔ اور اسی طرح یہ عقیدہ انسان کو اس امر کی طرف
متوجہ کرتا ہے کہ امت اسلامیہ کسی طرح کے حالات سے کیوں نہ دوچار ہوجائے اور اس میں رنگ
و نسل و زمان و قوم کا کسی قدر اختلاف کیوں نہ ہوجائے۔ اس کے کردار کو متحد رہنا چاہیے اور
اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔
وحدت کردار کا سبق عقیدۂ امامت سے ہٹ کر کسی مقام پر ممکن نہیں ہے۔
اس مقام میں وحدت کا یہ عقیدہ بے مثل ہے جہاں اصول مقرر اور مذہب واحد
ہو مگر قائدین الگ الگ ہوں اور باپ و بیٹے سے متفق ہو اور نہ چچا ...
۔۔۔ دوسرے ... اور دوسرا بیٹے کو احمق ۔۔۔ ایک کی نظر میں دوسرے کی خلافت
... اور دوسرے کی نظر میں اس کی حکومت امت کے لئے دور ابتلاء و مصائب
وحدت کردار کو تلاش کرتا ہے اور ... قدم آگے بڑھتا ہے تو عقیدۂ امامت کا سہارا
لینا ہوگا اور اس کے بغیر وحدت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۱۱۔ گرانی اعمال

... امامؑ کسی کی طرح یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ امت کے اعمال کا نگراں

ہوتا ہے اور مشرق و مغرب عالم میں کوئی بھی حادثہ رونما ہوتا ہے۔ امام کی نظروں سے غائب نہیں ہوتا ہے اور اس طرح ہر انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ نبی اور امام بصورت ولایت ہر طرح کے احوال سے باخبر ہیں، اور کوئی شے ان کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ جس قدر انسان کے اعمال کی اصلاح کر سکتا ہے۔ یہ کام حکومت اور پولیس کے ذریعے سے نہیں لیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ پروردگار کے علم غیب کے بعد نبی یا امام کی نگرانی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اور اسی کی جو ہر رگ میں نگرانی کے عقیدہ کے بعد امام کی نگرانی کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ منطقی طور پر یہ بات معقول ہے لیکن انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان منطقی طور پر علم خدا کا عقیدہ رکھنے کے بعد بھی اس قدر برائیوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے جس قدر پرہیز اس وقت کرتا ہے جب مخلوقات میں کوئی اس کے اعمال کا دیکھنے والا ہوتا ہے حالانکہ منطقی اعتبار سے پروردگار کے مقابلہ میں انسان کے دیکھنے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہی حال نبیؐ اور امامؑ کی نگرانی کا ہے کہ نبیؐ کی نگرانی کا عقیدہ بھی اُس قدر موثر نہیں ہوتا ہے جس قدر موثر امامت کے عقیدہ میں پائی جاتی ہے کہ انسان اس مرحلہ پر بھی مر جانے والے سے اُس قدر متاثر نہیں ہوتا ہے جس قدر زندہ سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا بہترین ثبوت عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ نبیؐ مرنے کے بعد کسی قابل نہیں رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زندہ امام کے بارے میں نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ نگاہوں کے سامنے سے غائب ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ دور حاضر کی ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نگاہوں کے لئے سامنے ہونا ضروری نہیں ہے۔ انسان کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں جن سے ہزاروں میل کے حالات اور فضا کی مستقل تصویروں کو جمع کر لیتا ہے اور کوئی شخص جمع کرنے والے کو دیکھنے والا نہیں ہوتا ہے اور وہ ہر کسی کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔

۱۱۔ منصب و تواضع

عقیدۂ امامت ایک طرف انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ یہ انسان وہ عظیم ترین فرد عالم بشریت ہے

جسے پروردگار نے کل کائنات کا حاکم قرار دیا ہے اور اس کے کردار میں کسی طرح کے ظلم و ستم کے نہ ہونے کی شہادت دی ہے اور دوسری طرف امام کی زندگی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان کا ایمان معرفت اور بصیرت کی روشنی میں ہو اور اس کی بنیاد تقلید آباء اور تعصب مذہبی پر نہ ہو۔ اور انسان جب امام کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں تکبر و غرور اور احساس شخصیت و عظمت کے بجائے انتہائی درجہ کی خاکساری دیکھتا ہے اور امام کی زبان سے یہ فقرہ سنتا ہے کہ مجھے میرے تمام القاب میں سب سے زیادہ محبوب "ابو تراب" کا لقب ہے کہ ہر لقب سے میری شخصیت کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے اور اس لقب سے میری خاکساری کا اظہار ہوتا ہے اور میں امیر المومنین کی امارت اور متقین کی امامت سے زیادہ اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ مجھے بندہ خاکسار سمجھا جائے اور میری سیرت کے اس پہلو پر خاص توجہ دی جائے جس میں بندگی کا سارا کمال مضمر ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات کی شہادت کے بعد جب ضرار معاویہ کے دربار میں آئے اور اس نے ضرار سے علیؑ کے بیان کرنے کا اصرار کیا تو ضرار نے تاریخ حیات امیر المومنینؑ کا نقشہ کھینچتے ہوئے معاویہ کے دربار پر گہری سنجیدگی طاری کر دی اور فرمایا کہ علیؑ کی ایک بڑی صفت یہ بھی تھی کہ جب محفل میں بیٹھتے تھے تو انہی کی ایک فرد معلوم ہوتے تھے اور کسی طرح کی امتیاز کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ بیٹھنے والوں میں حقوق کے قائل تھے جو دوسروں کو دیا کرتے تھے اور اپنے اوپر وہ سارے فرائض عائد کرتے تھے جن کا دوسروں سے تقاضا کیا کرتے تھے۔

امامت کے عقیدہ کے یہ دونوں رخ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ جو دنیا میں منصب اور عہدہ حاصل کرنے کے بعد غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور تواضع و انکسار کا دامن ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے کہ تواضع و خاکساری حاکم آزاد انسان کی انسانیت کی دلیل ہے اور غرور و تکبر سے شیطنت و حیوانیت کی بو آتی ہے۔

۱۲۔ استغنا

عقیدۂ امامت انسان کو ایک ایسی شخصیت سے روشناس کراتا ہے جو اپنے دور میں تمام اہل عالم و اہل

سے زیادہ علم و فضل رکھتا ہے اور تمام طاقتوں سے طاقتور قوت کا مالک ہوتا ہے اور ایسی شخصیت کا وجود ساری کائنات کی تمام طاقتوں سے بے نیاز ہونے کے لئے کافی ہے کہ دنیا کی تمام بڑی طاقتیں اور سپر پاور انہیں قوتوں کی حامل ہیں جو انہوں نے بزور علم و فہم حاصل کی ہیں۔ ان کے پاس خدائی طاقت اور قوت نہیں ہے لیکن امام کے پاس خدائی اقتدار اور اس کی دی ہوئی طاقت ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی ہے۔

دنیا کا علم ستاروں کا جہان دریافت کر سکتا ہے ستارہ کو زمین پر اتار نہیں سکتا ہے دنیا کی ترقی چاند تک پہنچ سکتی ہے چاند کے ٹکڑے نہیں کر سکتی ہے۔ دنیا کا علم سورج کی گردش کو ناپ سکتا ہے سورج کو پلٹا نہیں سکتا ہے اور امام کو پروردگار نے یہ تمام طاقتیں عنایت کی ہیں اور اس کے پاس یہ ساری صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔

اس عقیدہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس کے طفیل میں تمام بڑی طاقتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میرے پاس ان طاقتوں سے بالاتر ایک طاقت موجود ہے جو مجھے ان کی محتاج نہیں ہے اور ان کے سلطنت و جبروت کا خوف نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں عقیدۂ امامت سے محروم مسلمان بڑی طاقتوں کے غلام بن گئے ہیں اور وہ انہیں اپنے تحفظ کا ذمہ دار سمجھتے ہیں جب کہ عقیدۂ امامت کے حامل افراد آج بھی ان سے بے نیاز ہیں اور ان کا کوئی خوف اپنے دل و دماغ میں نہیں رکھتے ہیں۔

ہمیں یہ احساس ہے کہ گو سپر پاور کے یہی اسلحے [illegible] کے مددگار ہیں [illegible] ان کی سازش کی بساط نہیں ہے اور وہ وقت ضرورت [illegible] تو ہمارے پاس بھی ایک سپر پاور غیبت کے پردہ میں محفوظ ہے اور اس میں یہ طاقت بھی ہے کہ وہ ان اسلحوں کو استعمال سے پہلے ہی معطل اور بیکار بنا دے اور باطل کی کوئی کارروائی ممکن نہ ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ احساس انسان میں وہ احساس عظمت و برتری پیدا کرتا ہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے اور یہی عقیدۂ امامت کا سب سے بڑا فیض ہے جس نے ملت شیعہ کو باعزت طور پر زندہ رہنے کا شعور اور حوصلہ عطا کر دیا ہے۔

۱۴۔ انتظار مستقبل

عقیدۂ امامت کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ پروردگار نے جو بارہ امام مقرر کئے ہیں ان کا آخری مہدی ہے اور وہ بقول پیغمبر اسلام اس وقت تک ظاہر نہ ہوگا جب تک ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے معمور نہ کر دے۔ [illegible] وہ حضرت آج بھی پردہ غیب میں بیٹھ کر حالات دنیا کا جائزہ لے رہا ہے اور آخری انقلاب کے لئے حکم الٰہی کا انتظار کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کے حامل انسان کے نزدیک کائنات کا مستقبل مجہول نہیں ہے وہ رہنماؤں یا مفکروں کے رحم و کرم سے وابستہ ہے۔ دنیا کا مستقبل نہ تو سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہے اور نہ اقوام متحدہ کے ممبروں کے ہاتھوں میں ہے۔ دنیا کا مستقبل ایک مہدی کے انقلاب سے وابستہ ہے اور اس انقلاب کا مقصد عدل و انصاف کا قیام ہے اور ظلم و جور کی تباہی اور بربادی ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسے عقیدہ کا حامل انسان مستقبل کے بارے میں بڑی حسین امیدیں رکھتا ہے اور یہ امیدیں اوہام و خیالات کی منزل میں نہیں ہیں بلکہ [illegible] علمی و یقینی ہیں اور یہ قطعی و یقینی [illegible] کرتا ہے

ایک مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں ظلم و جور مسلط ہو جائے تو وہ خود بھی [illegible] انقلاب کا [illegible] اور اس کو مستقبل کی [illegible] ہو جائے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے پہلے [illegible] تاکہ [illegible] مستقبل [illegible] کسی عقیدہ [illegible] نہیں ہو سکتا ہے۔

رب کریم امت اسلامیہ کو اس عقیدہ سے وابستہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور جو حضرات اس عقیدہ سے وابستہ ہیں انہیں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعادت کرامت فرمائے۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

قیامت

عدالت الٰہیہ کا سب سے اہم نتیجہ اور اس کے ظہور کا سب سے عظیم مرتبہ روز قیامت ہے جس دن سارے انسانوں کے اعمال کا حساب کیا جائے گا اور ہر شخص کو حسب استحقاق جزا یا سزا دی جائے گی۔

قیامت کے بارے میں حسب ذیل مسائل سے متعلق گفتگو کی جاسکتی ہے۔

ضرورت قیامت

اس سلسلہ میں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ انسان کے فنا ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے اور اس کے اعمال کا حساب کرنے کی ضرورت کیا ہے جب کہ فنا کے گھاٹ اتر جانے والا کسی جزا کا مطالبہ بھی نہیں کرتا ہے اور اسے سزا کا ہوش بھی نہیں رہ گیا ہے۔

لیکن اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ انسان مرنے والا فنا نہیں ہوتا ہے۔ اس کی روح عالم ارواح میں محفوظ رہتی ہے اور اس کا جسم صرف منتشر ہو کر خاک کے اجزاء میں مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں فنا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ مرنے والا مطالبہ کرے یا نہ کرے، پیدا کرنے والے نے احکام معین کرکے انعام کا وعدہ کیا ہے اور وعدہ کرنے والے کی عدالت کا تقاضا اور اس کی حکمت کی دلیل یہ ہے کہ احکام کے نتائج کو واضح کرے اور اپنے وعدہ کو پورا کرے ورنہ مرنے والے کے

ساتھ عدالت الٰہیہ کا عقیدہ بھی دفن ہو جائے گا اور یہ بات غیر ممکن ہے۔ پروردگار عدالت کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ اپنے وعدہ سے بے وفائی کر سکتا ہے ورنہ انسان کی طرح اس میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی تو ہر شخص عمل خیر کو ترک کر دے گا اور دنیا ظلم و جور کی بستی میں تبدیل ہو جائے گی۔

۲۔ اگر جزا و سزا ضروری ہے اور اس سے عدالت الٰہیہ کا تحفظ ہو سکتا ہے تو اس کے لئے کسی مستقل دن یا زمانہ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا ہے کہ جس دنیا میں عمل ہو وہیں جزا یا سزا بھی دے دی جائے۔ آخر دنیا کے دوسرے نظام کیا کرتے ہیں، وہ ان کے نتائج کہاں برآمد ہوتے ہیں۔ وہ جزا یا سزا کس طرح دیتے ہیں اور ان کا نظام عدالت کس طرح چلتا ہے۔ اسلام بھی اسی روش پر کیوں نہیں چلتا ہے اور اسے ایک مستقل وقت اور ساعت کی ضرورت کیوں ہے۔

لیکن اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ اولاً تو دنیا کے دوسرے نظام صرف اعمال کا حساب کرتے ہیں اور اسلام پوری زندگی کا حساب کرتا ہے۔

نظامہائے حیات رعایا کے مالک نہیں ہیں۔ انہیں نہ وجود کا حساب کرنے کا حق ہے اور نہ زندگی کا۔ وہ صرف اعمال کا محاسبہ کر سکتے ہیں اور وہی کر بھی سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ انہیں محاسبہ کرنے کا حق ہے اور نہ محاسبہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اسلام خالق کائنات کا مذہب ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اسے اعمال کی طرح زندگی اور موت کا حساب لینے کا حق ہے اور یہ حساب اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ حیات کے خاتمے کے بعد اور دنیا کے ختم ہونے کے بعد حساب و کتاب شروع کیا جائے اور اس کے بعد جزا یا سزا کا فیصلہ کیا جائے۔

اسی حکمت الٰہیہ کی بنا پر اسلام نے بعض ثواب اور اعمال اور صدقہ کا سلسلہ جاری کیا ہے

۳۔ اور قیامت ہی ہوتا ہے تو کیوں نہ زندہ رہنے والوں کو یہ موقع دے دیا جائے کہ وہ مرجانے والے بزرگوں کے لئے ذکر خیر کریں یا اس کے ورثہ میں کمی کا انتظام کر سکیں۔ بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اگر دوسرے افراد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور ان کے اعمال کو شمار نہ بھی کیا جائے تو وہ ایسے نیک اعمال اور انجام دئے ہیں جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ ان میں اس کا اجر شامل کر دیا جائے ورنہ عمل کرنے والا خود اپنے عمل سے بھی محروم ہو کر رہ جائے گا۔

روایات میں انھیں اعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "ابن آدم کے مرجانے کے بعد بھی اس کے بعض خیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس نے نیک اولاد چھوڑی ہے یا کوئی خیراتی ادارہ قائم بنایا ہے، کوئی نیکی کا ادارہ قائم کیا ہے تو اس کے نیک اثرات سے اسے محروم نہیں ہونا چاہیے اور یہ کسی وقت ممکن ہے جب جزا و سزا کا وقت عمل کے وقت سے الگ ہو۔ ورنہ مرنے والا ان تمام بامقدار اور دائمی قسم کے اعمال کے اثرات سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح ہر شخص صرف وقتی کار خیر پر اکتفا کرے گا اور عالم انسانیت عظیم ترین اعمال خیر سے محروم ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض اعمال بقید حیات کام آتے ہیں جہاں عمل ختم ہو جاتا ہے اور عمل کرنے والا زندہ رہتا ہے اور بعض اعمال اس سے زیادہ سنگین ہوتے ہیں جہاں عمل کے ختم کے ساتھ عمل کرنے والے کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جزا و سزا کو اسی دنیا تک محدود کر دیا جائے تو ایسے اعمال کا انجام کیا ہوگا اور ایسے عظیم اعمال کی جزا و سزا کا کیا حشر ہوگا۔

ایک معمولی جرم کرنے والے کو سزا دی جائے اور سنگین ترین جرم کرنے والے کو سزا نہ دی جائے ... آبرو کے ذیل میں ایسی صورت کہ ... والے کو سزا دی جائے اور زندگی کے ذیل میں جو کسی کرنے والے کو کوئی سزا نہ دی جا سکے۔ اس لئے کہ اس نے موت کی پناہ حاصل کر لی ہے اور اس پناہ میں آنے والا ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

یہی حال کار خیر کا بھی ہے کہ فقیر کو چند پیسے دینے والا اس ... کا مستحق ہو ... سلام کرنے والا اجر ... کا حقدار ہو اور اس ... کسی ڈوبتے ... کو بچاتے ہوئے اپنی جان ... ہو جائے تو اس کا کوئی اجر نہ ہو جب کہ اس نے جان تک قربان کر دی ہے ... کے اجر کا استحقاق موت نے ختم کر دیا ہے اور موت وہ جلاد ہے جو صاحب حق کو اس کے حق سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ بلکہ اس سے ... خود شہید راہ خدا جس نے نظام اور مذہب کی خاطر جان تک قربان کر دی ہے۔ ہر طرح کے ثواب سے محروم ہو جائے گا کہ اس نے یہی ... دے دی ہے اور اپنے کو موت کے خطرناک کنویں میں کیوں ڈال دیا ہے۔ اسے اجر و ثواب ... تھی تو تھوڑی دیر ... کر کے میدان سے فرار کر جاتا ... جان بچا لیتا ... اس کی سزا

دی جائے گی اور ہر طرح کے انعام سے محروم ہونا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات خلاف حکمت و عدالت بھی ہے اور خلاف عقل و منطق بھی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ جزا و سزا کے لئے ایک ایسا موقع ... ہو جائے جہاں ہر طرح کے چھوٹے بڑے عمل کا حساب کیا جا سکے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق جزا یا سزا دی جا سکے۔

کیفیت قیامت

اس سلسلہ میں بھی دو طرح کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں:

۱۔ قیامت روحانی ہے یا جسمانی؟

۲۔ جسم کا دوبارہ احیاء کس طرح ممکن ہے؟

روحانی قیامت سے مراد احساس لذت و الم ہے جو اس دنیا میں بھی ممکن ہے اور مرنے کے بعد بھی امکان پذیر ہے۔ اس لئے کہ جسم کے منتشر ہو جانے کے بعد روح کی زندگی باقی رہتی ہے اور اسے لذت و الم کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی لذت و الم کو قیامت کا نام کیوں نہ مان لیا جائے اور اس کے لئے بدن کو زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا عقیدہ ... عمل ہے یا فقط ایک فلسفیانہ فکر ہے۔ اگر اس کا تعلق فلسفیانہ فکر سے ہے تو جزا و سزا کے ہزار طریقے سوچے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کوئی عادلانہ طریقہ مجازات ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح کا عمل رہا ہے اسی طرح کی جزا یا سزا دی جائے۔

● انسانی اعمال کی دو قسمیں ہیں

(۱) فکری اعمال (۲) جسمانی اعمال

فکری اعمال سے مراد وہ عقائد اور نظریات ہیں جن کے حصول میں جسم کا دخل ہو سکتا ہے ... کان آنکھ اور دل و دماغ کے واسطے انسان کی روح تک پہنچ سکتے ہیں لیکن ... مرکز روح ہے اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جسم کے اجزا کاٹ کر پھینک بھی دئے جائیں ... کا تجربہ نہیں ہو سکتا ہے۔ عقیدہ کی دنیا روح کی دنیا ہے۔ لہٰذا اس کا اجر و ثواب

روح کو دیا جا سکتا ہے۔ جسم کے اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جسمانی اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو انسان تمام زندگی انجام دیتا رہتا ہے کہ ان کا محرک اصلی اور مصدر قوت و طاقت روح ہی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں ہے اور انہیں درحقیقت جسم ہی کے اعمال میں شمار کیا جاتا ہے جیسے نماز روزہ یا و شرب خوری وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اعمال بھی مرنے کے بعد انجام نہیں پا سکتے ہیں اور ان کے انجام پانے کے لئے بھی روح کی مدد کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں جسم کے اعمال میں شمار کیا جاتا ہے کہ جسم کا ادنیٰ نقص بھی ان اعمال پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ہاتھ کے کٹ جانے کے بعد وضو ناقص ہو جاتا ہے۔ اعضاء سجدہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پیر کے کٹنے کے بعد انسان چلنے سے معذور ہو جاتا ہے اور حج بیت اللہ کے بہت سے ارکان کو ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ لہذا ان اعمال کو فکری اعمال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے اور ضرورت ہے کہ دونوں کی جزا و سزا کا الگ الگ انتظام کیا جائے اور دونوں کی جزا و سزا کا الگ الگ طریقہ کار ہو۔

اسلام نے اس کا ایک حل یہ نکالا ہے کہ روح کے ذاتی اعمال کی جزا و سزا مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے عالم برزخ میں دے دی جائے اور اس طرح ایک طویل مدت تک بہترین عقائد سے روحانی کیف حاصل کرتا رہے یا بدترین نظریات سے روحانی اذیت کا احساس رہے اور یہ اس لئے بھی غلط نہیں ہے کہ عقیدہ کے بارے میں دوسرے کے عقائد سے مدد لی جا سکتی ہے اور نہ عقیدہ کا کوئی ایسا سلسلہ ہے جو مرنے کے بعد تک جاری رہے اور اس کے نفع و ضرر کا احساس کرنا بھی ضروری ہو۔

لیکن جسم کے اعمال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے یہاں اس کی جزا کے لئے فرد کا استقرار کیا جائے اور قیامت میں انسان کو اسی طرح جسم اور روح کے ساتھ اٹھایا جائے جس طرح دنیا میں عمل انجام دیتا رہا ہے تاکہ جس طرح مشترکہ طور پر عمل کیا ہے اسی طرح مشترکہ طور پر جزا یا سزا کا مقابلہ کیا جائے۔ نہ روح کو فریاد کرنے کا موقع ملے کہ عمل کی منزل میں مکمل طور پر مادی ہے اور انعام کی منزل میں ہمیں یکسر محروم کر دیا گیا ہے اور نہ جسم کو یہ

موقع ملے کہ عمل کی منزل میں سارا کام مجھ سے لیا گیا ہے اور جزا کی منزل میں سارا انعام روح کو دے دیا گیا ہے۔ دونوں جزا میں بھی مشترک ہیں اور سزا میں بھی۔ اور یہ بات روز قیامت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ عالم برزخ میں دونوں جدا ہو جاتے ہیں۔ روح اپنے عالم میں محفوظ ہو جاتی ہے اور جسم بظاہر فنا و منتشر ہو جاتا ہے اور اس طرح مکمل حساب کا امکان نہیں رہ جاتا ہے۔

کیفیت احیار

دوسرا سوال یہ ہے کہ منتشر جسم کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے یہ سوال وہ ہے جسے دور قدیم کے کفار و مشرکین نے بار بار اٹھایا ہے اور مختلف پہلوؤں میں اس کی فکر رکھی ہے اور بعض فلاسفہ نے بھی اسے فلسفیانہ شکل دے دی ہے اور ایک مستقل کی دنیا ایجاد کر دی ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں صرف اس امر کا تصور کہ قیامت کا عمل خالق اور مالک کو انجام دینا ہے اور اس کا کوئی تعلق مرنے والے سے نہیں ہے۔ تمام شبہات کا واحد جواب بن جاتا ہے۔

— مشرکین روز یہی کہتے تھے کہ یہ مردہ اور بوسیدہ ہڈیاں کس طرح زندہ ہوں گی۔؟

— کبھی یہ سوال اٹھاتے تھے کہ مختلف افراد کے جسم کے اجزاء مخلوط ہو گئے تو انہیں کیسے الگ کیا جائے گا۔؟

— کبھی یہ شبہ پیدا کرتے تھے کہ اگر قاتل مقتول کو کھا گیا تو قاتل یا مقتول کو کس طرح جزا یا سزا دی جا سکے گی۔؟

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ ان میں سے کسی سوال کا تعلق مردہ یا قیامت سے نہیں ہے۔ ان میں بعض کا تعلق قدرت خدا سے ہے اور بعض کا تعلق علم خدا سے ہے۔ اور اس ان دونوں صفتوں کا اعتراف کر لے تو ان شبہات کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے صرف خلق اول۔ قدرت قدیم۔ اور علم مطلق کا حوالہ دے کر بات کو کہا ہے اور مقصد کو محسوس بنانے کے لئے مردہ زمینوں سے سبزہ اگانے کا تذکرہ کر دیا ہے تاکہ

انسان کو احساس پیدا ہو جائے کہ جو مُردہ [illegible] ممکن ہے وہ دوبارہ زندہ [illegible] بھی نکال سکتا ہے۔ اس کے علم و قدرت سے کوئی شے بعید نہیں ہے۔ وہ "علیٰ کل شیءٍ قدیر" بھی ہے اور "بکل شیءٍ علیم" بھی۔

حیات بعد الموت

موت کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ حیات بعد الموت کا ہے کہ حیات بعد موت ممکن ہو تو قیامت کا امکان بھی قطعی ہے اور حیات ہی ناممکن ہو جائے تو قیامت کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا ہے۔

حیات بعد الموت کے بارے میں فلاسفہ نے بے شمار بحثیں کی ہیں۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ ایک فطری تصور ہے جو ہر نفس کے لاشعور میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انسان مصلحتوں کی بنا پر اس حقیقت سے انکار کر دیتا ہے۔

دنیا میں [illegible] کے لئے [illegible] چنانچہ قبروں پر پھول چڑھانا، مرنے والے کو مختلف اعزازات سے نوازنا اس بات کی علامت ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں مرنے کے بعد ایک زندگی کا تصور پایا جاتا ہے [illegible] شمار ہوتا — پھول چڑھانا بھی اسراف کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔

دنیا کی مختلف اقوام کا جائزہ لیا جائے تو اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قوم میں اس قسم کا ایک تصور موجود تھا جو کسی مذہب [illegible] انسان کی فطرت کا دین تھا۔

جزیرہ [illegible] میں [illegible] کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا [illegible] دوسرے عالم میں عیش و عشرت کی زندگی گزار سکے۔

[illegible] کے ساتھ [illegible] مرنے کے بعد بھی سکون کی زندگی گزار سکے۔

مکسیک میں کھانا وغیرہ ساتھ رکھا جاتا تھا تاکہ اس عالم میں بھی کام آ سکیں۔

اور یہ سارے طریقے اس امر کی علامت تھے کہ قوموں کے ذہن میں حیات بعد الموت کا تصور تھا — یہ اور بات ہے کہ وہ ان الفاظ اور مفاہیم سے آشنا نہیں تھے جو اسلامی عقیدہ کی شکل [illegible]

نہیں کرتے تھے بلکہ صرف ایک لاشعوری احساس تھا جس سے دامن کش نہیں ہو سکتے تھے۔

فطری شعور کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی حیات بعد الموت کا عقیدہ اصلاح انسانیت کے لئے بیحد ضروری ہے ورنہ ہر ظالم اور قاتل آخر میں خودکشی کر کے ہر طرح کی سزا سے محفوظ ہو جائے گا اور جرائم کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔

مذہبی اعتبار سے بھی یہ عقیدہ انسان میں ایک خاص جذبہ بیدار کرتا ہے کہ اس عقیدہ کو [illegible] کر دیا جائے تو [illegible] میدان جہاد میں اسی وقت تک ثبات قدم کا مظاہرہ کرے گا جب تک زندگی محفوظ رہے ورنہ زندگی خطرہ میں پڑ جائے تو کوئی شخص بھی میدان میں ثابت قدم نہ رہ سکے گا اس طرح جان بھی چلی جائے گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا — لیکن حیات بعد الموت کے عقیدہ کو شامل کر لیا جائے تو انسان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ [illegible] رہ گئے تو بھی فاتح ہے اور مر جائے تب بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ حیات بعد موت میں [illegible] بہرہ ور ہو جائے گا۔

میدان خندق میں عمرو بن عبدود نے لشکر اسلام کو یہی کہہ کر [illegible] کہ تمہارے عقیدہ میں [illegible] دہشت اور فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تم زندہ رہتے ہو تو غازی کہے جاتے ہو اور مر جاتے ہو تو شہید ہو جاتے ہو [illegible] اس طرح کوئی خسارہ نہیں ہوتا ہے [illegible]

موت

حیات بعد الموت کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے موت کی حقیقت کا ادراک کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر نہ پہلی زندگی طے ہو سکتی ہے اور نہ دوسری۔

موت کو فنائے مطلق کا نام دے دیا جائے تو حیات بعد موت کا کوئی امکان نہیں ہوتا [illegible] فنا کے بعد دوسرا وجود ہو سکتا ہے مگر اسے زندگی نہیں کہی جا سکتی ہے اور [illegible] دوسری زندگی [illegible] دوسرے وجود پر [illegible]

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ موت فنائے مطلق کا نام نہیں ہے اور نہ اسے فنائے مطلق کا [illegible] تصور کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ روح کے بارے میں ہم لاکھ بے خبر سہی جسم کو اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں اور وہ مٹی کا ڈھیر ہو کر خاک میں رل مل گیا ہے۔ لیکن فنا نہیں ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے رو کو دیکھا بھی جا سکتا ہے اور اس کا درد بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

زندگی اور موت کا دار و مدار ایک مادی اور غیر مادی کے ارتباط اور عدم ارتباط پر ہے۔ ارتباط حیات پیدا کرتا ہے اور عدم ارتباط حیات کو موت میں تبدیل کر دیتا ہے اور دونوں کا تعلق دو مختلف عوالم سے ہے لہٰذا ارتباط بھی مادی اور حلول کی قسم کا نہیں ہے کہ کسی غیر مادی کا مادی میں حلول کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ حلول کے لئے دونوں کا ایک نوعیت کا ہونا ضروری ہے ورنہ حلول کا تحقق نہ ہو سکے گا۔

روح اور جسم کا رابطہ کشتی اور ناخدا یا پاور ہاؤس اور بلب کا ہے کہ ناخدا کشتی کو چلاتا رہتا ہے لیکن اس کی جنس بالکل دوسری ہے۔ اور پاور ہاؤس گھر کے سب کو روشن رکھے رہتا ہے لیکن اس کا مرکز بالکل الگ ہے۔ روح بھی عالم ارواح اور عالم مجردات کی ایک مخلوق ہے جسے مناسب وقت پر جسم سے جوڑ دیا جاتا ہے اور جسم میں حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب مدت ختم ہو جاتی ہے تو اس رابطہ کو توڑ دیا جاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔

قبض روح

قبض روح جیسے الفاظ ان آثار کو سمجھانے کے لئے بنائے گئے ہیں جن کا ہر انسان مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ جب تک روح و جسم کا ارتباط باقی رہتا ہے خون سارے بدن میں دوڑتا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک روح ہے جو دوڑ رہی ہے۔ حالانکہ یہ روح نہیں ہے روح کا ایک اثر ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ رابطہ ختم ہو جاتا ہے تو خون منجمد ہو جاتا ہے اور اس کا دوران ختم ہو جاتا ہے کہ گویا دوڑنے والی روح نے اپنا راستہ روک دیا ہے ورنہ قبض روح کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اسے بدن سے کھینچ کر نکال لیا گیا ہے۔ البتہ اس کا رشتہ جسم کے ایک ایک جزء سے تھا جب یہ رابطہ ٹوٹ جائے گا سارا جسم متاثر ہوگا اور گویا سارے جسم سے طاقت کھینچ کر نکالی جا رہی ہے۔

روایات میں اس کیفیت کو مختلف انداز سے سمجھایا گیا ہے۔ کبھی اسے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے

کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کبھی اسے خار دار درخت پر ریشمی کپڑا ڈال کر اس کے کھینچنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کبھی اسے پھولوں سے خوشبو نکل جانا کہا گیا ہے اور کبھی اس کا نام لباس کی تبدیلی رکھا گیا ہے کہ انسان میلا لباس اتار کر دوسرا لباس پہن لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سب سے حسین تعبیر پھول اور خوشبو کی ہے جو مومن کے لئے قبض روح قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ایمان و کردار میں کتنا ہی قابل تحمل و برداشت کیوں نہ ہو درد کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہے خوشبو سونگھنے والا کیا جانے کہ جب پھول سے کھینچ کر خوشبو نکالی جاتی ہے اس پر کیا گزرتی ہے اور اس کا کیا عالم ہوتا ہے۔ یہ تو صرف سونگھنے والا ہے جو اس کیفیت کے تذکرہ سے بھی لذت حاصل کرتا ہے۔

ایمان و کردار بھی اس مسئلہ کو اسی طرح آسان بنا دیتے ہیں جس طرح زنان مصر کے لئے جمال یوسف نے انگلیوں کے کٹ جانے کو آسان بنا دیا تھا کہ انگلیاں بہرحال کٹ گئیں اور خون برآمد ہو گیا لیکن جمال یوسف نے قوت برداشت کو اتنا بڑھا دیا کہ اس سے قوت احساس ختم کر لی اور تو رات نہ ہو سکا۔

بعینہ یہی صورت حال ایک مومن سے قبض روح کی ہوتی ہے کہ اس کا ایمان و کردار اس کے سامنے معصومین کا جمال مبارک مسئلہ کو اس قدر آسان بنا دیتا ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا ہے ورنہ بات اس قدر آسان نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب حالات متغیر ہو جاتے ہیں اور کردار کے بجائے دشمن سامنے آجاتا ہے یا کردار کے بجائے بدکرداری کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے تو حالات اور بھی سنگین ہو جاتے ہیں جب کہ عمل ایک وحشت کا عمل ہے۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے معاذ کے غسل روح کی اذیت کا تذکرہ فرمایا تو حضرت علیؑ نے سوال کیا کیا مومن کے لئے بھی یہی صورت حال ہے فرمایا کہ تین قسم کے مومن ایسی مصیبت کا سامنا کرنے پڑتے ہیں۔ اس تیمم کا کھانے والا، جھوٹی گواہی دینے والا اور ظالم و جور سے مدد کرنے والا۔

اس امر کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرکار دو عالمؐ نے تین مخصوص قسم کے افراد کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ایک ظلم و جور سے حکومت کرنے والا ہے دوسرا جھوٹی

موت کی حقیقت کو بھی دیتے والا ہے اور تفسیر [illegible] ہے اور یہ تصور کہ انسان کے تمام [illegible] بنا دیتے ہیں جس کا [illegible] سکتا ہے۔

تاریخ اسلام میں تو یہاں تک [illegible] کے [illegible] امام [illegible] حروف سے لکھے کے قائل ہے [illegible] کے شاگرد نے وقت موت سورہ یٰسین سے [illegible] انکار کر دیا اور مرنے کے بعد خواب میں ذکر کیا کہ اس نے تو [illegible] کا سبب [illegible] اور صواب [illegible] کے محرمین کو وقت [illegible] کی توفیق [illegible] سے حاصل ہوتی ہے

قابض روح

قرآنی آیات میں قبض روح کے عمل کو کبھی پروردگار کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی مدت حیات کو پورا کر کے موت دیتا ہے۔ اور کبھی یہ کام ملائکہ کا قرار دیا گیا ہے کہ وہ روح قبض کر کے انسان کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں اور کبھی اس کا ذمہ دار ایک مخلوق ملک الموت کو ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ یہ عمل انجام دیتے ہیں۔

لیکن ان اسلوب بیان کا اختلاف حقیقتاً حقیقی اختلاف [illegible] نہیں ہے بات صرف یہ ہے کہ جب کسی کام کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں تو ہر حیثیت کے اعتبار سے کسی ایک عامل کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] کو فاتح قرار دیا جائے گا [illegible] قرار دیا جائے گا۔ [illegible] کسی طرح کا اختلاف نہ ہوگا۔

موت کی حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے [illegible] ہے جس کے بعد [illegible] جسم سے [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] اس کے بعد جب وہ حکم دیتا ہے تو سارے فرشتے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور [illegible]

واضح ہو جاتی ہے۔ اور اسی موت میں تینوں نسبتوں کا دخل ہوتا ہے [illegible] ہوتا ہے۔ ملک الموت روح قبض کرنے والے ہوتے ہیں اور ملائکہ ان کے [illegible] حاضری دینے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا موقع اور محل کی مناسبت سے اس عمل کو کسی کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

وحشت موت

موت کی جو تعبیر اور تفسیر بھی کی جائے یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے وحشت کا احساس ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ [illegible] اسی وحشت موت کا علاج ہے [illegible] اسی وحشت موت کا نتیجہ ہے، موت کو "[illegible]" "جلاد" "[illegible]" وغیرہ جیسے القاب سے یاد کرنا اسی وحشت کی نشاندہی کرتا ہے ورنہ [illegible] وحشت ناک نہ ہوتی تو ایسے [illegible] القاب اور خطابات سے [illegible] یاد کیا جاتا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وحشت موت کا سبب موت کی غلط تفسیر ہے۔ لوگ موت کو زندگی کی انتہا سمجھتے ہیں اس لیے گھبرا جاتے ہیں۔ [illegible] دوسری [illegible] قرار دے دیا جائے تو کسی طرح کی وحشت نہ رہ جائے گی۔ حالانکہ یہ بات بھی بظاہر صحیح نہیں ہے۔ موت کو دوسری [illegible] قرار دے دیا جائے تو [illegible] پیدائش بہرحال [illegible] حساب [illegible] تصور وحشت ناک ہوگا۔

وحشت موت کے [illegible] اسباب [illegible] ہیں:

- حقیقت موت سے ناواقفیت

انسان موت کو فنا اور زندگی کے خاتمہ کا نام دے کر گھبرا جاتا ہے حالانکہ در حقیقت [illegible] ہے۔ اس کا وقت معین نہ ہوتا تو مومن کی روح ثواب کی جستجو میں بدن کا ساتھ [illegible] اور کافر کی روح عذاب کی [illegible] کے لئے تیار نہ ہوتی۔ یہ تو موت کا [illegible] ہے جو دونوں کی روحوں کو روکے ہوئے ہے اور اسی سے یہ زندگی

● ـ دنیا سے دلچسپی

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان جب کسی چیز سے ضرورت سے زیادہ دل لگاتا ہے تو اس کی جدائی سے بہرحال وحشت ہوتی ہے۔ موت سے وحشت انہیں افراد کو ہوتی ہے جنہوں نے دنیا میں اس قدر سامان جمع کر لیا ہے کہ اب اس کی جدائی کا تصور بھی ناقابل برداشت ہوگیا ہے ورنہ اگر سادہ اور پاکیزہ زندگی ہوتی اور ضروریات زندگی پر اکتفا کر لی ہوتی تو جب چاہتا اس دنیا سے رخصت ہو جاتا اور کسی طرح کی وحشت نہ ہوتی۔

● ـ آخرت کی بربادی

انسان نے دنیا کی آبادی کو اس قدر اہمیت دے دی ہے کہ آخرت کا تصور ہی ختم ہوگیا ہے اور روز بروز بربادی بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور ظاہر سی بات ہے کہ جو انسان آباد جگہ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ خرابہ میں جانا ہرگز گوارا نہیں کرتا ہے اور اسے خرابے کے نام ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔

دنیا سے وابستگی اور دلچسپی کے بارے میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض افراد اس کے ساز و سامان، دولت و آرام سے استفادہ کرنے کے لئے اس سے دل لگاتے ہیں اور اس کی آغوش میں آرام کی نیند سونا چاہتے ہیں اور بعض افراد کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں اور یہاں رہنے کا موقع مل جائے اور کچھ سامان اور فراہم ہو جائے تاکہ [illegible] بھی راہ خیر میں صرف کیا جا سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ وابستگی پہلی قسم میں شامل ہے تو یقیناً قابل مذمت ہے کہ یہ دنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے اور اس کا آخری انجام فنا اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن اگر اس کے پیچھے عمل خیر کا جذبہ کار فرما ہے اور انسان اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر آخرت کی تیاری کرنا چاہتا ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ انداز قابل تعریف ہے کہ انسان غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے یا آخرت کی زندگی کی تیاری کرنا چاہتا ہے اور یہ مقصد یقیناً [illegible] اولیاء [illegible] نے طول حیات کی دعا اسی مفہوم میں استعمال کی ہے اور یہ امر یقینی امر ہے۔

دلائل حیات بعد الموت

حیات بعد الموت کا تصور اگرچہ ایک فطری امر ہے اور اس کا انکار کوئی باشعور انسان نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی فطری مسائل اگر فلسفہ کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان میں ہر طرح کے شبہات پیدا کر دئے جاتے ہیں۔

اسی خطرہ کے پیش نظر ذیل میں چند دلائل کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

فطرت

کائنات کا نظام ایک نہایت درجہ حکیمانہ اور عادلانہ نظام ہے کہ اس کا ایک ذرہ بھی اپنی مقررہ جگہ سے ہٹ جائے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ آفتاب زمین سے ذرہ برابر قریب ہو جائے تو زمین جھلس کر خاکستر ہو جائے اور ذرہ برابر دور ہو جائے تو زمین انجماد کی کیفیت سے دوچار ہو جائے۔ یہی حال دیگر کواکب و سیارات کا بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب عدل و حکمت کے بغیر کائنات کا سادہ نظام نہیں چل سکتا ہے تو عالم تصور و ارادہ میں اصلاح کا کام عدل و اصلاح کے بغیر کیونکر چل سکتا ہے۔

عدل و انصاف کے قیام کے لئے [illegible] عدالت بعد موت ضروری ہے اور فطری طور پر انسان کے اعمال کے لئے [illegible] جس کا [illegible] لیکن اس کے بعد بھی ایک عدالت کی ضرورت ہے جس کے بغیر نظام عدل و حکمت مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

دنیا میں جس طرح [illegible] میں انسان کے احساس کا محاسبہ ہوتا رہتا ہے۔ ان میں ایک کا نام وجدان ہے۔ جو ہر برائی [illegible] اور انسان [illegible] لیکن [illegible] کبھی کبھی [illegible] کی راہ میں آ جاتی ہے اور [illegible] مفلوج ہو جاتی ہے۔ [illegible] کے اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے [illegible] سے [illegible] کرنے میں [illegible] کے امکانات میں [illegible]

آجاتی ہے کہ جنت اُدھار ہے اور ملک نقد — ہم نقد کو اُدھار پر مقدم رکھنا چاہیے۔

— دوسرا مفکر فطری آثار کا ہے کہ ہر عمل کے کچھ فطری نتائج ہوتے ہیں جو انسان کو عمل کی، اچھائی یا برائی کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ کار خیر پر سکون نفس اور برے کام پر موت در دو قسم کے اعمال کی جنتیت کے اظہار کے لئے بہت کافی ہے — لیکن اس کی مشکل یہ ہے کہ یہ آثار عام طور سے بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسان بروقت عبرت حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

— تیسرا مفکر مکافات عمل کا ہے کہ انسان نے جو کچھ کیا ہے اس کے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن یہ صرف عام طور سے اجتماعی اعمال میں ہوتی ہے ورنہ انفرادی اعمال اس کی زد سے باہر رہتے ہیں اور اس طرح اصلاح کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔

— چوتھا مفکر دنیاوی عدالتوں کا ہے — لیکن دنیا کی صورت حال بیان کرنے سے بھی مستغنی ہے۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی عدالت میں حاکم کی جہالت، غفلت، رسالوقات نا انصافی صبح و شام مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ جس کے بعد یہ تصور کرنا کہ ان عدالتوں کے ذریعہ اصلاح عام کا عمل ممکن ہو سکتا ہے، ایک بچکانہ تصور ہے اور بس۔

ایسے حالات میں ایک ایسی عدالت کا تصور بہرحال ضروری ہے جہاں انسان کو سارے اعمال کے نتائج برداشت کرنے پڑیں اور جہاں کسی طرح کی غفلت یا اہمال کا امکان نہ ہو۔ ایسی عدالت زندگی کے خاتمہ کے بعد ہی قائم ہو سکتی ہے تاکہ پوری زندگی کا حساب کیا جا سکے۔ زندگی کے بعد عدالت کا قیام حیات بعد الموت کا متقاضی ہے لہٰذا حیات بعد الموت کا تصور فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور عدالت کا ایک تتمہ ہے جس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دلیل عقل

عقل، سلیم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی ہے کہ اس کائنات کی ترتیب و تنظیم اس کی مقصدیت کی بہترین دلیل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کائنات کے تمام ذرات اور اجزا کو با مقصد بنایا جائے اور اصل کائنات کو بے مقصد کہہ دیا جائے۔ انسان کے جسم کے ایک ایک عضو کے

کی تخلیق کی جائے اور اسے بے مقصد تصور نہ کیا جائے اور پورے وجود انسانی کو بے مقصد قرار دے دیا جائے — اور جب کائنات کا بے مقصد ہونا ممکن نہیں ہے تو اس کے ہدف اور مقصد کی تعیین بہرحال ضروری ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انسان کی تخلیق کا ہدف اور مقصد موت ہے کہ ایک نسل مر کر ختم ہو جائے اور دوسری نسل اس کی جگہ پر آباد ہو جائے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح دوسری نسل میں کیا امتیاز پایا جاتا ہے کہ اسے مقصد قرار دے دیا جائے اور پہلی نسل کو صرف اس کی تمہید بنا دیا جائے۔

پھر دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ فنا کے لئے تخلیق کرنا خود ہی کون سا عاقلانہ عمل ہے جس عمل و منطق کی عمارت کو تعمیر کیا جائے کائنات کا سارا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ پوری کائنات کمال کے راستہ پر چل رہی ہے۔

ساخت کا سفر نطفہ سے شروع ہو کر علق آخر تک پہونچ جاتا ہے — دانہ زمین میں ڈال دینے سے درخت تک کی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ پانی خورد بدگی سے آگے بڑھ کر ستیر کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ نباتات ضرورت سے بڑھ کر گرم روحی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی تکاملی شکل کیا ہے؟ — اور کیا فنا کو بھی تکامل کا نام دیا جا سکتا ہے اور کیا فنا کر دینے کے لئے خلق کرنا بھی کوئی عاقلانہ عمل کہا جا سکتا ہے؟

دلیل حکمت

فطرت اور عقل کے علاوہ یہ امر بھی مسلم شدہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود میں کسی خالق و مالک کی محتاج ہے جس نے اسے منزل عدم سے نکال کر عالم وجود تک پہونچایا ہے اور کائنات کی حکمت آمیز تخلیق اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا خالق و مالک ایک حکیم ہے اور حکیم علی الاطلاق ایک ایک ذرہ کے مقام کی تعیین بھی اپنی حکمت کا ملہ سے کی ہے اور ایسے حالات میں یہ سوچنا کہ حکیم اپنے عمل کا ہدف اور مقصد فنا کو قرار دے دیگا اور اس ساری حکمت و صنعت کا حاصل عدم ہوگا۔

کھلونا بنانے والا بھی اگر کھلونے کو بنا کر توڑ دے تو صاحبِ عقل و حکمت نہیں کہا جاتا ہے
پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی کائنات کی تخلیق کرنے والا، اتنے حسین نظامِ شمسی کی تخلیق کرنے والا — جہاں سیارات — ثوابت — ستارے — کہکشاں — اور پھر یہ عجیب مخلوق انسان پایا جاتا ہے جس کے وجود میں سارا عالمِ کبیر سمایا ہوا ہے، اور جس کے اندر پہاڑوں کی استقامت بھی ہے، اور دریاؤں کی روانی بھی — آفتاب و ماہتاب کی چمک بھی ہے اور ستاروں کی تابانی بھی — فضا کا تموج بھی ہے اور ہواؤں کی طغیانی بھی — زمہریر کی ٹھنڈک بھی ہے اور اثیر کی حرارت بھی — خاک کی کثافت بھی ہے، اور آگ کی لطافت بھی — پانی کی برودت بھی ہے اور ہوا کی رطوبت بھی سارا عالمِ کبیر اسی جرمِ صغیر میں سمایا ہوا ہے اور پھر اس نے بھی زندگی کے کتنے مراحل طے کئے ہیں۔ بچپنے کی بیکسی بھی برداشت کی ہے اور جوانی کی سرکشی بھی — بڑھاپے کی بیچارگی بھی دیکھی ہے، اور صحت و مرض کی تبدیلی بھی — اجتماعی اعتبار سے بھی کبھی سماج کا دُکھ جھیلا ہے اور کبھی اقتدار کا مزہ — کبھی سیاست کی مار کھائی ہے، اور کبھی مصلحت کی مجبوری برداشت کی ہے اور آخر میں معلوم ہوا کہ ان سارے ہنگاموں کا حاصل ایک حرفِ غلط ہے اور بس! تعالی اللہ عما یقول الظالمون علواً کبیراً۔
ظاہر ہے کہ خدائے حکیم سے اس قسم کے اعمال کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی صاحبِ عقل اپنی حسین مخلوق کو ایک کھلونے کی طرح بنا کر توڑ سکتا ہے
قرآن مجید میں نہایت لطیف انداز میں اعلان ہوا تھا: "اے انسان کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور تم پلٹ کر ہماری بارگاہ میں آنے والے نہیں ہو"

فائدۂ عقیدۂ قیامت

قیامت کے عقلی، اخلاقی، فطری لزوم کو ثابت کرنے کے بعد یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوتا ہے تو اسے کبھی یہ احساس کرنا چاہئے کہ سالہا سال سے سیکڑوں مفروضات پر زندگی گذر رہی ہے جن کا کوئی حاصل نہیں ہے اور قیامت تو ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ اصلاحِ عام ہے جو ہر انسان کا دلی مدعا اور حقیقی مقصود و مطلوبِ زندگانی ہے۔

یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ اصلاح کی ضرورت عوام کو ہوتی ہے اور یہ کام خواص کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے الگ سے کسی روزِ قیامت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے بے شمار تجربات نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ عوام کے مفاسدات خواص ہی کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں اور انہیں فساد کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ وہ فساد پر مصلحت کا غلاف چڑھانا بھی جانتے ہیں، اور فساد کی تفسیر کرنا بھی جانتے ہیں۔
عوام اس ہنر سے بے خبر ہوتے ہیں لہذا ان کا فساد جزئی، مختصر، محدود اور وقتی ہوتا ہے جس کا تدارک بہت آسان ہوتا ہے لیکن خواص کا فساد عقیدہ و نظر پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ جنگ کا محرک ہوتا ہے۔ ستاروں کی جنگ بھی لڑتے ہیں۔ فضاؤں کو مسموم بھی بناتے ہیں۔ حقوقِ انسانی کے نام پر ڈاکہ بھی ڈالتے ہیں — اور امن و امان کی خاطر بھی جنگ ہی چھیڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں طبقۂ خواص سے اصلاح کی توقع کرنا ایک وہم و خیال و جنون کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی سلطنت بھی اور سیاست بھی ... کا شکار ہوتا ہے اور وہ بھی اپنا حقیقی کردار نہیں ادا کر پاتا ہے۔ دنیا کی عدالتوں کا سہارا لیا جائے تو ان پر بھی انہیں خواص کا قبضہ ہوتا ہے جو علم و ہنر کے زور سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں — اور پھر انہیں رشوت کے سیلاب میں بہایا بھی جاسکتا ہے۔ ان پر دباؤ بھی ڈالا جاسکتا ہے اور انہیں مصالح کی راہ میں بھی لے جایا جاسکتا ہے۔
ایسے حالات میں عقیدۂ قیامت کے علاوہ اصلاحِ عام کا کوئی راستہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر قیامت کا ذکر کیا ہے اور اسے تقریباً ہر سورہ میں کسی نہ کسی انداز سے بیان کیا ہے — بلکہ بعض بڑے سورہ میں اس کا ذکر بار بار کیا ہے — جو اس امر کی تاکید ہے کہ اس عظیم حقیقت سے بے خبر ہو جانے اور مرحلۂ عمل میں ہر اعتبار سے بے فکر ہو جانے کی ... بات ہے کہ ساری دنیا کے عقلاء فکرِ مستقبل میں لگے ہوئے ہیں اور سب کی نظر اسی دنیا پر ہے جس کا آخری انجام فنا کو قرار دیتے ہیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دنیا کا آخری ... بھی فنا ہے، اور ساری دنیا کے اہلِ عقل و ہوش اسی فنا کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو ان کی فکر کا کل مقصد یہی ہے کہ یہ کائنات کس طرح فنا ہوسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اصلاح سے مراد فنا نہیں ہے تو ہر انسان کا فرض ہے کہ اصلاح کے بارے میں نفس سے بحث کر کے غور کرے اور اصلاح کا نتیجہ دنیا کے علاوہ کچھ اور قرار دے تاکہ آخرت کا میدان نتیجہ کے میدان سے الگ رہے اور ہر شخص کو یہ احساس پیدا ہو کہ جو کچھ بھی اس دنیا میں کرے گا اس کا نتیجہ ایک دن برداشت کرنا پڑے گا۔

انسان نمونۂ قیامت

اسلام نے جس قیامت کا نقشہ پیش کیا ہے، مالک کائنات نے اس کا ایک نمونہ خود انسان کے وجود کے اندر بھی رکھ دیا ہے تاکہ کوئی شخص اس امر سے غافل نہ ہو سکے اور اپنے وجود پر غور کرنے والا اور اپنے نفس کی معرفت رکھنے والا بھی اس کے لزوم سے انکار نہ کر سکے۔

قیامت کے مناظر و مشاہد کے دو اہم ارکان ہیں:

۱۔ انسان کے جملہ اعمال کے بارے میں صحیح فیصلہ کر دیا جائے۔

۲۔ جس شخص کے جیسے اعمال ہیں اسی کے مطابق اسے جزا یا سزا دے دی جائے۔

مالک کائنات نے انسان کے ضمیر میں یہ دونوں باتیں رکھ دی ہیں۔ اس کے اندر ایک قوت فیصلہ بھی رکھ دی ہے جو اعمال کے بارے میں خیر و شر کا فیصلہ کرتی ہے اور اس کا فیصلہ بھی ایسا ہوتا ہے جس میں مقدمہ کی کوئی تاریخ نہیں معین کی جاتی ہے اور نہ کسی وکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک عدالت ہے جو بیک وقت شاہد بھی ہے اور حاکم بھی ہے۔ اور حاکم بھی ایسا جس کی عدالت میں نہ کسی طرح کی سفارش چل سکتی ہے اور نہ کوئی رشوت — دو ٹوک فیصلہ ہوتا ہے اور فوراً سزا بھی دے دی جاتی ہے کہ انسان نیک کام کرتا ہے تو اندر سے ایک فرحت محسوس کرتا ہے اور برا کام انجام دیتا ہے تو تا دیر ایک ذہنی کشمکش اور قلبی اضطراب کا شکار رہتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اس نمونہ کے بعد بھی اصلی روز فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اگر ماڈل میں مشابہات معین کیے جاتے ہیں تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا ہے، تفصیلات عمارت کے بعد ہی منظر عام پر آتے ہیں۔

قیامت کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے کہ اس عدالت عظمیٰ میں وہ حقائق

آ جائیں گے جو ضمیر کی عدالت میں سامنے نہیں آ سکتے ہیں، ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کرنے کی طاقت ضرور ہے لیکن کبھی کبھی اس کے فیصلوں پر اوہام و خیالات کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر معاشرہ نے انسان کو شراب، زنا اور سرقہ کا عادی بنا دیا ہے تو ضمیر ملامت کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے یا جہالت کی بنا پر اگر انسان ان کی برائی سے آشنا ہی نہیں ہے تو ضمیر احساس بھی نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ ضمیر کا مقصد صرف فطری حسن و قبح تک محدود ہے۔ وہ [illegible] میدان میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے — پھر اس کی سزا بھی اس قدر خفیف ہوتی ہے کہ انسان اسے عموماً فراموش کر دیتا ہے اور پھر دوبارہ جرم کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

عام طور سے [illegible] جب پہلے پہل رقص کا سلسلہ شروع ہوا تو بعض اخباری نامہ نگار نے [illegible] سے سوال کیا کہ تم [illegible] مجمع میں [illegible] کس طرح [illegible] سامری سے [illegible] کہ مجھے پہلے تو [illegible] لیکن اس کے بعد [illegible] مجھے کون دیکھ رہا ہے [illegible] یہی حال [illegible] زندگی کا [illegible] ضمیر پہلے [illegible] ملامت کرتا ہے لیکن [illegible] اور ملامت کو حالات اور معاشیات کے مقابلہ میں نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایسے حالات میں ایک ایسی عدالت کی بہرحال ضرورت ہے جہاں ہر طرح کے فطری اور [illegible] کا فیصلہ ہو اور فیصلہ پر کوئی غلط تصور یا جہل مطلق غالب نہ آ سکے اور سزا بھی ایسی ہو کہ انسان دوبارہ جرم کی ہمت نہ کر سکے اور یہ عدالت قیامت کے علاوہ کوئی دوسری عدالت نہیں ہے۔

اعادۂ معدوم

بعض فلاسفہ نے قیامت کا انکار کرنے کے لئے ایک راستہ یہ بھی نکالا ہے کہ قیامت معدوم کو واپس لانے کا نام ہے اور اعادۂ معدوم محالات میں سے ہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حالانکہ یہ درحقیقت قیامت کے مفہوم سے ناآشنائی کی علامت ہے، در اصل!

قرآن مجید نے قیامت کے بارے میں مختلف تعبیرات پیش کی ہیں

"ہم نے تمہیں اسی خاک سے پیدا کیا ہے اور اسی میں واپس بھیجیں گے

اور پھر اسی سے باہر نکالیں گے"

یہاں قیامت خاک سے اخراج کا نام ہے۔ معدوم کے اعادہ کا نام نہیں ہے۔

"جس طرح پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ وہ آئیں گے"

ظاہر ہے کہ انسان پہلی مرتبہ بھی عالم عدم سے نہیں آیا تھا بلکہ اسی کائنات کا ایک حصہ تھا جسے کائنات کے مختلف اجزاء سے بنایا گیا تھا۔ نطفہ اس غذا سے تیار ہوا تھا جو انسان نے استعمال کی تھی اور غذا پہلے سے موجود تھی بلکہ اس کے اصول اور مواد بھی موجود تھے۔ پہلی مرتبہ کی تخلیق کا کوئی تعلق عدم سے نہ تھا اور نہ قیامت کا کوئی تعلق عدم سے ہوگا۔

عدم سے کوئی شے عالم وجود میں آئی ہے تو وہ اصل کائنات ہے۔ کائنات کے اجزاء اس کی مخلوقات نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے سلسلہ میں آسمان و زمین کا تذکرہ بھی عدم وغیرہ کی شکل میں نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس دن زمینوں کو تبدیل کر دیا جائے گا اور آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ تبدیلی کا کوئی تعلق عدم سے نہیں ہے اور نہ لپیٹنے کا۔ عدم ایک ایسی شے ہے جس کا تصور بھی انسان کے امکان میں نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کہنا، فیصلہ کرنا تو بعد کا مرحلہ ہے۔ عدم کا تصور ہمارے ذہنوں میں صرف وجود کی برکت سے ہوتا ہے ورنہ درحقیقت یہ ایک قسم کا وجود ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ذہن میں اتنی وسعت ہے کہ عدم کے تصور کو بھی اندر جگہ دے سکے۔ جس طرح کہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر ایک حقیقی بیان دیا ہے کہ یہ تم نے رکھے ہوئے نام ہیں کہ تم نے جس کو چاہا ہے اس کا نام خدا رکھ دیا ہے ورنہ خدا کے تصور سے بھی عاجز ہو اور دوسرے خداؤں کا تصور بھی تمہارے امکان میں نہیں۔

بہرحال قیامت کا کوئی تعلق اعادۂ معدوم سے نہیں ہے اور نہ موت کوئی عدم ہے جس کے بعد دوبارہ اسے واپس لانے کا سوال پیدا ہو۔ موت اجزاء حیات کا منتشر ہو جانا ہے اور قیامت اس کی دوبارہ جمع آوری۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

زندگی نام ہے اس جمع و نظام کا جو انسان کے مادہ میں برقرار رہتا ہے۔ انسان جس وقت تک رہتا ہے پہلے معدہ میں مختلف قسم کی چیزیں جمع ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں مختلف شکلوں میں منتشر کیا جاتا ہے اور پھر وہ ایک نطفہ کی شکل میں جمع ہوتی ہیں۔ اور ایک نیا انسان عالم وجود میں آجاتا ہے۔

عالم ادبیات کے علاوہ غیر مادی امور کا بھی یہی حال ہے کہ انسان کی آواز پہلے فضا میں بکھر جاتی ہے اور اس کی صورت ہوائی موجوں کے درمیان منتشر ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد آلات کی کارکردگی شروع ہوتی ہے اور یہ آلات انہیں بکھرے ہوئے الفاظ اور منتشر اجزاء وجود کو جمع کرتے ہیں اور اسے تقریر کی شکل دے دی جاتی ہے یا ٹیلیویژن میں صورت نظر آنے لگتی ہے۔ تو جب پروردگار نے آلات کو اتنی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ خود ان منتشر اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا ہے۔ اور اگر کر سکتا ہے تو قیامت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ تم کو اپنی پہلی خلقت کا علم تو ہے تو پھر اسے کیوں نہیں مانتے ہو؟

عالم برزخ

انسان کی موت سے قیامت کے قیام تک کے زمانہ کو برزخ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب جسم بظاہر بے جان ہو جاتا ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے اور اپنے اعمال کی جزا و سزا دیکھتی ہے۔

اس عالم کا ثبوت خود انسان کا وجود ہے کہ یہ مالک نے دو حصوں سے مرکب کیا ہے۔ ایک وہ ہے جسے جسم کہا جاتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔ دونوں کا تعلق رہتا ہے تو انسان زندہ کہا جاتا ہے اور یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے تو موت طاری ہو جاتی ہے اور دونوں اپنے اپنے عالم سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ جسم عالم مادیات سے مل کر مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے اور روح اپنے عالم سے ملحق ہو کر مادیات کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔

اس عالم کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسان کے اعمال بھی دو طرح کے ہیں، بعض کا تعلق روح

اور جسم دونوں سے ہے، اور بعض کا تعلق صرف روح سے ہے۔ جسم و روح دونوں سے صادر ہونے والے اعمال کا محاسبہ روز قیامت کیا جائے گا اور اس کی سزا یا جزا اسی وقت سامنے آئے گی لیکن خالص روح کے افکار یعنی عقائد کے محاسبہ کی کوئی مخصوص منزل نہیں ہے لہذا اس کے لئے عالم برزخ رکھا گیا ہے جہاں قبر ہی میں عقائد کا حساب ہو جاتا ہے اور اسی اعتبار سے قبر جنت کا ایک باغ یا جہنم کا ایک گڑھا بن جاتی ہے۔

بعض روایات میں قبر میں بعض اعمال کی سزا کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے لیکن اس کا حصہ روح ہی سے تعلق رکھتا ہے، یہ اور بات ہے کہ انسان کے فکری اعمال بھی جسم کی مدد کے بغیر انجام نہیں پاتے ہیں۔ لہذا روح پر وارد ہونے والے عذاب کا احساس بھی جسم تک منتقل ہونا بہرحال ضروری ہے۔

مثال کے طور پر انسان جس وقت خواب دیکھتا ہے۔ اس وقت یہ عمل صرف روح انجام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات اس کا اثر انسان کے جسم پر بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی حال عالم برزخ کا ہے کہ اصل سزا روح کے لئے ہے لیکن جسم بھی فشار قبر سے محفوظ نہیں رہتا ہے اور سارے جسم کو بھی روح کی تکلیف کے احساس میں کسی حد تک شریک کر لیا جاتا ہے۔

برزخ کے زمانہ کی اجمالی تعیین تو یہی ہے کہ اس کا سلسلہ قبر سے شروع ہو جاتا ہے اور پھر میدان حشر پر تمام ہوتا ہے لیکن احساس کے اعتبار سے یہ ایک سال بھی ہو سکتا ہے اور ایک کروڑ سال بھی۔ جس طرح کہ عربی کی مثل ہے کہ "[illegible] یفرق سنۃ وسنۃ [illegible]" فراق کی ایک ساعت بھی ایک سال کے برابر ہوتی ہے اور وصال کا ایک سال بھی ایک لمحے کے برابر ہوتا ہے۔

انسان کی یہ زندگی راحت کی ہے تو لمحوں میں گزر جاتی ہے اور تکلیف و مصیبت کی ہے تو اس کا ایک لمحہ بھی سالوں کے برابر ہو جاتا ہے۔

● روایات میں اس منزل پر دو طرح کے مددگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ نماز و روزہ مجسم ہو کر انسان کی تسکین قلب کے لئے آجاتے ہیں، اور ان میں کوئی کمی ہوتی ہے تو صبر اسے پورا کر دیتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ [illegible] شریف لانے میں [illegible] فرمایا کہ میں نے [illegible] ادب ... تیرا ہے: [illegible] کرتا ہوں [illegible] کی قبر میں حاضری [illegible]

اس منزل پر عذاب کی سزا ایک تلخی دنیا ہے جس سے [illegible] دوسرے کی سماعت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] کے علاوہ ایک عام کے پاؤں میں بچھو بیٹھے ہوئے دیکھے گئے کہ ان کی عادت ہر ایک پر طنز کرنے کی تھی۔ سعد بن معاذ کے فشار قبر کی خبر دی گئی کہ وہ اپنی زوجہ سے سختی کا برتاؤ کرتے تھے اور جس طرح ان کے گھر والوں کے سامنے ان کی اسی طرح قبر میں سعد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

سوال و جواب

جزا و سزا کی ذیل میں انسان کو دو طرح کے محاسبے سے گذرنا پڑے گا۔ ایک محاسبہ قبر میں ہوگا جس کا تعلق روحانی اعمال یعنی عقائد سے ہوگا کہ تیرا خدا کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے تیرا نبی اور تیری کتاب کیا ہے۔ تیرا نبی اور تیرا امام کون ہے۔ جس پر عالم برزخ کی راحت و تکلیف کا فیصلہ ہوگا اور انسان جنت کے باغ یا جہنم کے گڑھے میں رہے گا۔

اور دوسرا محاسبہ اعمال حشر میں ہوگا۔ جہاں سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا اور سب سے آخری محاسبہ تمام اعمال یعنی محبت اہلبیتؑ کا ہوگا۔ جس کے بارے میں قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے کہ اعمال کے محاسبہ کے بعد قیامت کے دن سب سے روک کر پوچھا جائے گا کہ ابھی ایک سوال باقی ہے۔ اور یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ سوال نعمت کے بارے میں ہے جس کی تفسیر میں امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے ورنہ رب کریم کی شان کے خلاف ہے کہ غریب کو کھلا کر اس سے حساب لیا جائے۔ وہ اگر کھانے کا حساب بھی لیتا ہے تو یا تو دوسرے کے حقوق کے اعتبار سے یا اپنے ہی وسائل کسب معاش اسراف و تبذیر وغیرہ کے اعتبار سے!

محبت اہلبیتؑ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس پر نعمتوں کا تمام ہو گیا ہے اور دین الہی [illegible] ہو گیا ہے۔

• — قیامت کے دن عمومی سوالات کا انداز یہ ہوگا: عمر کہاں خرچ کی ہے؟ شباب کو کہاں برباد کیا ہے؟ مال کہاں سے لیا ہے اور کہاں صرف کیا ہے؟ اہلبیتؑ پیغمبرؐ سے محبت کی ہے یا نہیں ہے؟ — اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سوالات میں سارے واجبات و محرمات کا محاسبہ شامل ہو جاتا ہے اور انسان کے گناہ تین حصوں پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔

• ایک گناہ غیر معفو کہا جاتا ہے جس کی منزل شرک ہے۔ دوسرا وہ ہے جس کی توبہ کے قبول ہونے کی امید ہے اور تیسرا وہ غیر معفو ہے جس کا تعلق حق العباد سے ہے کہ اسے پروردگار بھی اس وقت تک نہیں بخش سکتا ہے جب تک صاحب معاملہ معاف نہ کردے ورنہ اس طرح یہ عمل خود بھی کمزور کے حق میں ایک طرح کا ظلم ہو جائے گا۔

• — حق العباد کے سلسلہ میں ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا محاسبہ کس طرح ہوگا جبکہ ظلم کرنے والا نیکیوں سے عاری ہے تو مظلوم کو کہاں سے اس کا حق دلوایا جائے گا۔

اس سلسلہ میں امام سجادؑ کا ارشاد ہے کہ حق العباد کا فیصلہ یہ ہے کہ مظلوم کے گناہ اس کی گردن پر ڈال دیے جائیں گے اور وہ ظلم کے بدلے اس کے گناہوں کی سزا برداشت کرے گا اور یہ مسلمان کے درمیان ہے تو اس کی نیکیاں مظلوم کے حوالے کر دی جائیں گی اور اگر نیکیوں سے خالی ہوگا تو اسے مظلوم کے ذاتی گناہوں کی سزا برداشت کرنا پڑے گی۔

پروردگار حق العباد کے مسئلہ میں کوئی مداخلت نہیں کرتا ہے اور اس کا کام صرف فریقین کے درمیان انصاف کر دینا ہے۔ لیکن کسی بندۂ مومن کے پاس بہترین نیک اعمال ہیں اور اس کا طرف مقابل صرف کسی حق العباد کی بنا پر اسے جہنم میں رکھنا چاہتا ہے تو پروردگار اس بندہ پر یہ کرم کر سکتا ہے کہ اس کے مظلوم کے سامنے جنت کی نعمتیں رکھ کر مسرور کر دے کہ اگر تم اس بندہ مومن کو معاف کر دو گے تو تمہیں ہم معاف کر دیں گے اور تمہیں جنت کی شکل میں دیدیں گے اور یہ وہ عالم ہے جس سے کوئی صاحب عقل و ہوش انکار نہیں کر سکتا ہے۔

• — اس سلسلہ کے نامۂ اعمال کے بارے میں بھی ایک سوال یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کا درج ہوا … اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جسم پر اعمال کے نقوش بنائے جائیں گے اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ اعمال خود مجسم ہو کر سامنے آجائیں اور انسان کے سامنے پیش کر دئے جا

بہرحال صراط انتہائی سخت ہے اور رب کریم ہی ہر بندۂ مومن کے حال پر رحم فرمائے گا۔

صراط و میزان

مشہور و معروف بات ہے کہ میدان حشر میں پہلے انسان کے اعمال تولے جائیں گے اس کے بعد اسے اس راستے سے گزارا جائے گا جسے صراط کہا جاتا ہے۔ صراط ایک پل ہے جسے جہنم کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے اور ہر انسان کو اس صراط سے گزرنا ہوگا۔ ایمان و کردار میں استحکام ہے تو انسان برق کے مانند گزر جائے گا اور ایمان و کردار میں نقص ہے تو اسی مقام پر جہنم میں گر جائے گا اور آگے جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اعمال کے تولنے کے لئے ایک ترازو درکار ہے جسے عرف عام میں میزان کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ہر وزن کے لئے میزان کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ بھاری سامان تولنا ہوتا ہے تو اس کی میزان الگ ہوتی ہے اور سونا وزن کرنا ہوتا ہے تو اس کی میزان الگ ہوتی ہے۔ گھروں میں پائپ سے آنے والے پانی … اور بجلی کے تاروں پر دوڑنے والی بجلی اور پائپ کے اندر سے گزرنے والی گیس کا میٹر الگ ہوتا ہے۔

میزان وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ خود اس میں کوئی نقص نہ ہو ورنہ میزان میں نقص پیدا ہو جائے تو سارا حساب غارت ہو کر رہ جائے گا۔

اعمال کو تولنے کے لئے لکڑی یا دھات کی ترازو کا کوئی کام نہیں ہے اور نہ وہ کوئی مادی چیز ہے کہ اسے عام ترازو پر تولا جائے۔ اعمال کے وزن کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ ایک صاحب کردار کو طے کر لیا جائے جس کا کردار معصوم اور میزان بننے کے قابل ہو اور پھر اس کے کام اور دیگر اعمال کو اسی معیار پر پرکھ لیا جائے اور ان کی اچھائی یا برائی کا تعین کر لیا جائے۔ روایات میں امیر المومنینؑ کو "میزان الاعمال" اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ پروردگار نے ان کو معیار کا درجہ دے دیا ہے اور ان کی ایک ضربت کو ثقلین کی عبادت سے بھاری … کے بعد تمام افراد کے اعمال کا حساب اسی معیار پر کیا جائے گا اور اسی

مطابقت پر موقوف ہے تسبیح، علاوہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

● — حساب کے اعتبار سے انسان کی چار قسمیں ہوں گی:

بعض لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ مخلص ایمان اور کردار والے افراد ہوں گے۔

بعض لوگ بلا حساب جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے۔ یہ بدکردار افراد کا فر افراد ہوں گے۔

بعض لوگ جنت کے حقدار ہوں گے لیکن حساب کے بعد — یہ عقیدہ کے پختہ اور اعمال کے کمزور افراد ہوں گے۔

بعض جہنم میں جائیں گے لیکن اعمال کے حساب کے بعد — ان کے بدترین اعمال زیادہ ہوں گے اور انہیں شفاعت کے ذریعہ جہنم سے بچایا جا سکتا ہے۔

● — حسنات کا ایک سلسلہ یہ بھی ہے کہ انسان کے عقیدہ میں کفر و شرک پیدا ہو گیا ہے تو سارے اعمال خود بخود ختم ہو جائیں گے اور پھر حساب کی ضرورت نہ ہوگی اور اسی طرح بعض نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں جن کے بعد انسان انعام کا مستحق ہو جاتا ہے — مثال کے طور پر سرکار دو عالمؐ سے پوچھا گیا کہ جس شخص نے چالیس برس تک بیٹیوں کو زندہ دفن کیا ہے اس کا کفارہ کیا ہوگا؟ — فرمایا: اسلام کے بعد ماں باپ کے ساتھ بہترین برتاؤ کرے تو پروردگار پرانے گناہ کو ختم کر سکتا ہے۔

● حساب کے امتحان سے گزرنے کے لیے سات منزلوں کو طے کرنا ہوگا اور ہر منزل پر مختلف موقف ہوں گے جن کا فاصلہ ہزاروں برس تک ہو سکتا ہے۔

پہلی منزل پر قرابت داروں کے حقوق، امانت اور محبت اہلبیتؑ کا سوال ہوگا۔

دوسری منزل پر نماز کا حساب کیا جائے گا

تیسری منزل پر خمس و زکوٰۃ کا حساب دینا ہوگا اور یہ ادا نہ کرنے والا وہ ہوگا جس سے سادات کو بھی اپنے حق خمس کا مطالبہ کرنا ہے (امام صادقؑ)

چوتھی منزل پر روزہ کا حساب ہوگا۔

پانچویں منزل پر حج کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔

چھٹی منزل پر طہارت یعنی وضو، غسل اور تیمم کا حساب کیا جائے گا۔

اور ساتویں منزل پر مظالم کا حساب کیا جائے گا جن میں بچوں کو ناحق مارنا پیٹنا، گالی دینا اور امانتوں کو بروقت واپس نہ کرنا جیسے مظالم شامل ہیں اور ان کا حساب دیئے بغیر انسان آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ امیر المومنینؑ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ حقیقت صراط مستقیم یہی ہے؟ بغیر حساب دیے کوئی جنت میں قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔

جنّت و جہنم

جنت و جہنم ان مقامات کا نام ہے جہاں نیک و بد انسانوں کو بطور انعام یا بطور عذاب جگہ دی جائے گی اور انسان کے لیے جنت وہ مقام ہے جس میں قدرت کی حیثیت پائی جائے گی کہ جنت کے آرام میں کسی طرح کی تکلیف شامل نہ ہوگی اور جہنم کی تکلیف میں کسی طرح کے آرام کا تصور نہ ہوگا۔

جنت و جہنم کے بارے میں چند طرح کی بحثیں پائی جاتی ہیں

۱۔ وجود جنت و نار — بعض علماء کا خیال ہے کہ فی الحال جنت و جہنم کا کوئی وجود نہیں ہے اور ان کا کوئی مصرف ہے۔ پروردگار کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کرتا ہے جب سزا و جزا کا وقت آئے گا تو بطور "کن فیکون" دونوں کو پیدا کر دیا جائے گا اور ہر جگہ کو اس کے مستحق کے حوالے کر دیا جائے گا۔

لیکن یہ تصور آیات قرآنیہ سے صریحی اختلاف رکھتا ہے کہ وہاں جنت و جہنم کے مہیا ہونے کا ذکر ہے اور معراج کے ذیل میں سرکار دو عالمؐ کے مشاہدہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

«اعدت للمتقین»

۲۔ محل — دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر جنت و جہنم کا کوئی وجود ہے تو ان کا محل کہاں ہے؟ ایک جنت کی وسعت کو آسمان و زمین کے برابر قرار دیا گیا ہے — لیکن اس کا جواب بھی یہ ہے کہ دوسرے عالم کے مسائل کا اس عالم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے — اور کوئی شخص اس کے زمان و مکان سے باخبر ہے۔

۳۔ خلود — تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جنت و جہنم میں جس خلود اور ہمیشگی کا ذکر ہے اس سے مراد ... جب کہ انسان کے اعمال میں ہمیشگی نہیں پائی جاتی ہے اور جزا یا سزا اعمال سے زیادہ نہیں

ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ خلود سے مراد طویل مدت ہے۔ ہمیشگی نہیں ہے اور جب کسی شے کی مدت طویل ہو جاتی ہے تو اسے ہمیشگی ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جزا و سزا اور اعمال کی مطابقت وقت کے اعتبار سے نہیں ہوتی ہے بلکہ کیفیت عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے ورنہ قتل ایک لمحہ میں واقع ہوتا ہے اور قاتل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید خانے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

تیسری قسم کا جواب یہ ہے کہ سزا و جزا عمل کا نتیجہ ہے اور نتیجہ عمل سے مختلف ہو سکتا ہے جس طرح کہ تخم ریزی تھوڑی دیر کی ہوتی ہے اور درخت مدتوں باقی رہتا ہے۔ اسی طرح عمل کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو اس کا نتیجہ ابدی اور دائمی ہو سکتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس مسئلہ کو نیت سے مربوط فرمایا ہے کہ بدکاروں کا وقت عمل محدود ہے لیکن نیت عمل غیر محدود تھی لہٰذا سزا کو دائمی ہونا چاہیئے اور اس کے دقیق ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ مسئلہ ضرور ہے کہ اسلام نے عمل پر سزا رکھی ہے نیت پر سزا نہیں رکھی ہے۔ وہ کس طرح ممکن ہے کہ صرف نیت کی بنا پر سزا کو دائمی اور ابدی بنا دیا جائے۔ لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ نیت سے مراد صرف نیت نہیں ہے بلکہ نیت سے مراد وہ خباثت نفس ہے جس کے بعد کسی نیک عمل کے ارادہ کا بھی تصور نہیں پایا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ کفر ذاتی و نفسی خباثت اس بات کی علامت ہے کہ انسان اسلام و ایمان سے عاری ہو چکا ہے اور اس میں کفر کے علاوہ کچھ نہیں پایا جاتا ہے اور کفر کی سزا بہرحال دائمی ہوگی۔

کیفیت جنت و نار

جنت کے بارے میں جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ دائمی سایہ اور کھانا۔ "اکلھا دائم وظلھا"

۲۔ نہریں۔ "فیھا انھار من ماء غیر آسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ

وانھار من خمر لذۃ للشاربین"

۳۔ قریب ترین میوے۔ "وذللت قطوفھا تذلیلا"

۴۔ شراب۔ "یسقون من رحیق مختوم ختامہ مسک"

۵۔ بہترین غذا۔ "فیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین"

۶۔ برادری۔ "ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا"

۷۔ سلامتی۔ "لھم دار السلام عند ربھم"

۸۔ سلام۔ "دعواھم فیھا سبحانک اللھم وتحیتھم فیھا سلام"

● اس کے برخلاف جہنم۔ "وقودھا الناس والحجارۃ" "نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ" "زفیر وشھیق" "علیھا ملائکۃ غلاظ شداد"

منظر قیامت

قیامت کے بارے میں چار طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں:
روحانی، جسمانی، جسم مثالی، جسمانی و روحانی حقیقی۔

● معاد روحانی کی دلیل یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں جسم ایک ظرف سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس طرح انسان کے بچہ کے لئے رحم مادر یا مرغ کے بچے کے لئے انڈا۔ بچہ جب تک پیٹ میں رہتا ہے اس پر ہر سرد و گرم سے اثر ہوتا ہے لیکن ظرف سے باہر آنے کے بعد سارے معاملات کی ذمہ داری خود پر ہے ظرف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قیامت بھی اسی طرح کا ایک معاملہ ہے لہٰذا اس جدید عالم میں جسم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

● معاد جسمانی کی دلیل یہ ہے کہ روح کوئی شے نہیں ہے۔ وہ جسم کے اندر حلول کئے ہوئے تھی۔ جب موت واقع ہوئی تو باہر نکل گئی۔ اب دوبارہ اسی جسم کے منتشر اجزا کو جمع کرنے کا کام باقی رہ گیا ہے اور اس کے علاوہ قیامت کوئی دوسری شے نہیں ہے۔

● جسم مثالی کا فلسفہ یہ ہے کہ روح نے ترقی کر کے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے کہ یہ جسم مادی اس کے قابل نہیں رہ گیا ہے لہٰذا اس نے اسے چھوڑ کر ایک مثالی جسم اختیار کر لیا ہے اور اب

دوبارہ اسی کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے اور جزا و سزا کے حالات کا سامنا کرنا ہے۔

جسمانی و روحانی (حقیقی) کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح انسان پہلی مرتبہ اس دنیا میں آیا تھا اور اس نے اعمال انجام دیئے تھے اسی طرح دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور جزا یا سزا کا سامنا کرے گا۔ اس کے علاوہ تمام باتیں فلسفیانہ موشگافیاں ہیں۔ قرآن مجید کے بیانات اور سادہ عقیدہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے قیامت کی تفہیم کے لئے زراعت کا حوالہ دیا ہے جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ دانہ زمین میں جا کر کیسے ہی تباہ و برباد ہو جائے دوبارہ ابھر آئے گا تو دانہ ہی ہوگا اور اسی طرح کا ہوگا۔ انسان یا درخت نہیں ہوگا۔

اور یہی مسئلہ منکرین کے پیش نظر بھی تھا کہ ان کی سمجھ میں اسی زندگی کی دوبارہ واپسی ممکن نہیں تھی۔ ورنہ روح کی واپسی یا جسم مثالی وغیرہ تو ایسی چیزیں نہیں تھیں کہ ان کا اس قدر سختی سے انکار کیا جاتا۔ ان کا یہی خیال تھا کہ ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے یا ہمارے خاک میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندگی کیسے واپس آسکتی ہے۔

قرآنی عقیدہ کے مطابق یہی واقعی قیامت ہے جس کی منظرکشی نفخ صور سے کی گئی ہے کہ پہلے صور پھونکا جائے گا اور سب مر جائیں گے اور پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور سب زندہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ بھی محشر کی عدالت کا ہے کہ قیامت "تفرقہ انداز" ہوگی جو کہ طبقات کی طرح انسانوں کو بھی پست و بلند میں تقسیم کر دے گی۔ بعض افراد پست ہو جائیں گے اور بعض افراد سربلند ہو جائیں گے۔

تیسرا مرحلہ وہ تجلی اسرار یعنی "کشف اسرار" کا ہوگا جہاں سب کی حقیقت سامنے ہو جائے گی اور والدین اور عزیزوں کو انسان کے عمل کی اطلاع ہو جائے گی۔ ایسے ہی موقع کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ

"خدایا مجھے مجمع عام میں رسوا نہ کرنا۔"

چوتھا مرحلہ عریانی کا ہوگا جب سب کے لباس اتر جائیں گے اور ایک عظیم رسوائی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس موقع پر لباس تقویٰ کے علاوہ کوئی پردہ پوشی کا کام نہ کر سکے گا۔ امام سجادؑ نے

موقع کو یاد کر کے رونے کی دعوت دی ہے "ابکی لخروجی من قبری عریانًا ذلیلًا"

پانچواں مرحلہ مواقف کا ہوگا جہاں انسان کو پچاس مواقف پر ٹھہرایا جائے گا اور ہر موقف ایک ہزار سال کا ہوگا جس کی مقدار دنیا کے دنوں سے طے کی جائے گی۔

چھٹا مرحلہ تطایر کتب کا ہوگا جہاں نامۂ اعمال اڑتے ہوئے نظر آئیں گے اور ان میں ایک ایک سانس کا حساب لکھا ہوگا اور راستہ سے ایک کانٹا ہٹا دیا ہے تو اس کا حساب بھی درج ہوگا۔ روایات میں ہے کہ فرشتے انسان کے جسم سے نکلنے والی خوشبو و بدبو سے اس کی نیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور اسی اعتبار سے درج بھی کر لیتے ہیں۔

ساتواں مرحلہ سارے حسابات کے بعد محبت اہلبیتؑ کے حساب کا ہوگا جس سے ہر شخص کو گذرنا ہوگا اور اسی مرحلہ پر نماز اور حقوق العباد کے بارے میں بازپرس کی جائے گی اور ایک ایک درہم کے مقابلہ میں سات سو نمازیں ضبط ہو جائیں گی۔ ان دونوں کو اس مرحلہ پر شاید اس لئے رکھا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی اور بندگان خدا کے حقوق کی ادائیگی کے بغیر محبت اہلبیتؑ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اور دعا کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اسی میں انسان خدا اور بندوں کا بھی بن سکتا ہے۔

قیامت اور اصلاح عالم

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی اصلاح کے لئے اتنے وسائل موجود ہیں جس کے بعد عقیدہ قیامت کی ضرورت نہیں ہے۔ [illegible]

عقل ... ارشاد ہوتا ہے کہ "ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو باتوں کو سنتے ہیں اور جو بہترین ہوتی ہے اس کا اتباع کر لیتے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف سے ہدایت حاصل ہے — اور یہی صاحبان عقل ہیں۔"

یعنی عقل انسانی خود انسان کو بہترین بات کے اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور

پروردگار اسی طریق کار کو اپنی ہدایت قرار دیتا ہے لہٰذا انسان اس کے بعد کسی مزید مصلح کا محتاج نہیں ہے۔

علم ۔ "اللہ ایمان اور علم والوں کے درجات کو بلند قرار دیتا ہے۔"

عقل تنہا انسان کی اصلاح کے لئے ناکافی ہو جائے تو اس کی مدد کے لئے علم موجود ہے جو انسان کو بلندی کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔

وجدان ۔ علم کے ساتھ انسان کی فطرت میں خیر سے محبت اور شر سے نفرت کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے اور یہ فطرت مسلسل برائیوں پر انسان کو تنبیہ کرتی رہتی ہے اور اسی پاکیزہ خصلت کی بنا پر قسم کھانے کے قابل ہے:

"قسم روز قیامت کی اور ملامت کرنے والے نفس کی۔"

تربیت ۔ مذکورہ بالا امور کی کارکردگی میں کوئی کمزوری رہ جائے تو تربیت اس کی کمی کو پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لئے حکم ہوا ہے کہ "ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔"

اجتماعی نگرانی ۔ انفرادی تربیت کے ساتھ اجتماعی نگرانی کا نظام بھی رکھ دیا گیا ہے تاکہ انسان کسی طرف سے بھی انحراف کا شکار نہ ہونے پائے۔

"ایمان والو! تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور اللہ پر ایمان رکھو۔"

لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اولاً تو [illegible] مصلحین انسان کی فطرت کی کمزوری کا علاج ہیں لیکن سارے جذبات کی سرکشی کو روکنے کا [illegible] نہیں ہے۔ انسان علم و عقل کے ذریعہ برائی کا احساس کر سکتا ہے لیکن اسے ترک بھی کر دے گا۔ کوئی التزام عقل کی طرف سے نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام امور کے ہوتے ہوئے بھی عالم [illegible] کے فساد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے اور سارا فساد اونچے طبقہ ہی کی طرف سے آ رہا ہے۔ [illegible] ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور بھی روکنے والا ہو جس کا احساس انسان کو برابر دامنگیر [illegible]

اس سے بہت و جرأت گناہ کو سلب کرے اور یہ کام عقیدۂ قیامت کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

جہاں مرحلۂ قبض روح ہی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک مردہ نے جناب سلیمان سے بیان کیا کہ سارے جسم کا ٹکڑے ٹکڑے کر دینا قبض روح سے زیادہ آسان ہوتا ہے اور روح کے الگ ہونے کے بعد جسم کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے اسے آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔

امام صادق کا ارشاد ہے کہ "کافر کی روح قبض کرنے کے لئے پانچ سو فرشتے ملک الموت کے ساتھ آگ کے گرز لے کر آتے ہیں اور مار مار کر کہتے ہیں کہ تم خود اپنی جان نکال کر پیش کرو کہ تم اس دن کا انکار کر رہے تھے۔"

اس کے علاوہ انسان کو ہر آن یہ احساس رہتا ہے کہ سزا دینے والا اعمال کو دیکھ رہا ہے، "جس سے کوئی شے مخفی نہیں رہ سکتی ہے۔"

اصلاح اور سزا

اگرچہ انسانی کردار کی اصلاح میں سزا کا بہت بڑا دخل ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ سزا کا آخری [illegible] ہے جہاں تمام حربے ناکام ہو جاتے ہیں اور صالح جسم کو داغنے کا تجربہ [illegible] ہوتا ہے ورنہ اسلام کا منشا یہی ہے کہ انسان شرافت سے اپنے اعمال کی اصلاح [illegible] اور سزا کا حربہ استعمال نہ کرنا پڑے کہ سزا بے عقل بچوں کے لئے ہے یا بے شعور جانوروں [illegible] ہے۔ انسانیت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ انسان حقائق پر نگاہ کر کے خیر و شر کا [illegible] اور ضمیر کی راہنمائی کی بنا پر اپنے کردار کی اصلاح کر لیتا ہے۔ [illegible] عقاب کی [illegible] ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد نے یکسر سزا کا انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا [illegible] عالم آخرت میں سزا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

[illegible] تربیت کے لئے ہوتی ہے یا انتقام کے لئے یا دوسروں کی عبرت کے لئے ۔ اور [illegible] میں سے کسی بات کی گنجائش نہیں ہے۔ وہاں نہ تربیت کا کوئی امکان باقی رہ گیا [illegible] دوسروں کی عبرت کا۔ انتقام یوں بھی شان پروردگار کے خلاف ہے۔ لہٰذا سزا

دنیاوی قانون میں ممکن ہے، مذہبی قانون میں سزا کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال درحقیقت دنیاوی سزاؤں کو دیکھ کر اور مذہبی سزاؤں کی حقیقت سے بے خبری کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ دنیا میں سزا کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ اس کی حیثیت ہوتی ہے یا عبرت یا انتقام۔ اس لئے کہ یہ سارا سزائیں جرائم سے الگ ایک حیثیت رکھتی ہیں اور بسا اوقات پچاس قسم کے جرم کی ایک ہی سزا ہوتی ہے۔ لیکن مذہبی سزاؤں کا یہ انداز نہیں ہے۔ مذہب نے دنیاوی سزاؤں میں بھی جرم اور سزا کی مناسبت کا حساب رکھا ہے تاکہ انسان کو یہ احساس رہے کہ یہ سزا باہر سے نہیں لادی گئی ہے بلکہ اسی جرم سے پیدا ہوئی ہے اور آخرت کی سزا تو سو فیصدی ایسی ہی ہے کہ وہ درحقیقت عمل کا ایک اثر ہے جو دیر میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ الگ سے کوئی عقاب نہیں ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بار بار اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

"انسان جو عمل دنیا میں کرے گا اسی کو آخرت میں دیکھے گا۔"

"انھوں نے اپنے اعمال کو قیامت میں حاضر پایا۔"

"جو کچھ راہ خدا میں دے دوگے اسے خدا کے یہاں پالوگے۔"

"جو ذرہ برابر نیکی یا برائی کرے گا اسے قیامت میں دیکھ لے گا۔"

"ہم اعمال اور ان کے آثار کو لکھتے رہتے ہیں [illegible] کو پیش کر دیں گے۔"

ان تعبیرات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ سزا کوئی ایسی شئے نہیں ہے کہ جس کے امکان یا عدم امکان پر بحث کی جائے۔ بلکہ اعمال کا [illegible] جو [illegible] اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کی تعبیرات میں بھی [illegible] کے کفارہ [illegible] ہونے کا تاثر پیدا ہو سکے۔ اس نے [illegible] سے تعبیر کیا ہے۔

علم کے [illegible] کا نام دیا ہے، [illegible] کو شیطانی جذبات سے تعبیر کیا ہے، اور وجود حقیقیہ [illegible] کی حقیقی شکلیں ہیں جن کا اندازہ دنیا میں نہیں ہو سکتا ہے لیکن [illegible] میں جب حقائق بے نقاب ہوں گے تو یہ حقیقت بھی منظر عام پر آ جائے گی، اور بہت ممکن ہے

وہاں ہی اجسام کی شکل میں تبدیل ہو جائیں جن کا سمجھنا اور ماحول میں کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے کہ آج علم و حیات کی ترقی نے انسان کو اس منزل تک پہنچا دیا ہے جہاں مادہ انرجی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر انرجی مادہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو مالک کائنات کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اعمال کو اجسام کی شکل دیدے اور ہر شخص اپنے اعمال کو اپنی نگاہوں سے دیکھ لے اور پھر اس کے اثرات کا اندازہ کر لے جسے عقاب یا سزا کہا جاتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی اصل کام اصلاح کا ہے جس کے پانچ مرحلے ہیں:

۱۔ مشارطہ — جہاں نفس کو انجام کار کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ مراقبہ — جہاں خدا کی نگرانی یاد دلائی جاتی ہے۔

۳۔ محاسبہ — جہاں گذشتہ اعمال کا حساب کیا جاتا ہے۔

۴۔ معاتبہ — جہاں غلطی پر مذمت کی جاتی ہے۔

۵۔ معاقبہ — جہاں نفس کو سزا دی جاتی ہے تاکہ آخرت کی سزا سے محفوظ رہنے کا انتظام ہو سکے۔

[illegible]قیامت کے شہود

یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ موت فنا یا عدم نہیں ہے — یہ درحقیقت ایک نئے عالم میں [illegible] ہے جہاں انسان [illegible] جسم سے الگ ہو کر ایک نئی پیدائش کی منزل سے گذرنا پڑے گا۔ [illegible] ہے کہ یہ دوسرا جسم "[illegible]" کی شکل میں نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک معنوی عالم میں ہوگا جس کا [illegible] کو ہوتا ہے اور جس کی طاقت کسی کے پاس نہیں ہے۔

[illegible] نے پہلی پیدائش کا تجربہ کر لیا ہے [illegible] اور جب وہ [illegible] کو محدود سمجھتا تھا پھر [illegible] اس کی وسعت کا اندازہ ہوا اور پھر وہ برتری ہی کرتا جا رہا ہے۔ [illegible] پہلے بھی تھے لیکن شکم مادر میں معطل اور بیکار پڑے ہوئے تھے۔ باہر آنے کے [illegible] زندگی شروع ہوئی اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی حال موت کا ہے کہ موت کے [illegible] عالم سے آشنا ہوگا جس کا پہلے تصور بھی نہیں تھا اور پھر روحانی عالم میں بروئے کار

بڑھتا رہے گا اور روح بھی محدودیت کے خاتمے کی بنا پر اپنے دائرہ کار کو وسیع تر پاتی رہے گی۔

موت کے فنا و عدم نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہر انسان کی فطرت میں بقا کی خواہش پائی جاتی ہے، اور کوئی شخص بھی آخری لمحات تک فنا ہونا نہیں چاہتا ہے حالانکہ اسے فنا کے لئے بنایا گیا ہوتا تو اس کی فطرت میں فنا و عدم کی تڑپ ہوتی۔ بقا کی خواہش اور سکون کی تلاش علامت ہے کہ اسے کسی اور عالم کے لئے پیدا کیا گیا ہے جہاں بقائے دوام بھی ہے اور سکون مطلق بھی بشرطیکہ انسان اپنے کو اس سکون و اطمینان کا حقدار بنائے۔

موت کے بعد جس عالم وجود کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کا اختتام قیامت پر ہوتا ہے جہاں انسان کو پچھلے وجود کا حساب دینا ہوتا ہے اور حساب لینے والا مالک کائنات ہے جو ذرہ ذرہ سے باخبر ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی حکمت و عدل کے تحفظ کے لئے مقدمہ کا فیصلہ اپنے علم کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لئے گواہ اور شہود کا انتظام بھی کر دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے فیصلہ سے مطمئن ہو سکے اور اسے یہ اندازہ ہو سکے کہ ایک ایسی عدالت بھی ہے جہاں کسی طرح کی رشوت کا امکان نہیں ہے اور کچھ ایسے بھی گواہ ہیں جن کی گواہی میں کسی طرح کا نقص نہیں پایا جاتا ہے

قیامت میں سات طرح کے شہود کی نشاندہی کی گئی ہے

۱۔ اعضاء و جوارح۔ جہاں زبان بند کر دی جائے گی اور ہاتھ پاؤں بولنا شروع کریں گے اور خود اپنے مالک کے خلاف اس کے جرائم کی گواہی دیں گے۔

۲۔ ملائکہ۔ جن ملائکہ کو اعمال کا نگراں اور کاتب بنایا گیا ہے۔ وہ بھی گواہی دیں گے کہ انسان نے کیسے کیسے اعمال انجام دئے ہیں۔

۳۔ حاملان خدا۔ قرآن مجید نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ عمل کرتے جاؤ تمہارے اعمال کو اللہ رسول اور صاحبان ایمان دیکھ رہے ہیں۔ اور یہی روز قیامت گواہی بھی دیں گے

۴۔ زمین۔ روایات میں ہے کہ انسان نے جس زمین پر کوئی عمل انجام دیا ہے روز [illegible] وہ زمین بھی اس کے عمل کی گواہی دے گی اور یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین بیت المال کا [illegible] کے بعد وہاں دو رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے تاکہ زمین روز قیامت گواہی دے اور [illegible] عبرت حاصل کریں کہ بیت المال باپ دادا کی میراث نہیں ہے کہ جس طرح چاہے تقسیم کر دیا جائے

۵۔ زمان۔ وہ وقت بھی انسان کے اعمال کی گواہی دے گا جس وقت عمل انجام دیا ہے اور اسی لئے اوقات عمل کو بیحد اہمیت دی گئی ہے۔

۶۔ مکان۔ وہ جگہ بھی انسان کے اعمال کی گواہ ہوگی جہاں عمل انجام دیا گیا ہے۔

۷۔ شیاطین۔ یہ دشمنان بشریت بھی گواہی دیں گے کہ کون کون ہمارے ساتھ آیا اور کون نہیں آیا، اور پھر یہ اعلان کریں گے کہ ان میں سے کسی کی بھی ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے۔

اللہ ہر بندۂ مومن کو اس وقت کے شر سے محفوظ رکھے "یوم لاینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم"!

عقیدۂ قیامت ۔ نتائج اور اثرات

اسلام کے دوسرے عقائد کی طرح عقیدۂ قیامت بھی ایک فطری عقیدہ ہے جس کی طرف اسلام نے انسان کو متوجہ کیا ہے وہ اس کے ذہن پر کسی ذاتی نظریہ کو مسلط نہیں کیا ہے۔

انسان اپنی ذات پر غور کرے اور اس کے خصوصیات کا جائزہ لے تو اسے اندازہ ہوگا کہ قانون جزا و سزا ایک فطری قانون ہے جس کا ایک مختصر خاکہ خود اس کی ذات کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔

انسانی نفس ایک محکمۂ عدلیہ ہے جہاں ہر عمل کا لمحوں میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کی جزا یا سزا بھی دے دی جاتی ہے۔ یہاں نہ گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ثبوت کی۔ اس مقدمہ کی کوئی تاریخ طے کی جاتی ہے اور نہ کوئی سماعت۔ یہاں نفس ہی مدعی ہوتا ہے اور مدعا علیہ۔ یہی نفس عادل ہے جو سارے کام خود انجام دے دیتا ہے۔

انسان سے جیسے ہی کوئی عمل ہوا نفس کی عدالت نے اس کے بارے میں فیصلہ سنا دیا۔ اچھا ہے تو فرحت و سکون کی شکل میں اس کی جزا دے دی اور عمل برا ہے تو کرب و بے چینی میں سزا میں مبتلا کر دیا اور یہ کام صبح و شام ہوتا رہتا ہے اور بدترین نفس والا انسان بھی احساس رکھتا ہے۔ خارجی عوامل یا غلط تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں فیصلہ غلط ہو سکتا ہے لیکن ... کا فیصلہ نہ کرے یا اسے دوسرے کے حوالے کر دے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ابن سعد جیسا انسان بھی رات بھر سوچتا ہے کہ قتل حسینؑ کے لئے رضا مندی کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیاوی تربیت کی بنا پر مادی پہلو کو مقدم کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن رات بھر کرب میں مبتلا رہنا اور غلط انداز فکر کی سزا ملتا رہنا اور صبح کے وقت فیصلہ

کر لینا دلیل ہے کہ نفس کی عدالت فیصلہ صادر کرنے سے باز نہیں آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نفس خبیث ہوتا ہے تو فیصلہ بھی خباثت کے زیر اثر ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قانون مجازات انسان کا ایک فطری قانون ہے اور اسلام نے اسی قانون کو روز قیامت کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس کی دلیل ایسے ہی غلط فیصلوں کو قرار دیا ہے جو ابن سعد جیسے افراد کیا کرتے ہیں۔ ورنہ نفس کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی روز جزا کی ضرورت نہیں تھی۔

نفس کی خباثت اور حالات کی اثر اندازی نے اس کے فیصلوں کو ناقابل اعتبار بنا دیا اور ضرورت پڑی کہ ایک دن ایسا بھی ہو جب خالق نفس فیصلہ کرے اور انسان کو اس کے کردار کی قرار واقعی سزا دی جائے یا مستحق انعام ہے تو اس کو مکمل انعام سے نوازا جائے۔

عقیدۂ قیامت فطری اور منطقی ہونے کے علاوہ انسانی زندگی پر بے شمار اثرات بھی رکھتا ہے اور یہ اثرات انسان کی زندگی میں انقلاب بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ بعض نتائج و اثرات کی طرف اشارہ کر دیا جائے شاید یہ اشارہ ہی بعض افراد کی زندگی میں انقلاب برپا کر سکے اور ان کا عقیدۂ قیامت نظریہ کی حدوں سے نکل کر عمل پسندی کی حدود میں داخل ہو جائے۔

۱۔ احساس مسئولیت

انسان کے ذہن میں اس عقیدہ کا پیدا ہو جانا کہ ایک دن پوری زندگی کے اعمال کا حساب ہونا ہے اور اسی کے مطابق جزا یا سزا کا فیصلہ ہونا ہے۔ ایک عجیب و غریب احساس مسئولیت پیدا کر دیتا ہے جو ہر قدم پر اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی عمل مرضی مولا کے خلاف نہ ہونے پائے کہ کل اس کی بارگاہ میں حاضری کے لائق نہ رہ جائیں یا بدترین عذاب سے دوچار ہو جائیں۔

احساس ذمہ داری انسان کی زندگی میں تقدیر سازی کا کام کرتا ہے اور یہ احساس صحیح معنوں میں عقیدۂ قیامت کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

دنیا کا کوئی قانون انسان میں یہ احساس مسئولیت ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر قانون انسان ہی کا بنایا ہوا ہے اور انسان فطری طور پر اپنے کو کسی بندہ کے سامنے جواب دہ تصور

نہیں کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر وقت عمل سے فرار کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ قانون پروردگار کا بنایا ہوا ہے اور جواب اسی کی بارگاہ میں دینا ہے تو اس احساس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ شعورِ بقا

زندگانی دنیا کا ظاہری نقشہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے، ترقی کرتا ہے اور ایک دن مر جاتا ہے۔ اس کے سارے اعمال، سارے افکار، ساری ترقیاں اور سارے مذاہب کا خلاصہ و نتیجہ صرف فنا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک طرف زندگی کو بے قدر و قیمت بنا دیتی ہے اور دوسری طرف ہر نسل میں یہ احساس کمتری پیدا کر دیتی ہے کہ ہر دور اگلی نسل کے لئے صرف ایک تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ یہی ایک دن اس نسل کے سر سے گذر کر چلا جانا ہے۔ یعنی اسے چند دن باقی رہنا ہے ورنہ یہیں فنا ہو جانا ہے۔

لیکن یہی تصور جب عقیدۂ قیامت سے تبدیل کر دیا جائے تو انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقدر فنا نہیں ہے بلکہ وہ بقائے دوام کی خاطر اس دنیا میں آیا ہے اور جب تک اس کا جسم مادی اس دنیا کے حالات کو برداشت کر سکتا ہے وہ اس دنیا میں رہ کر عمل کرتا رہتا ہے اور اس کے بعد یہاں سے ایک عالم مجردات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جہاں اپنے بہترین کردار کا انعام حاصل کرتا ہے اور ایک لذتِ دوام کی دولت سے مالامال ہو جاتا ہے۔

اس کی موت کوئی فنا نہیں ہے بلکہ ایک دریچۂ انقلاب ہے جس کے ذریعہ انسان اس دنیا کی وفات کے ساتھ ہی دوسرے عالم میں ولادت کا جشن مناتا ہے اور جس طرح اس دنیا میں آنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شکم مادر ایک عالم نہیں تھا ایک طرح کا زندان تھا اور اس میں ملنے والا رزق بہترین ماکول و مشروب نہیں تھا بلکہ ایک کثیف خون تھا۔ اسی طرح اس عالم میں قدم رکھنے کے بعد اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا دنیا نہیں تھی ایک طرح کا قید خانہ تھی اور یہاں کی غذائیں لذیذ نہیں تھیں بلکہ کثیف تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان کو اس کثافت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اب جو جنت کی نعمتیں سامنے آئیں تو اندازہ ہوا کہ ہم کہاں برباد کی زندگی گذار رہے تھے۔ اور ہماری موت

وہ ایک مرحلہ ہے جس نے ہمیں قید خانے سے نکال کر ایک وسیع ترین عالم تک پہنچا دیا ہے اور یہاں کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔

۳۔ تسکینِ خواہشات

انسانی زندگی میں خواہشات کا پہلو اس قدر نمایاں ہے جس سے کوئی فرد بشر انکار نہیں کر سکتا ہے۔ خواہش انسانی زندگی کی وہ عظیم ترین ضرورت ہے جس کے بغیر فرد کی بقا اور معاشرہ کی ایجاد دونوں ناممکن ہیں۔ انسان میں کھانے پینے، سونے جاگنے کی خواہش نہ ہوتی تو چند روز کے اندر مر جاتا اور جنس کی خواہش نہ ہوتی تو دوسری نسل کی ایجاد ناممکن ہو جاتی۔ یہ خواہش ہی کی کرشمہ سازی ہے جو عالم انسانیت باقی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن اس کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ خواہش ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اور ایک ایسا تقاضہ ہے جس کی تکمیل ناممکن ہے۔ اب یہی اگر فرعون، ہامان وغیرہ میں ساری دنیا کی حکومت کی خواہش پیدا ہو جائے تو اس کی تکمیل ناممکن ہو جائے چہ جائیکہ لاکھوں ایسے سرپھرے موجود ہیں جن میں ایک سے زیادہ کی ترقی اور آرزو پائی جاتی ہے۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق نے ایسا پیٹ ہی کیوں پیدا کیا ہے جس کے بھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور ایسا جذبہ ہی کیوں دیا ہے جس کی تسکین ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا وجود ضروری تھا تو اسی مقدار میں پیدا کیا ہوتا جس کا امکان ہوتا اور اس سے زیادہ کا تصور بھی انسان کے لئے محال کر دیا ہوتا۔ تاکہ زندگی میں کوئی زحمت نہ پیدا ہو۔

لیکن اس کا جواب یہی عقیدۂ آخرت میں پایا جاتا ہے کہ پروردگار نے اس دنیا کو ضروریات کی تکمیل کے لئے پیدا کیا ہے اور اس میں اتنا ہی سامان رکھا ہے جس سے ضرورت کا علاج کیا جا سکے اس کے بعد خواہش کی تکمیل کے لئے آخرت کو قرار دیا ہے جہاں ہر وہ نعمت مہیا ہے جس کا تصور ہو سکتا ہے اور ہر وہ شے حاضر ہو جائے گی جس کی خواہش ہو جائے۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان اس شے کا استحقاق پیدا کرلے ورنہ نعمتیں موجود رہیں گی اور انسان محروم رہے گا۔ گویا کہ اس دنیا میں نقص انسان میں نہیں ہے، دنیا کی وسعت میں ہے اور آخرت میں نقص نعمتوں میں نہیں ہے

نقص اس نظام میں ہے کہ اس نے بچے کو ستم کے قابل نہیں بنایا ہے۔

۴۔ عدالتِ کبریٰ

دنیاوی نظام سے جہاں ذہنی طور پر بھی، اس کا احساس کرتا رہتا ہے، ورنہ عدالت کی عدالت سے مسلسل فیصلے ہوتا رہتا ہے، اور عملی طور پر بھی مقدمات چلتے رہتے ہیں اور فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان فیصلوں میں دو بنیادی کمزوریاں ہوتی ہیں:

۱۔ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف قانون کی روشنی میں فیصلہ کر دیتا ہے جس کے بعد ظالم آزاد بھی ہو سکتا ہے اور مظلوم محروم بھی ہو سکتا ہے۔ حاکم پر کوئی عتاب نہیں ہوتا ہے کہ اس نے قانون کے مطابق فیصلہ دیا ہے لیکن صاحبِ حق کا حق برباد ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

۲۔ فیصلہ پر مختلف عوامل اثر انداز ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی جنسی کاغذات، رشوت وغیرہ صحیح فیصلہ کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک ایسی عدالت ہو جہاں فیصلہ سو فیصدی حق و حقیقت کے مطابق ہو اور کسی طرح کی رشوت وغیرہ کا کوئی امکان نہ ہو اور ایسی عدالت آخرت کے علاوہ کوئی عدالت نہیں ہو سکتی ہے جہاں ساری زندگی کے اعمال کا حساب کر کے جزا یا سزا دی جا سکے۔

۵۔ نظرِ ثانی

دنیا کے فیصلوں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ان میں [illegible] عدالت میں اپیل کی گنجائش باقی رہتی ہے یا اسی عدالت میں نظرِ ثانی کا موقع دے دیا جاتا ہے اور اس طرح مجرمین [illegible] ہو جاتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ سزا کا فیصلہ بھی ہو گیا تو دوسری [illegible] دوسری عدالت [illegible] کے امکانات باقی ہیں لیکن عقیدۂ آخرت [illegible] اس طرح کی [illegible] قیامت [illegible] ایک مرتبہ جو فیصلہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب [illegible] کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور [illegible] جس [illegible] قرآن مجید [illegible] لوگ گذارش کریں گے کہ ہمیں [illegible]

دنیا میں بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کر سکیں تو جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، یہ صرف باتیں ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ جب دنیا میں امکان نہیں تھا تب تو زندگی کا یہ حال تھا جب اس کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا تو حالات اور بھی بدتر ہو جائیں گے۔ ان کے سدھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۶۔ تلافیِ مافات

عقیدۂ آخرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں کسی نقصان کی تلافی کا کوئی امکان نہیں ہے [illegible] ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فیصلہ سیکڑوں اور ہزاروں سال بعد ہونے والا ہے [illegible] اس دوران انسان کو یہ مہلت دے دی ہے کہ اگر کوئی شخص مرنے والے کی کمزوریوں کا علاج کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مرنے والے کے ذمہ فرائض رہ گئے ہیں تو زندہ انھیں ادا کر سکتا ہے۔ اس کے ذمہ دوسروں کے حقوق ہیں تو وہ معاف بھی کر سکتے ہیں اور دیگر افراد ان حقوق کی ادائیگی بھی کر سکتے ہیں اور یہ سب اعمال مرنے والے کے حساب میں لکھ دیے جائیں گے۔

برخلاف اس کے اگر فیصلہ زندگی ہی میں ہو گیا ہوتا یا مرنے کے ساتھ سنا دیا گیا ہوتا تو گنہگار اس رعایت سے بھی محروم رہ جاتا اور سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس مقام پر یہ خیال نہ پیدا ہو کہ [illegible] مجرم کی جو [illegible] دوسروں کے [illegible] اور دوسرے لوگ اس کی تلافی کر دیں گے۔ اس [illegible] حقیقت، رعایت اور چھوٹ نہیں ہے بلکہ تربیت کی تعلیم ہے کہ انسان اپنے بعد ایسی اولاد چھوڑ جائے جو اس کے عمل کی تلافی کر سکے، ایسا حلقۂ احباب بنائے جو مرنے کے بعد اس کے کام آ سکے۔ یہ تبلیغ و تربیت کا حسین ترین انداز ہے جہاں انسان چھوٹے سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک پوری نسل کی صحیح اسلامی تربیت کرتا ہے یا حلقۂ احباب میں ایسے افراد کو [illegible] کر دیتا ہے جو مرنے کے بعد کام آ سکتے ہیں اور [illegible] انسان میں یہ شعور پیدا ہو جائے گا وہ خود بھی باعمل ہو جائے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں [illegible]

- اتفاقاً ہی ہو سکتی ہے قصداً اور عمداً نہیں ہو سکتی ہے۔

۷۔ عمومیت حساب

انسان کی زندگی میں بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو روز مرہ سے داخل ہو جاتی ہیں اور ان کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔

اس میں ایک قسم چھوٹی چھوٹی برائیوں کی ہے کہ جب انسان بڑی برائیوں کے ترک کرنے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو چھوٹی برائیوں کی طرف سے غافل یا مطمئن ہو جاتا ہے کہ پروردگار ان چھوٹی سی غلطیوں کا محاسبہ نہیں کرے گا۔ اور انھیں یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی برائیوں کو ترک کر کے ایک کارنمایاں انجام دیا ہے اور اس کارنمایاں کا انعام یہ ہے کہ ان سے چھوٹی برائیوں کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

دوسری قسم "مخفی" برائیوں کی ہے جن کی کسی کو اطلاع ہی نہیں ہوتی ہے اور انسان یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ اس برائی سے نہ کسی سزا کا خطرہ ہے اور نہ رسوائی کا۔ یہ وہ جرم ہے جس کی گرفت کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

لیکن عقیدۂ آخرت ان دونوں دروازوں کو بند کر دیتا ہے اور اس کے بارے میں قدرت کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ یہاں ایک ایک ذرہ کا حساب ہوگا اور جو کچھ کیا ہے سب سامنے آ جائے گا۔ صرف سزا پر اکتفا نہیں کی جائے گی بلکہ اعلان کر کے بھی سامنے لایا جائے گا۔

۸۔ محاسبۂ روح

دنیا کے ہر قانون اور تعزیراتی نظام میں جسم کے اعمال کی سزا معین ہے لیکن روح کے اعمال کا کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ انسان جب تک کسی حسد یا بغض یا کینہ کا اظہار نہ کرے تو کوئی قانون یہ سوال نہیں کر سکتا ہے کہ آپ کے اندر فلاں کا بغض یا فلاں شخص سے حسد کیوں پایا جاتا ہے یا آپ اس قدر بخیل یا بزدل کیوں ہیں۔ اس طرح کی کیفیات کا محاسبہ صرف ان کے اثرات کے بعد ہوتا ہے۔ اور جب تک کسی قانون کو اظہار کے بغیر اطلاع ہی نہیں ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر قانون میں بغض،

خباثت، نفاق اور بے دینی کے امکانات پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے ذمہ دار ان قانون بھی ان برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن مذہب کا عقیدۂ آخرت اس برائی کا بھی سد باب کرتا ہے اور یہاں اعمال سے پہلے عقیدہ کا محاسبہ ہوتا ہے اور اعمال میں تقلید چل جاتی ہے لیکن عقیدہ میں تحقیق کا تقاضا کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اعمال میں سفارش کی بھی گنجائش ہے اور اس کمی کو دوسرا انسان بھی پورا کر سکتا ہے لیکن عقیدہ میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس کا محاسبہ انتہائی سخت ہے جس احساس کے بعد انسان حسن عمل سے پہلے تزکیہ نفس کی فکر کرتا ہے اور تزکیہ نفس کے بعد حسن عمل کوئی کام نہیں رہ جاتا ہے۔

۹۔ استقامت عمل

قیامت کے مسائل میں ایک مسئلہ صراط کا بھی ہے جہاں ہر شخص کو جہنم پر قائم ہونے والے پل سے گزرنا ہوگا اور اس کے بغیر جنت میں داخلہ ممکن نہیں ہے۔

اس صراط سے گزرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی استقامت پیدا کرے کہ کسی طرح کی کجی نہ رہنے پائے ورنہ یہاں کی کجی وہاں کی رفتار پر اثر انداز ہوگی اور گزرنے والے میں ذرا سی بھی کجی پیدا ہو جائے تو اس کے گزر جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس کا گر جانا قطعی اور یقینی ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان میں ایسا عقیدہ اور ایمان پیدا ہو جائے تو وہ اپنی زندگی میں استقامت اور اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ زندگی کا سب سے زیادہ حسین ترین ہوگا کہ انسان پوری زندگی کو جادۂ اعتدال پر گزار دے اور اس میں کسی طرح کا انحراف نہ پیدا ہونے پائے۔

۱۰۔ توازن حیات

انسانی زندگی کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ اس کے معاملات میں توازن نہیں رہ جاتا ہے اور

کبھی فرار کی منزل میں جاکر حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی تفریط کا شکار ہو کر حقیقت سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے جب کہ صحیح ترین زندگی وہ ہے جس میں توازن برقرار رہے اور کسی طرح کا بے ہنگم پن پیدا نہ ہونے پائے۔

بے ہنگم زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی اس قدر بیدار ہو جاتا ہے کہ ہر درد کو بھول جاتا ہے اور اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے تو مالکوں کو گناہ دیے لگتا ہے۔

سرمایہ داروں سے مرعوب ہوتا ہے تو مزدوروں کا خون چوسنے کو جائز قرار دے دیتا ہے اور مزدوروں کا ہمدرد ہو جاتا ہے تو سرمایہ داروں کے قتل کو بھی جائز کر دیتا ہے۔

کبھی باپ کا طرفدار ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹے کا۔ کبھی زوجہ کا ہمدرد بن جاتا ہے اور کبھی شوہر کا۔ کبھی استاد سے ہمدردی کرنے لگتا ہے اور کبھی شاگرد سے۔ غرض کہ کبھی قانون کا محافظ بن جاتا ہے اور کبھی مجرم کا۔

اسی عدم توازن نے سماج کے نقشہ کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں ہر طرح کی برائی داخل ہو گئی ہے اور اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔ قوانین بنائے جاتے ہیں لیکن کوئی عمل کرنے والا نہیں ہوتا ہے اور نہ عمل درآمد کرانے والا۔

اس مصیبت کبریٰ کا علاج صرف عقیدۂ آخرت ہی ہے جب انسان یہ محسوس کرے گا کہ ایک میزان عدالت قائم کی جائے گی جس پر زندگی کے سارے اعمال کو تولا جائے گا اور کسی عمل کو نظرانداز نہ کیا جائے گا۔ زندگی میں ذرہ برابر ظلم ہو گا تو وہ میزان عمل پر پورا اتر جائے گا۔ دریا کا قطرہ بھی گیا تو وہاں بھی برائیوں کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ صاحبان حق اپنے حق کا مطالبہ کریں گے اور انسان کے پاس کوئی ذریعہ ان حقوق کی ادائیگی کا نہ ہو گا جس کا انجام جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

عقیدۂ آخرت توازن اعمال کا بہترین وسیلہ ہے جہاں کسی انسان کے حقوق ضائع نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کے حق میں کوئی زیادتی ہو سکتی ہے۔ اس عقیدہ کا مالک انسان زبان کھولنے سے پہلے ادب کو تولتا ہے اس کے بعد بولتا ہے کہ روز قیامت ان حروف کا وزن بھی کیا جائے گا اور انہیں بھی تول کر ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جب معاملہ اتنا پاکیزہ ہو گا تو زندگی کے پاکیزہ ہونے میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔

۱۔ خوف رسوائی

انسانی تصورات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ انسان کے لئے جسمانی مشقت کا برداشت کر لینا سہل ہے، آسان ہوتا ہے لیکن روحانی اذیت کا برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے اور جرائم کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) سزا (۲) بدنامی، رسوائی

انسان جرم کے ارتکاب کے بعد بنیادی طور پر اس امر کا متمنی ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس کے جرم کی اطلاع نہ ہونے پائے اور وہ ہر طرح کی سزا سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ قانون کو اطلاع ہو جاتی ہے اور وہ سزا کا فیصلہ سنا دیتے ہیں تو دوسری تمنا یہ ہوتی ہے کہ سزا مل جائے لیکن عوام الناس کو جرم کی اطلاع نہ ہونے پائے تاکہ سزا کی تاویل کی گنجائش رہے اور عوامی ہمدردی کا امکان باقی رہے۔ ورنہ جرم کے انکشاف کے بعد ہمدردی ختم ہو جائے گی اور وہ رسوائی ہو گی جس کا برداشت کرنا اصل سزا سے بھی زیادہ سخت تر ہو گا۔

عقیدۂ قیامت انسان کو اسی نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ قیامت کی سزا میں انسان سزا سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ رسوائی سے۔ اور رسوائی بھی چند افراد کے درمیان نہیں اولین و آخرین کے درمیان۔

آپ سوچیں کہ جوان اس بات پر راضی نہیں ہے کہ اس کے خصوصی اشاروں کو برداشت والے جان سکیں۔ جو اس بات سے ہوشیار رہتا تھا کہ اس کی غلطیوں کے اعمال سے اس کے ماں باپ، اعزا و اقربا باخبر نہ ہو جائیں کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے۔ جب اس عمل سے ساری خلقت باخبر ہو گی تو اس کا کیا عالم ہو گا، اور عرصہ محشر میں کس طرح سر اٹھانے کے قابل ہو گا۔

ائمہ معصومینؑ نے اسی موقع پر اس دعا کی تعلیم دی تھی کہ "خدایا! ہمیں بے شمار انسانوں کے سامنے رسوائی میں مبتلا نہ کرنا"۔ ہمارے لئے عذاب ہی کیا کم ہے کہ رسوائی کا بھی سامنا کرنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ جب انسان کو ایسی رسوائی کا احساس پیدا ہو جائے گا تو اس کی زندگی میں خود بخود انقلاب آجائے گا اور اس طرح سارا معاشرہ اصلاح و فلاح کے راستہ پر لگ جائے گا۔

۱۳۔ پابندیٔ حقوق

قیامت کے دن دو طرح کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور دونوں کی سزا الگ الگ ہوگی۔ ان فرائض کا محاسبہ ہوگا جن میں کوتاہی کی گئی ہے اور ان کی سزا عذاب کی شکل میں برآمد ہوگی۔ اور ان حقوق کا محاسبہ ہوگا جنہیں ضائع کر دیا گیا ہے چاہے وہ حق اللہ ہوں یا حق العباد۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا سے جانے والا جب اس قدر خالی ہاتھ گیا ہے کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور اس کا لباس اتنا سادہ تھا کہ اس میں کوئی جیب بھی نہیں تھی اور اس کے اموال کسی بینک میں بھی نہیں تھے جس کی کوئی برانچ آخرت میں پائی جاتی ہو۔ اب اگر اس کے ذمہ کسی شخص کا ایک پیسہ بھی رہ گیا ہے تو وہاں کہاں سے لا کر پورا کرے گا اور یہ حق کس طرح ادا کیا جائے گا۔

فرائض میں کوتاہی تو رب العالمین کا معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں یہ امکان بھی ہے کہ ارحم الراحمین غربت و بیکسی پر رحم کھا کر معاف کر دے لیکن حقوق کا معاملہ تو اپنے جیسے انسانوں سے ہے اور وہ ایسی بیکسی کے ماحول میں خود بھی ہر طرح کی نیکیوں کے محتاج ہو سکتے ہیں کہ توقع کی جائے کہ وہ رحم و کرم کا معاملہ کریں گے۔ اب اگر انہوں نے اپنے حق کا مطالبہ کیا اور نیکی دینے کی صورت میں مرحلہ کا مطالبہ کیا اور ایک پیسہ کے مقابلہ میں زندگی کی نیکیوں کا مطالبہ کر دیا تو عالم بیکسی میں مطالبہ کو کس طرح ادا کر سکے گا اور اس پیسہ کی قیمت کا کس طرح تعین کیا جا سکے گا جب کہ صاحب معاملہ مظلوم ہے اور دوسرا ظالم ہے اور ظالم کو مظلوم کے مکمل مطالبہ کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان اس بیکسی اور بے بسی کا احساس کرے تو اس کی زندگی میں یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے اور وہ کسی کے حق کو کسی وقت بھی ضائع نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ

عقیدۂ آخرت سے پیدا ہو سکتی ہے ورنہ دنیا میں بے شمار حقوق ضائع ہو رہے ہیں اور کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہیں ہے۔

۱۴۔ مجازات آخریں عمل

دنیا کے سارے قوانین کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ زندگی بھر کے اعمال کا محاسبہ کر کے ان کی جزا یا سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کے آخری مرحلہ کی جزا دے سکتے ہیں نہ سزا۔ انسان نے آخری لمحات حیات میں بہترین عمل کیا ہے تو اس کا کوئی انعام نہیں ہے۔ مرنے والے کے نام پر روڈ یا پارک بنا دینا یا کسی نمایاں مقام پر اس کا مجسمہ نصب کر دینا مرنے والے کے حق میں کوئی انعام نہیں ہے اور نہ اسے اس انعام سے کوئی فائدہ پہنچنے والا ہے۔

یہی حال برائی کا بھی ہے کہ اگر اس نے خودکشی بھی کر لی ہے تو قانون کی گرفت سے نکل گیا ہے اور اب قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے اور اس طرح بہترین نیکی کرنے والا اپنے انعام سے محروم رہ جاتا ہے اور بدترین جرم کا ارتکاب کرنے والا سزا سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

لیکن عقیدۂ آخرت میں اس محرومی یا آزادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہاں جس طرح زندگی کے سارے اعمال کا محاسبہ ہوتا ہے اسی طرح آخری عمل کا بھی حساب کیا جاتا ہے اور اس کی جزا یا سزا دی جاتی ہے۔

عقیدۂ آخرت کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ آسودگی کی تلاش میں خودکشی کر لیتے ہیں یا بڑے بڑے مجرمین دوسروں کو قتل کر کے اپنے کو گولی مار لیتے ہیں اور ہر طرح کی سزا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر عقیدۂ آخرت عام ہو گیا ہوتا اور عوام الناس کے کردار میں رچ بس گیا ہوتا تو اس طرح کی صورت حال نہ ہوتی اور سماج اس قسم کے بدترین جرائم سے دوچار نہ ہوتا۔

خالص مال

دنیا کے بازاروں میں خالص دودھ اور خالص گھی تو مل سکتا ہے۔ لیکن خالص راحت

دردوالم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دنیا کے کسی راحت و آرام کا تصور کریں اس میں کوئی نہ کوئی تکلیف کا پہلو موجود ہے۔ مال دنیا کے ساتھ فکر حفاظت، اولاد کے ساتھ فکر زندگی، منصب کے ساتھ فکر بقا۔ غرض ہر آرام کے ساتھ ایک تکلیف اور روحانی کرب ضرور شامل رہتا ہے اور یہی حال تکلیف کا بھی ہے کہ بدترین تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو راحت کا ضرور نکل آتا ہے۔ جسے قتل کر دیا جاتا ہے اسے بہت سی زحمتوں سے نجات مل جاتی ہے اور جسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے اسے بھی شرف کے سبب الم کے باوجود کوئی نہ کوئی راحت ضرور نصیب ہو جاتی ہے اور اس طرح اس دنیا میں خالص لذت یا خالص زحمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی شخص کو بہترین انعام دیا جائے تو اس انعام میں مشقت کا پہلو شامل رہتا ہے اور کسی شخص کو بدترین سزا دی جائے تو اس سزا میں راحت کا پہلو شامل ہو جاتا ہے اور اس دنیا کی دنیا میں نہ واقعی انعام کا کوئی تصور ہو سکتا ہے اور نہ واقعی سزا کا۔

اس مسئلہ کا حل صرف عقیدۂ آخرت میں ہے جہاں جزا اور سزا کے لئے دو مرکز قائم کئے گئے ہیں۔ ایک کا نام ہے جنت اور دوسرے کا نام ہے جہنم۔ جنت اس مرکز سعادت کا نام ہے جہاں کسی قسم کی زحمت، مشقت، تکلیف، درد، رنج و الم نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ خواہشات کی تکمیل کا بھی مکمل سامان موجود ہے کہ انسان کو یہ زحمت بھی نہ ہونے پائے کہ تمنا کرنے کی آرزو پیدا ہو کوئی درد و غم حاصل ہونے پائے۔

جنت میں اس امر کا امکان ہے کہ انسان بالکل نفس کی پیروی کرے حق اور استحقاق سے زیادہ کی آرزو کرے لیکن اس کا امکان نہیں ہے کہ آرزو کرے اور آرزو پوری نہ ہو۔

یہی حال جہنم کا بھی ہے کہ جہنم ایسے مرکز آلام، درد و رنج اور زحمت و مشقت کا مرکز ہے جہاں کسی طرح کی راحت و آرام کا کوئی تصور نہیں ہے اور جہاں کی سزا ابدی ہے سزا کے ختم ہونے کا تصور اور جہاں کا سزا پانے والا کسی طرح کی راحت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ علاوہ کہ اس کے اعمال میں کوئی نیک عمل بھی شامل ہو جس کی جزا فکر راحت کی شکل میں دے دی جائے وہ راحت کا تصور کر سکے لیکن جتنی دیر بھی تکلیف میں مبتلا رہے گا اس تکلیف میں کسی راحت کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ رب کریم جملہ اہل ایمان کو اس منزل عذاب سے محفوظ رکھے اور اس منزل راحت کی توفیق عنایت فرمائے۔

فروع دین

عبادات:

۱۔ نماز
۲۔ روزہ
۳۔ زکوٰۃ
۴۔ حج
۵۔ خمس
۶۔ جہاد
۷۔ امر بالمعروف
۸۔ نہی عن المنکر
۹۔ تولا
۱۰۔ تبرا

معاملات:

۱۔ احوال
۲۔ اموال
۳۔ اعمال

نماز

اسلامی عبادات میں بہترین عبادت کا نام ہے نماز

نماز اسلام کی انفرادیت، اجتماعیت، سیاست اور اخلاقیت کا بہترین مونہ ہے اس ... علماء کے ارشاد کے مطابق ہم خصوصیات اسے حاصل ہیں جن سے اس عبادت کو تمام ... سے ممتاز بنا دیا ہے اور حقیر کی تلاش کے اعتبار سے اس سے زیادہ خصوصیات ... جن میں کی طرف گفتگو کے دوران اشارہ کیا جائے گا۔

۱۔ سیرت انبیاء

نماز کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس کا تذکرہ سابق امتوں اور پیغمبر کرام کے حالات کے ذیل ... ملتا ہے اور یہ صرف شریعت اسلام کا انفرادی حکم نہیں ہے۔ اس کی پابندی تمام انبیاء کرام ... کی سنت ہے اور اس سے اختلاف تمام انبیاء کرام کی سیرت سے اختلاف ہے
• جناب ابراہیم نے نماز کے بارے میں دعا کی تھی کہ خدایا مجھے اور میری ذریت کو نماز گزار ... دے اور یہ عظمت نماز کا عظیم ترین مقام کا ہے
اس مقام پر اس نکتہ کی طرف بھی توجہ رہے ہو گی کہ جناب ابراہیم نے اپنی ذریت کے بارے ... طرح کی دعائیں کی ہیں۔
ا۔ میری ذریت میں ایک امت مسلمہ پیدا کر۔
ب۔ میری ذریت میں امامت قرار دیدے

ج۔ میری ذریت کو نماز گذار قرار دے دے۔

جو اس بات کی علامت ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی نگاہ میں جس قدر اہمیت اصل اسلام کی ہے اسی قدر اہمیت منصب امامت کی بھی ہے اور جس قدر اہمیت عقائد میں مسئلہ امامت کی ہے اسی قدر اہمیت احکام میں مسئلہ نماز کی ہے۔

امامت سے انحراف کرنے والا حقیقی مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے، اور نماز سے انحراف کرنے والا حقیقی متقی، مومن نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

● جناب شعیبؑ نے قوم کو تبلیغ کی تو قوم نے کہا کہ کیا آپ کی نماز ہمارے خداؤں کی پرستش سے روک رہی ہے؟"

اس سوال کا لہجہ اگرچہ استہزاء اور تمسخر کا ہے لیکن اس سے دو حقیقتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔

۔ قوم کی نگاہ میں جناب شعیبؑ کے سارے احکام ایک طرف تھے اور تنہا نماز ایک طرف تھی کہ قوم نے طنز و مذاق کے لئے اسی کا انتخاب کیا۔

ب۔ قوم کو یہ احساس تھا کہ بت پرستی سے روکنے والی کوئی اور شے نماز سے بہتر نہیں ہو سکتی ہے کہ نمازی جس طرح پروردگار کی بارگاہ میں مسلسل سجدہ ریز رہے گا، بت کے سامنے کس طرح سر جھکائے گا۔ اسے کم سے کم یہ احساس تو رہتا ہے کہ سر جھکانے کے لائق کس طرح کی ہستی ہوتی ہے اور سر کا مرتبہ کس کے سامنے خم ہو سکتا ہے۔

● جناب موسیٰؑ کو مالک کائنات نے جو ہدایات دی ہیں ان میں ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ "میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔"

گویا یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نماز کا مقصد یاد خدا ہے اور یاد خدا کا کوئی ذریعہ نماز سے بہتر نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پانی میں ڈوبتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے انسان پر بھی نماز واجب رکھی ہے کہ انسانیت کا کوئی عمل اس سے ... اور انسان کسی بھی حال میں دنیا سے جائے ذکر خدا سے محروم نہ رہنے پائے۔

● جناب عیسیٰؑ نے روز ولادت گہوارہ میں کلام کیا تو فرمایا کہ "میں بندۂ خدا ہوں جس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے — اور نماز کی وصیت کی ہے۔"

اس مقام پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے کہ دین صرف انفرادی اعمال پر زور نہیں دیتا ہے بلکہ اسے اجتماعی اعمال سے بھی برابر کی دلچسپی ہے اور شاید حضرت عیسیٰؑ کی نصیحتوں میں زور دار انداز سے اس امر کا تذکرہ اس لئے کیا گیا تھا کہ قوم اجتماع سے کنارہ کشی اور رہبانیت کی دیوانی نہ بن جائے اور اس طرح حیثیت اجتماعی اور ... نظر انداز کر دیں۔

● جناب لقمانؑ اگرچہ ایک حکیم تھے اور ان کا شمار انبیاء و مرسلین میں نہیں ہوتا ہے — لیکن پروردگار نے ان کی نصیحتوں کو جزء قرآن بنا دیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ان کی نصیحتوں میں پیغام الٰہی کا دخل تھا اور یہ ایک طرح کی الٰہی تعلیمات تھیں جو زبان لقمانؑ سے بیان ہوئی تھیں اور نبوت و حکمت میں کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔ نبی خود بھی معلم حکمت ہی ہوتا ہے اور تعلیم حکمت اس کے اولین فرائض میں شامل ہوتی ہے۔

جناب لقمانؑ نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "فرزند! نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور مصیبتوں پر صبر کرو کہ یہی مستحکم امور کی پہچان ہے۔"

مفسرین کا بیان ہے کہ قرآن مجید میں چند الفاظ میں پورا نظام زندگی بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی انداز نہیں ہے جہاں عبادت، سیاست، انفرادی، اجتماعی، راحت، مصیبت ہر حالت کا لحاظ کر لیا گیا ہے اور ایک مکمل نظام حیات پیش کر دیا گیا ہے۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ جناب لقمانؑ نے زکوٰۃ کا ذکر نہیں کیا ہے اور شاید اشارہ یہ ہے کہ جس طرح نماز کسی حال میں ساقط ہونے والی نہیں ہے ... زکوٰۃ کا عمل ... پر فرض ہے اور جس کے پاس مال نہیں ہے اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ... وہ زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ نماز کا نظام مشکل سے ... ہر حال ... اس میں [illegible] کی کوئی تفریق [illegible] کا کوئی [illegible] نہیں ہے۔

● جناب زکریاؑ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ نے انہیں اولاد کی بشارت اس وقت دی جب آپ محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ

سے اولاد، مال اور دیگر کا طلبگار ہے تو اس کا ذریعہ دوا اور انجکشن نہیں ہے بلکہ اس کا ذریعہ بھی بارگاہ معبود میں حاضری اور اس سے التماس ہے۔ اس نے مسئلۂ تخلیق کو صرف اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور کسی کے حوالے نہیں کیا ہے۔ طبیب، دست شفا کا حامل ہو سکتا ہے، دست عطا کا مظہر نہیں۔ البتہ وسیلہ بن سکتے ہیں مالک کائنات نہیں۔ ڈاکٹری تشخیص میں بھی اذن خدا ضروری ہے کہ اس کے بغیر ادویات کی تشکیل و ترکیب بھی صحیح نہیں ہے۔ نفع و ضرر کا مسئلہ تو اس سے کہیں زیادہ اہم اور سنگین ہے۔

● جناب اسماعیلؑ کا تذکرہ سورۂ مریم میں اس انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ صادق الوعد رسول و نبی تھے اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیتے تھے اور پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔

اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جناب اسماعیل کا انفرادی عمل ہی نہیں تھا بلکہ آپ کام کے اپنے اہل کو بھی برابر نماز کا حکم دیا کرتے تھے اور اس امر میں کسی کی غفلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پسندیدگی میں اس کی نماز اور اس کی تبلیغ کا بہت بڑا دخل ہے کہ پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدگی کا معیار یہی ہے کہ انسان بندگی پروردگار کرے اور دوسروں کو بھی بندگی کا حکم دے۔

● پروردگار نے ادریسؑ، آدمؑ، کشتی نوحؑ، ذریت ابراہیمؑ و اسرائیلؑ کے نبیوں اور ہدایت یافتہ و مخلصین کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ "ان کے بعد ایسی اولاد پیدا ہوئی جس نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کا اتباع کر لیا۔"

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز کا دور کشتی نوحؑ کے سواروں کے درمیان بھی [illegible] اور انسان اس وقت تک نماز سے غافل نہیں ہوتا ہے جب تک خواہشات کے تابع نہ ہو جائے کہ اتباع خواہشات سے روکنے والی نماز کے علاوہ کوئی عمل نہیں ہے۔ (واضح رہے [illegible] مقام پر اس اولاد کو خلف کہا گیا ہے جو نالائقی کی علامت ہے ورنہ لائق اولاد کو خلف [illegible] کیا جاتا ہے)۔

ایک مقام پر اولاد ابراہیمؑ میں مختلف انبیاء کرامؑ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے انہیں قوم کا امام اور قائد قرار دیا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کریں اور ہم نے انہیں نماز قائم کرنے کی ہدایت دے دی۔"

جو اس بات کی علامت ہے کہ نماز کا حکم عام انبیاء و مرسلینؑ کے لئے تھا اور پروردگار نے اپنے کسی نمائندہ کو اس عمل خیر سے الگ نہیں رکھا ہے۔ اور اس عمل کو اس قدر جامع بنا دیا ہے کہ گویا یہ کردار صالحین کی ایک بہترین نشانی ہے کہ جہاں واقعی نماز ہے وہاں واقعی بندگی اور صلاح و تقویٰ بھی ہے اور جہاں نماز نہیں ہے وہاں اتباع خواہشات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

● عباد الرحمٰن کے تذکرہ کے طفیل میں یہ تذکرہ بھی مناسب ہے کہ پروردگار نے سورۂ نور میں بھی تسبیح کرنے والوں میں زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کے ساتھ صف میں پرواز کرنے والے پرندوں کو بھی شمار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ ان کی تسبیح اور صلوٰۃ سے [illegible]۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر تسبیح کے ساتھ صلوٰۃ کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحی نماز نہیں ہے اور نہ پرندے نماز جماعت قائم کرنے والی مخلوقات ہیں۔ اس کا ایک ہی راز ہو سکتا ہے کہ پروردگار عالم انسانیت کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ ہماری یاد اور ہماری نعمتوں کے شکریہ کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک قول اور ایک عمل۔

قول کے ذریعہ یاد خدا اور شکر نعمت کا نام ہے تسبیح۔ اور عمل کے ذریعہ ذکر خدا اور [illegible] کا نام ہے صلوٰۃ۔ صلوٰۃ صرف وہ عمل نہیں ہے جسے انسان انجام دیتے ہیں بلکہ یہ [illegible] عمل ہے جسے فضا میں اڑتے ہوئے پرندے بھی اختیار کرتے ہیں اور جسے [illegible] ہے اور وہ مظہر خدا کی معرفت [illegible] تو نہیں ہے۔ وہ ذکر خدا اور [illegible] نہیں ہوتا ہے۔

[illegible] پروردگاری عمل ہے جس کے ذریعہ اپنے مالک کو برابر یاد رکھا جا سکتا ہے [illegible]

اس کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ حی قیوم ہے اور اس کے علاوہ پس مرگ کام آنے والا کوئی نہیں ہے۔

۲۔ دعوت مسلسل

اسلام میں کسی عمل کے بارے میں اس شدت اور کثرت سے دعوت نہیں دی گئی ہے جس شدت اور کثرت سے نماز کی دعوت دی گئی ہے۔ روز و شب میں کم سے کم [illegible] مرتبہ مرد مسلمان کو نماز کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

پانچوں نمازوں کے ساتھ اذان اور اقامت، اور ہر اذان میں دو مرتبہ حی علی الصلوٰۃ، دو مرتبہ حی علی الفلاح، دو مرتبہ حی علی خیر العمل، اور ہر اقامت میں ان تینوں کلمات کے علاوہ دو مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ جو مجموعی طور پر مختلف جملوں میں ۱۴ مرتبہ اسلامیہ کو نماز کی دعوت ہے اور پھر یہ عمل پانچوں وقت دہرایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ادا کرنے کے علاوہ ہر مسلمان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ نماز سے پہلے روزانہ [illegible] مرتبہ دوسرے مسلمانوں کو نماز کی دعوت دے اور اس مرحلہ پر خود غرضی کا شکار نہ ہو کہ خود نماز پڑھ کر قرب الٰہی کا شرف حاصل کر لے اور دوسرے مسلمانوں کے بارے میں فکر بھی نہ کرے۔

اذان و اقامت کا قانون مردوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے۔ گویا اسلام نے ہر مرد اور ہر عورت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ [illegible] ہر مرد اور ہر عورت [illegible] نماز کی دعوت دے اور اس دعوت سے غفلت نہ برتے تاکہ ہر انسان پر حجت تمام ہو جائے [illegible] سے یہ احساس پیدا ہو کہ میرا پروردگار مجھے روزانہ [illegible] مرتبہ اپنی بارگاہ میں حاضری کی دعوت دیتا ہے اور میری غفلت کا یہ عالم ہے کہ میری بندگی تمام نہیں ہوتی ہے یا میرا کان بیدار بھی نہیں ہوتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اتمام حجت کا اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا ہے جس کا انتظام کیا ہے اور ہر مسلمان کے خلاف سینکڑوں مسلمانوں کو گواہ بھی بنا دیا گیا ہے کہ سب تمام

میں اس بے نمازی کو دعوت نماز دی گئی ہے اور اس نے دعوت [illegible] کو مسترد کر دیا ہے جس کے بعد حکمت پروردگار کا حق ہے کہ وہ سے سخت ترین سزا دے کہ ایک مرتبہ بلانے پر نہ آنے والا مستحق سزا قرار پا جاتا ہے تو جس بندہ کو دن اور رات میں ستر مرتبہ آواز دی جائے اور وہ توجہ نہ کرے اس سے زیادہ سزا کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر شیطان یہ وسوسہ پیدا کر دیتا ہے کہ اذان بندۂ مسلمان کی آواز ہے۔ خدا کی آواز نہیں ہے لہٰذا اسے خدائی پکار کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح تو سارا مذہب ہی ختم ہو جائے گا اور ہر قانون کے بارے میں یہ کہنے کا جواز پیدا ہو جائے گا کہ یہ براہ راست پروردگار نے نہیں کہا ہے یہ ایک بندہ کی دعوت ہے جس کا انکار یا اس سے انحراف بندہ سے انحراف ہے پروردگار سے انحراف نہیں ہے۔

[illegible] احکام [illegible] احکام الٰہیہ کی نسبت پروردگار ہی کی طرف [illegible] چاہے کسی کی زبان سے [illegible] جناب موسیٰ [illegible]

[illegible]

[illegible]

۳۔ [illegible] تقریبات

[illegible] اسلام [illegible] تقریبات [illegible] تقریبات مسرت [illegible]

اسلام نے کسی موقع پر بھی نماز کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

عید کا انتہائی پُرمسرت موقع ہے تو وہاں بھی نماز ہے اور عاشورہ کا قیامت خیز موقع ہے تو وہاں بھی نماز ہے۔ اسلام کی کسی بھی تقریب میں کچھ اعمال مقرر کئے گئے ہیں اور ان اعمال میں کوئی نہ کوئی نماز ضرور شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ انسان کے مرجانے کے بعد نماز میت واجب ہے اور دفن ہوجانے کے بعد نماز وحشت مستحب ہے۔

اسلامی تقریبات میں روزہ، زکوٰۃ، تلاوت اور زیارت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن نماز کو نہیں بلکہ بعض اوقات میں تو روزہ حرام ہے لیکن نماز وہاں بھی واجب یا مستحب ہے۔ جیسے عیدین کے موقع پر کہ اس موقع پر روزہ رکھنا حرام ہے لیکن نماز عید بہرحال موجود ہے چاہے دور حضور امامؑ میں بطور واجب ہو یا دور غیبت امامؑ میں بطور مستحب۔

اسلام کی نگاہ میں کوئی تقریب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک انسان بارگاہ الٰہی میں سربسجود نہ ہوجائے اور اس کی بے حساب نعمتوں کا بقدر امکان شکریہ ادا نہ کرے۔

اسلام کے اسی انداز فکر کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسلمان کو زندہ رہنے کا حق ہے اور نہ مرنے کا جس کی زندگی میں نماز شامل نہ ہو اور جو بارگاہ احدیت میں سر نیاز خم نہ کرسکتا ہو۔

۴۔ کثرتِ اقسام

نماز کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلامی قوانین میں جتنی قسمیں نماز کی پائی جاتی ہیں۔ اتنی قسمیں کسی اور عبادت کی نہیں ہیں۔ روزہ کے اقسام محدود ہیں۔ حج کے اقسام اس سے بھی کمتر ہیں۔ زکوٰۃ، زکوٰۃ مال اور فطرہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جہاد چار اقسام سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن نماز کے اقسام ناقابل شمار ہیں۔

اس کی ایک قسم شب و روز کے اعتبار سے ہے جہاں رات کے وقت کی نمازیں اور ہیں اور دن کے وقت کی نمازیں اور۔

ایک تقسیم واجب و مستحب کے اعتبار سے ہے کہ واجب نمازیں اور ہیں اور مستحب نمازیں اور۔

ایک تقسیم واجبات میں حیات و موت کے اعتبار سے ہے کہ زندہ کی نماز اور ہے اور مُردہ کی

نماز اور۔

ایک تقسیم ذاتی اور غیری کے اعتبار سے ہے کہ اپنی نماز اور ہے اور والدین کی نماز اور۔

ایک تقسیم ادا و قضا کے اعتبار سے ہے کہ وقت کے اندر کی نماز اور ہے اور وقت نکل جانے کے بعد کی نماز اور۔

ایک تقسیم فرض اور واجب کے اعتبار سے ہے کہ یہ نماز شریعت نے فرض کی ہے یا انسان نے نذر وغیرہ کرکے اپنے اوپر فرض کرلی ہے۔

ایک تقسیم شخصیت کے اعتبار سے ہے کہ ائمہ طاہرینؑ کی نمازیں اور ہیں اور جعفر طیارؓ کی نماز اور۔

ایک تقسیم ثواب کے اعتبار سے ہے کہ اپنے ثواب کے لئے نماز پڑھی گئی ہے یا کسی کے ایصال ثواب کے لئے۔

ایک تقسیم نعمتوں کے اعتبار سے ہے کہ ایک نماز تحصیل نعمت کے لئے نماز حاجت ہے اور حصول نعمت کے بعد نماز شکر ہے۔

ایک تقسیم دنوں کے اعتبار سے ہے کہ جمعہ کی نماز اور ہے یا عیدین اور عید غدیر وغیرہ کی نماز اور۔

اسلام میں کوئی عبادت اس قدر متنوع اور مختلف اطوار و اقسام کی حامل نہیں ہے اور مختلف التنوع نماز ہے اور یہ نماز کی عظمت کی وہ دلیل ہے جس سے بالاتر کوئی دلیل نہیں۔ اور اسی تقسیم سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جس کی زندگی میں نماز شامل نہیں ہے اس زندگی کا سرچشمہ غیر اسلامی ہے اور اسے کسی رخ سے مسلمان کہے جانے کا حق نہیں ہے۔

۵۔ سفر و ہجرت

ہر انسان اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے اور جب تک کوئی غیر معمولی سبب نہیں پیدا ہوتا وطن ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ وطن کی محبت جزو ایمان بھی ہے اور مقتضائے فطرت بھی۔ کبھی ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ انسان کو وطن بھی ترک کرنا ہوتا ہے اور ہجرت ضروری ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب

سے بالاتر کوئی مقصد سامنے آجاتا ہے اور وہ انسان کو ترک وطن پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسلام نے اس مقصد کو بھی نماز سے وابستہ کر دیا ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ جناب ہاجرہ اور اپنے کمسن شیر خوار فرزند اسماعیلؑ کو وطن سے دور ایک وادی غیر ذی زرع میں تنہا چھوڑ دیا [illegible] کا مقصد بھی یہ قرار دیا کہ یہ اس علاقہ میں نماز قائم کریں گے۔

گویا نبیوں کی نگاہ میں نماز اس قدر عظیم عمل ہے کہ اس کے قیام کے لئے وطن کو بھی خیرباد کہا جا سکتا ہے اور کسی کے عالم میں ایک بے آب و گیاہ علاقہ میں زندگی بھی گذاری جا سکتی ہے

۶۔ مقصد حکومت

اسلام جس طرح ترک وطن اور ہجرت کا مقصد نماز کو قرار دیتا ہے اسی طرح حکومت و اقتدار کا سب سے پہلا اور بنیادی مقصد نماز ہی کو قرار دیتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ پروردگار نے مظلوم افراد کو جہاد کی اجازت دے دی ہے اور وہ ان کی امداد کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ یہ مظلوم افراد وہ ہیں جنھیں بلاسبب ان کے علاقہ سے نکال دیا گیا ہے اور ان کا جرم صرف یہ ہے [illegible] کو اپنا پروردگار کہتے ہیں [illegible] پروردگار لوگوں میں بعض کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا [illegible] راہبوں کے صومعے [illegible] اور مسجدیں سب منہدم ہو جاتیں [illegible] لقد، اپنے مددگاروں کی مدد کرے گا کہ وہ صاحب قوت بھی ہے اور صاحب عزت بھی ہے۔ یہ مظلوم صاحبان ایمان وہ ہیں کہ جنھیں [illegible] اختیار دے [illegible] دیں گے تو نماز قائم کریں گے [illegible] زکوٰۃ ادا کریں گے [illegible] حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے اور تمام امور کا آخری انجام پروردگار ہی کے [illegible] آیت سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اقتدار قائم کرنے کا [illegible] نفس کی تسکین یا اپنے اختیارات کا مظاہرہ نہیں ہے۔ اس کے یہاں اقتدار کا [illegible] مصرف نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہے جس سے [illegible] جذبۂ بندگی کا اظہار [illegible] بندگان خدا سے ہمدردی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد امر و نہی کا قانون [illegible] علامت ہے کہ مسلمان اقتدار پانے کے بعد تمام انسانوں کو بندۂ پروردگار [illegible] اس راستہ پر چلانا چاہتا ہے جو پروردگار کا راستہ ہے اور جس میں زندگی [illegible]

[illegible] نچوڑ میں ڈھل جاتی ہے۔

۷۔ مقصد جہاد

قرآن مجید نے جہاد کا تذکرہ مختلف انداز سے کیا ہے۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۵۳ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ایمان والو، صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور دیکھو، راہ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو مُردہ نہ کہنا کہ وہ زندہ ہیں اور تمھیں ان کی زندگی کا شعور بھی نہیں ہے۔"

جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ میدان جنگ کی سب سے بڑی قوت کا نام ہے نماز [illegible] اس سے بہتر مجاہد راہ خدا کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ بعض روایات میں صبر کی تفسیر روزہ سے کی گئی ہے لیکن یہ صبر کا ایک مصداق ہے ورنہ صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں روزہ [illegible] شامل ہے۔ اس مقام پر پروردگار عالم کا مقصود اگر صرف روزہ ہوتا تو صبر کے بجائے [illegible] صوم استعمال کیا جاتا جس طرح کہ نماز کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ ہر میدان میں روزہ کا [illegible] بھی نہیں ہے [illegible] کا امکان بہرحال ہر صورت میں باقی رہتا ہے۔

[illegible] سورۂ [illegible] آیت [illegible] میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اگر تم ان کے ساتھ نماز قائم کرو [illegible] [illegible] ان کا دو حصوں میں تقسیم کر [illegible] [illegible] اپنے اسلحہ لئے [illegible] رہے اور پھر جب یہ نماز تمام کر کے چلا جائے تو دوسری رکعت میں دوسرا [illegible] ہو [illegible] اور وہ بھی اپنے سلحے اپنے ساتھ رکھے۔ کفار کو یہ فکر ہے کہ تم اپنے [illegible] جہاد [illegible] یکبارگی حملہ [illegible] مخصوص حالات میں [illegible] ہو لیکن [illegible] کا سامان پھر بھی ضروری ہے —— اس کے بعد جب نماز تمام [illegible] بیٹھے بیٹھے برابر ذکر خدا کرتے رہو اور جب جنگ کی طرف سے اطمینان [illegible] نماز قائم کرو کہ [illegible] صاحبان ایمان کے لئے وقت کی پابندی کے [illegible] اس میں کسی تاخیر و انتشار کی گنجائش نہیں ہے۔

[illegible] سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ [illegible] اسلام کے لئے وقت نماز کا لحاظ

رکھنا ہر حال ضروری ہے اور عین حالت جنگ میں بھی انہیں نماز قائم کرنا ہے۔ اسلامی جنگ نماز سے جدا نہیں ہو سکتی ہے ورنہ اس سے جدا ہو جائے تو اس کا نام جہاد راہ خدا نہیں ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر صرف یہ بات قابل توضیح ہے کہ اسلام نے جہاد سے پہلے بھی طور کلی نماز کا تذکرہ دیا ہے اور جہاد کے دوران اور اس کے خاتمے کے بعد بھی نماز کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے قیام پر زور دیا ہے اور اس سے صرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز اور جہاد کو ساتھ ساتھ رہنا چاہیئے اور ان میں جدائی نہیں ہو سکتی ہے لیکن نماز جہاد کے لئے ہے یا جہاد نماز کے لئے؟ اس امر کی مکمل وضاحت نہیں کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب میدان صفین میں مولائے کائنات نے عین حالت جنگ میں مصلیٰ بچھا دیا تو ابن عباس جیسے معروف مفسر قرآن نے بھی یہ سوال اٹھا دیا کہ یہ جنگ کا وقت ہے نماز کا وقت نہیں ہے۔ گویا نماز جنگ کا مقدمہ ہے، اور جنگ خطرہ میں پڑ جائے تو نماز کو ٹالا جا سکتا ہے۔ لیکن امیر المومنینؑ نے فوراً ٹوک کر فرمایا کہ "انما نقاتلهم علی الصلوٰۃ" ہماری جنگ اسی نماز کے بارے میں ہو رہی ہے۔ نماز جنگ کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ جنگ کا مقصد ہے — اور یہی وجہ ہے کہ جب مجاہد راہ خدا کی ضریح کا طواف کرتا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی ہے" یعنی آپ نے مقصد جنگ کو حاصل کر لیا ہے اور میدان جہاد کو جیت لیا ہے۔

حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان کے مقابلہ میں امیر المومنینؑ کا یہ جملہ نہایت معنی خیز ہے۔ ایک طرف معاویہ اہل کوفہ سے خطاب کر کے اعلان کر رہا ہے کہ "میری جنگ نماز، زکوٰۃ اور حج کے لئے نہیں ہے کہ تم یہ اعمال انجام دے رہے ہو۔ میری جنگ صرف حکومت کرنے کے لئے ہے اور میں تمہاری گردنوں پر حکمرانی کرنا چاہتا ہوں" اور دوسری طرف امیر المومنینؑ واضح کرتے ہیں کہ معاویہ اہل کوفہ کی نماز کو نماز نہیں سمجھتا ہے — لیکن ہم معاویہ کی نماز کو نماز نہیں سمجھتے اور اسی لئے اس سے نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں — نماز اسلام میں مقصد حکومت اور مقصد جہاد بھی ہے۔ نماز کے بغیر حکومت اسلامی کہے جانے کے قابل ہے نہ جہاد جہاد رہ جاتا ہے۔

۸۔ منع فساد

اسلام نے چار طرح کے اعمال کو شیطانی اعمال اور خباثت نفس سے تعبیر کیا ہے:

(۱) شراب (۲) جوا (۳) انصاب (۴) ازلام

شراب عقلی فساد ہے اور جوا مالی فساد۔ انصاب و ازلام میں علمی و اعتقادی فساد پایا جاتا ہے کہ انسان اس ہستی کو بھی نہیں پہچانتا ہے جس نے وجود دیا ہے اور جس کی راہ میں قربانی دی جا سکتی ہے۔

لیکن ان چاروں میں بھی شراب کو "ام الخبائث" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا راز بیان کیا گیا ہے کہ انسان جب تک ہوش و حواس میں رہتا ہے اس سے شرافت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہوش و حواس کے گم ہو جانے کے بعد کسی شرافت کی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ ہر قسم کے اعمال انجام دے سکتا ہے۔ جوئے سے بچنے کا دارومدار عقل و ہوش ہی پر ہے اور اس کے فقدان کے بعد ہر قسم کے جرم کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے [illegible] ہر طرح کی خباثت کو ممکن بنا دے اسے "ام الخبائث" کے علاوہ کوئی دوسرا نام [illegible] سکتا ہے — لیکن قرآن حکیم نے "ام الخبائث" کی خباثت کی توضیح اس انداز سے [illegible] شیطان شراب اور جوئے کے ذریعہ عداوت اور دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ (اور [illegible] سے روک دے اور شراب میں ہوش و حواس کی گمشدگی [illegible] تمہیں یاد خدا [illegible] چاہتا ہے تو کیا تم نماز سے رک جاؤ گے" (مائدہ ۹۱)

[illegible] سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شراب اور جوئے میں تین قسم کے مفاسد پائے [illegible] عداوت، یاد خدا سے غفلت اور نماز کی طرف سے بے توجہی — ظاہر ہے کہ باہمی [illegible] سب ہے اور یاد خدا دونوں سے غفلت اخروی و دنیوی فساد ہے۔ [illegible] سب سے بڑا فساد ہے کہ اس کا تذکرہ علیحدہ سے کیا گیا [illegible] یاد خدا کا ایک مصداق ہے اور اسے یاد خدا ہی کے لئے واجب کیا گیا ہے۔ [illegible] تردید کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] محفوظ رکھنا ہے تو نماز کو قائم

برائیوں سے روکے رکھتی ہے۔

نماز میں طہارت کی شرط انسان کو نجاست کثافت اور خباثت سے الگ رہنے کا سبق دیتی ہے۔

وضو کے پانی، نماز کی جگہ، نمازی کے لباس میں جائز ہونے کی شرط انسان کو حرام خوری اور غصب جیسے جرم سے محفوظ بناتی ہے۔

خاک پر سجدہ کرنے کی تعلیم انسان کو خاکساری کا سبق دیتی ہے۔

وقت کی پابندی انسان کو وقت کی اہمیت کا پتہ دیتی ہے اور وقت ضائع کرنے سے روکتی ہے۔

قبلہ کی شرط انسانی زندگی کو ایک رخ پر لے جانا چاہتی ہے اور اس کی زندگی کو دورخی سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔

ذکر خدا کی شرط انسان کی زبان کو بدکلامی، فحش کلامی اور لغویات سے روکنا چاہتی ہے جیسے روزے کی پابندی انسان کو جذبات پر کنٹرول کرنا سکھاتی ہے اور سخت ترین حالات سے بھی مقابلہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

کلام بشر کی پابندی اخلاص عمل کا سبق دیتی ہے کہ جو شخص بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے اسے کلام کرنے کا حق نہیں ہے تاکہ انسان میں جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ در حقیقت ہمیشہ خداوندی میں حاضر ہے تو کسی وقت بھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی کلام نہ کرے۔

اذان اور اقامت کا استحباب انسان کو دعوت عمل کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ مرد مسلم [illegible] اور خود غرضی کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ جب بھی کسی راہ خیر میں قدم [illegible] دوسرے افراد کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے اور ببانگ دہل دعوت دے۔

نیت قربت کی شرط انسان کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطن کو بھی پاک بنانا [illegible] نیت کے بغیر کوئی بھی عمل عبادت کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

قیام کی شرط انسان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے اور استقامت عمل [illegible]

کر رہا ہو گا اور جس معاشرہ میں حقیقت نماز نظر انداز ہو جائے گی اس سے فساد کے علاوہ کسی امر کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

۹۔ ترک نماز محرک فساد

مذکورہ بالا بیان کی مزید توضیح سورۂ مریم کی ان آیات سے ہوتی ہے جن میں جناب ابراہیمؑ، جناب اسحاقؑ، جناب یعقوبؑ، جناب اسماعیلؑ، جناب موسیٰؑ، جناب ہارونؑ، جناب ادریسؑ جیسے جلیل القدر انبیاء کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی ناخلف اولاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان انبیاء کرام کے بعد ایسی نسل بھی عالم وجود میں آگئی جس نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی شروع کر دی اور وہ عنقریب اپنی گمراہی کا نتیجہ برداشت کریں گے۔

جس سے صاف ہو جاتا ہے کہ خواہشات کی پیروی کے امکانات نماز ترک کرنے اور ضائع کر دینے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ جب تک انسان نماز کی پابندی کرتا رہتا ہے نماز اسے خواہشات کے اتباع سے روکتی رہتی ہے۔ کیسی ہوتی بات ہے کہ صبح سے رات تک دن [illegible] پروردگار کی بارگاہ میں حاضری دینے والا انسان اس قدر جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ اس نے [illegible] میں خواہشات کو مقدم کر دے اور اس کے احکام کے سامنے خواہشات کا اتباع کرنا شروع کر [illegible] نماز کا جزء لازمی عنصر ہے "قصد قربت الٰہی" اور قربت الٰہی کا طلبگار کسی بھی عالم [illegible] حاصل نہیں ہو سکتا ہے جو بارگاہ الٰہی سے دور تر بنا دے اور اس کے قرب کی راہ میں حائل [illegible]

۱۰۔ نماز مانع منکرات

اکیسویں پارہ کے آغاز میں ارشاد ہوتا ہے کہ "پیغمبر جو کتاب بذریعہ وحی آپ پر نازل کی گئی ہے اس کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں کہ نماز ہر طرح کی برائی اور بدی سے روکنے والی ہے اور ذکر خدا سب سے بڑی شے ہے۔"

اس آیت کریمہ میں گذشتہ آیات کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ انسان نماز [illegible] ہو جاتا ہے تو خواہشات کی پیروی شروع کر دیتا ہے اور نماز کا پابند ہو جاتا ہے [illegible]

نماز میں رکوع اور سجدہ کی پابندی انسان کو اللہ اور حقیقی معبود ہستی کے سامنے جھکنے کا سبق دیتی ہے تاکہ معمولی جاہ و مال دنیا کو دیکھ کر ان میں غرور نہ پیدا ہو جائے اور وہ یادِ خدا سے منحرف نہ ہو جائے۔

نماز میں سلام کی شرط بھی اس احساس کو بیدار کرتی ہے کہ جن عبادتوں کے ذریعے دولت نماز حاصل ہوتی ہے یا جنہوں نے اس راہ میں ہم سے پہلے قدم رکھا ہے انہیں نظر انداز نہ کیا جائے اور رخصت ہوتے ہوتے انہیں بھی ایک سلام کر لیا جائے۔

نماز کا پورا ڈھانچہ انسان کی زندگی کو ایک پاکیزہ ترین سانچے میں ڈھالنے کے لئے تیار کیا گیا ہے اور اس کے احکام پر غور کرنے والا اس حقیقت کا بخوبی ادراک کر سکتا ہے کہ نماز انسان کو ہر طرح کی برائی سے روکنے والی ہے بلکہ نمازی کے اعمال میں ریاکاری کا بھی کوئی امکان نہیں ہے بشرطیکہ اس کی نماز نماز ہو اور واقعی نماز ہو۔

۱۱۔ جنگ با شیطان

سورۂ مائدہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعہ انسان کو نماز سے غافل بنانا چاہتا ہے اور اسے یادِ خدا سے دور کر دینا چاہتا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ نماز شیطنت کے ساتھ ایک معرکہ اور مقابلہ ہے جب شیطان انسان کو نماز سے غافل بنانا چاہتا ہے اور انسان یادِ خدا کو دل میں جگہ دے کر شیطان کو شکست دینا چاہتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ مسجد میں مرکزی جگہ کا نام ہے "محراب" جہاں انسان اسی کے ساتھ مشغول جہاد رہتا ہے اور نماز کے اختتام پر یہی جنگ کا مقصد سامنے آتا ہے کہ اگر صحت و سلامتی کے ساتھ تمام ہو گئی تو گویا شیطان شکست کھا گیا۔ اور اس کے ارکان و واجبات میں فرق آ گیا یا نیت میں ریاکاری شامل ہو گئی تو گویا شیطان نے میدان جیت لیا اور مرد مسلمان شکست سے دوچار ہو گیا۔

اس حرب و ضرب کا بہترین مرقع اس دن دیکھنے میں آیا جس دن امام سجاد نے نماز شروع کی اور شیطان نے سانپ کی شکل اختیار کر کے پیر کے انگوٹھے کو چبانا شروع کیا۔

جب آپ کے اخلاص عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا تو اس نے شکست کا اقرار کر لیا اور گویا اپنے دور ان کے اقرار کو دہرانے پر مجبور ہو گیا کہ "میں سب کو گمراہ کروں گا لیکن عباد مخلصین کو گمراہ نہیں کر سکتا" اور یہ بندہ خدا مخلصین میں شامل ہے۔ اس کے بعد لوگوں کی پاکیزگی کا عنوان واضح ہو گیا جس کی وضاحت آیت تطہیر میں کی جا چکی ہے۔

کتنی بڑی بات ہے کہ جب ابلیس جیسا دشمن بھی شکست کا اقرار کرے تو غیر ممکن ہے کہ رحمت نبی کو جوش نہ آئے اور ادھر سے "انت زین العابدین" کا اعلان نہ ہو جائے۔

۱۲۔ علامت مردانگی

سورۂ نور کی آیت ۳۶ میں نورِ الٰہی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ نورِ الٰہی ان گھروں میں ہے جن کی رفعت کا حکم دیا گیا ہے اور جن میں صبح و شام وہ لوگ تسبیح پروردگار کرتے رہتے ہیں جنہیں تجارت یا خرید و فروخت یادِ خدا اور نماز سے غافل نہیں بنا سکتی ہے اور وہ اس دن سے خوفزدہ رہتے ہیں جس دن قلب و نگاہ پلٹ جائیں گے۔ تاکہ خدا انہیں ان کے عمل کی بہترین جزا دے اور اپنے فضل سے اضافہ بھی کر دے۔ اور وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کر دیتا ہے۔"

آیت مبارکہ میں ان افراد کو لفظ "رجال" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو قرآن مجید کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور جسے کبھی ان لوگوں کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے جو عہدِ الٰہی کو پورا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور کبھی ان افراد کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے جنہیں اعراف پر کھڑا کیا جائے گا اور وہ تمام گذرنے والوں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیں گے۔ اور کبھی اس لقب سے ان بندوں کو یاد کیا گیا ہے جو طہارت کو پسند کرتے ہیں کہ خدا بھی طہارت والوں کو پسند کرتا ہے" (توبہ ۱۰۸) اور کبھی مرسلین کی رسالت و نبوت کے اعلان کے لئے اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

رجال، اس لفظ کی تعبیر اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کی نگاہ میں اگر میدانِ جہاد میں ظاہر ہو کر راہِ خدا میں جان دے دینا مردانگی کی علامت ہے تو نماز سے غافل

نہ ہونا بھی بہت بڑی مردانگی کی علامت ہے کہ شیطان جیسے مشّاق عمل میں سے مسدود کرتا ہے۔
اس کے بعد میدانِ جہاد سے فرار کی دعوت دیتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جو خدا میں جہاد کا مسئلہ یاد نماز سے مختلف نہیں ہے اور اسلام میں جہاد کا مقصد بھی نماز کا قیام ہی ہے لہٰذا جو شخص نماز کو یاد رکھے گا وہ آخری سانس تک قیام بھی کرے گا ورنہ یادِ خدا سے غافل ہو کر میدانِ جہاد سے فرار اختیار کرے گا۔

۱۲۔ وسیلۂ شکر

عقل و مذہب دونوں کا تقاضا ہے کہ انسان نعمتِ پروردگار کا شکریہ ادا کرے کہ شکرِ منعم ایک قانونِ عقلی بھی ہے اور فریضۂ مذہبی بھی۔

اس کے مختلف درجات و ذرائع ہیں۔ کبھی یہ شکریہ زبان سے ادا کیا جاتا ہے اور کبھی اعمال سے۔ کبھی اس کے لئے صرف عمل کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور کبھی پورے وجود کی قربانی دی جاتی ہے۔ جیسی نعمت ہوتی ہے اسی کے اعتبار سے شکر ادا کیا جاتا ہے۔

پروردگار نے جب حبیب کے سینے پر بعض نعمتیں نازل کی ہیں [illegible] ہر نعمت کا الگ الگ تعین کیا ہے۔ اگر یتیمی کے دور میں پناہ دی ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ کوئی یتیم سامنے آجائے تو جھڑکیں نہیں۔ اور اگر غربت میں مالدار بنایا ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ سائل سامنے آئے تو اسے جھڑکیں نہیں۔ اور اگر عالمِ غربت و بیکسی میں متعارف کرایا ہے تو اس کا شکریہ یہ ہے نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہیں۔

لیکن ان تمام نعمتوں سے الگ ایک عظیم ترین نعمت ہے جسے پروردگارِ عالم [illegible] تعبیر کیا ہے۔ جس کا مشاہدہ دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے اور جس کے [illegible] خیر شامل ہو جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی نعمت کے مقابلہ میں شکریہ بھی اسی معیار کا [illegible] سے ارشاد ہوا کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اپنے پروردگار کے لئے نماز قائم [illegible] دو۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے بالاتر کوئی وسیلۂ شکر نہیں ہے اور نماز کے شکریہ کی مصداق ہے [illegible] جس کا قولی اظہار نماز کے [illegible]

عملی اظہار خون دینے کے ذریعہ۔

۱۳۔ علامتِ ایمان بالغیب

سورۂ مبارکۂ بقرہ میں ابتدائی طور پر اس حقیقت کا اعلان کیا گیا کہ قرآن سے استفادہ اور ہدایت بغیر تقویٰ کے ممکن نہیں ہے اور اس کا فائدہ صرف انھیں افراد کو ہوگا جو متقی ہوں گے۔ اس کے بعد متقین کا تعارف کرایا گیا کہ متقین وہ افراد ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان کا ایمان محسوسات و مشاہدات تک محدود نہیں ہے۔ اس کے بعد ایمان بالغیب رکھنے والوں کا تعارف کرایا گیا کہ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور رزقِ خدا سے راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں۔

اس اندازِ بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید سے کما حقہ ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ تقویٰ ہے جس سے ایمان بالغیب کا سلسلہ ہموار ہوتا ہے اور ایمان بالغیب سے تقویٰ کا کمال حاصل ہوتا ہے اور اس کے بغیر قرآنِ مجید سے مکمل ہدایت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ بات واضح بھی ہے کہ نماز کی [illegible] ہے جس کا دار و مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ وہ [illegible] سے غائب ہے [illegible] کو [illegible] حاصل نہیں ہے تو اس کے واقعی نمازگزار [illegible] کا کوئی مفہوم نہیں ہے [illegible] رکوع و سجود تو کر [illegible] نہیں کر سکتا۔

۱۴۔ ملاقات با محبوب

[illegible] اخلاص کے ساتھ [illegible] اس موقع پر واضح شدہ [illegible] حاضری نہیں ہے بلکہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری ہے جہاں [illegible] کی حمد [illegible] اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا ہے [illegible] ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندۂ خدا ہے جو معبود کی بارگاہ میں کھڑا ہے [illegible] کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہے اور یہ ایک ایسی محبت کا جذبہ ہے [illegible] سے آیا ہے۔ نماز کی اسی عظمت کا احساس انسان کو ایک عجیب و غریب لذت

سے کسی انسان دیتا ہے اور اس کے بعد انسان اس وقت تک مصلیٰ ترک نہیں کرتا ہے جب تک محبوب خود نہ کہہ دے کہ تھوڑی دیر آرام کر لیا کرو اور تمام وقت عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ وسیلۂ اطمینان قلب

اہل زمانہ نے اطمینان قلب کے لئے بے شمار وسائل مہیا کئے ہیں، بعض افراد کے نزدیک دولت اطمینان قلب کا وسیلہ ہے اور بعض کے نزدیک اقتدار۔

بعض اولاد کو سکون و اطمینان کا وسیلہ سمجھتے ہیں، اور بعض وسائل زندگی کو۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سارے امور اگر ایک طرف اطمینان قلب کا ذریعہ ہیں تو دوسری طرف بے شمار پریشانیوں کا پیش خیمہ بھی ہیں۔

دولت و اقتدار کا نہ ہونا ایک پریشانی ہے اور محفوظ رہنا دوسری پریشانی۔ اولاد اور وسائل زندگی کا فراہم ہونا ایک سبب اضطراب ہے اور ان کا رہ جانا دوسرا سبب اضطراب۔

اس کے مقابلہ میں قرآن مجید نے ایک ایسے وسیلۂ اطمینان کی نشاندہی کی ہے جس میں کسی طرح کا اضطراب در منظر نہیں ہے۔ اور وہ ہے ذکر خدا۔

ذکر خدا اگرچہ ایک عام مفہوم ہے اور بعض مقامات پر نماز کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ نماز سے بہتر یاد خدا کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نماز اللہ اکبر سے شروع ہو کر تعقیبات میں اللہ اکبر ہی پر تمام ہوتی ہے اور پھر ہر حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں تکبیر کا استحباب ہے۔ جو اس امر کی علامت ہے کہ نماز سے بہتر ذکر خدا کا کوئی وسیلہ نہیں ہے اور سورہ مبارکہ جمعہ میں نماز کو ذکر خدا ہی سے تعبیر کیا گیا ہے "جب جمعہ کے دن نماز کے لئے بلایا جائے تو کاروبار چھوڑ کر ذکر خدا کے لئے دوڑ پڑو" یہ ذکر خدا حقیقتاً نماز جمعہ ہی ہے جس کا ایک عنصر خطبۂ جمعہ ہے جس میں یاد خدا کی نصیحت کی جاتی ہے اور بندہ کے ذہن میں معبود کا تصور راسخ بنایا جاتا ہے۔

نماز ذکر خدا کا واضح ترین مصداق ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز سے بہتر اطمینان قلب

کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم کی تاریخ میں نقل کیا گیا ہے کہ جب آپ کو کوئی خاص پریشانی لاحق ہوتی تھی تو مصلائے عبادت پر آجاتے تھے اور مشغول نماز ہو جاتے تھے۔

نماز کی ترتیب و ترکیب بھی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ نماز اطمینان قلب کا بہترین سہارا ہے۔ پروردگار نے صبح کی نماز دن نکلنے سے پہلے رکھی ہے کہ بندہ خدا کی بارگاہ میں حاضری دے کر اس سے طلب امداد کر کے گھر سے باہر نکلے تاکہ اطمینان رہے کہ میں تنہا نہیں ہوں اور میرے ساتھ میرا مددگار پروردگار بھی ہے۔

اس کے بعد جب کاروبار سے تھک کر گھر آئے تو پھر مصلیٰ پر آجائے اور زندگی کے دوسرے دور کے لئے طلب امداد کرے اور گذشتہ حالات کا درد دل بھی بیان کر دے۔

یہی کیفیت نماز مغرب کا دوسرا دور ختم کرنے کے بعد ہوگی اور اس کے بعد بستر پر جاتے ہوئے اور بستر سے اٹھنے کے بعد یہ تصور کہ اپنے پاس ایک علیم و دانا اور قادر و توانا ہستی موجود ہے جس سے درد دل کہا جا سکتا ہے اور بڑی سے بڑی مدد مانگی جا سکتی ہے۔ انسان کے دل کو اس قدر مطمئن بنا دیتا ہے کہ جو اطمینان نہ دولت و اقتدار سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ وسائل و اولاد سے۔

نماز ایک بہترین وسیلۂ اطمینان ہے۔ بشرطیکہ انسان اس کی اہمیت سے باخبر ہو اور اسی منصوبہ کے ساتھ اسے ادا کرے۔ ورنہ کسل مندی کے ساتھ بار بار کی ادائیگی کے لئے اٹھنے والی نماز مزید اضطراب حیات پیدا کر سکتی ہے سکون نہیں دے سکتی ہے۔

۲۷۔ مجسمہ ایمان

پروردگار عالم نے سرکار دو عالم کی ولادت کی مدنی زندگی کے کچھ زمانے کے بعد بیت المقدس [illegible] کا حکم دے دیا اور حضور نے رخ بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف موڑ دیا۔ جو بظاہر ایک معمولی واقعہ تھا لیکن اس کے اثرات بے شمار تھے۔

جن میں ایک اثر یہودیوں کا یہ ہنگامہ بھی تھا کہ مسلمانوں نے قبلہ سے کیوں انحراف کیا ہے؟ اگر وہ قبلہ صحیح تھا تو اسے تبدیل کیوں کر دیا؟ اور اگر وہ غلط تھا تو اب تک کی پرانی نمازیں [illegible] ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا پیغمبر کی ذات پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن

مسلم اور غیر مسلم ممتاز ہو گئے تھے ورنہ ان کے بغیر یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ قبلہ اسی مدینے کی طرف رکھا جائے اور اس کا قصد کیوں کیا جائے جبکہ اس سے پہلے ہو گیا ہے یا سے قبلہ میں کون سا حسن پایا جاتا ہے کہ جسے ترک کر کے اسے اختیار کیا گیا ہے

پروردگار عالم نے اس کا جواب دو عبارت دیا ہے اور ان دونوں اعتراض کرنے والے اور شقے اٹھانے والے دونوں کو سفیہ اور بیوقوف قرار دیا ہے تاکہ مسلمانوں کو اطمینان ہو جائے کہ احکام الٰہیہ پر اعتراض کرنا شعوری نہیں ہے بلکہ حماقت ہے اور جیسے عقل عطا کرنے والا اس سفیہ اور کم فہم دیکھے تو اس کے ناقص ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی یہ متوجہ کر دیا کہ یہ ایک طرح کا امتحان بھی جس سے تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم میں کون عادت کا بندہ ہے اور کون عبادت کا بندہ ہے۔

کس کی نظر میں سمت کی اہمیت ہے اور کس کے خیال میں طرف کی اہمیت ہے اور کون ہر حال میں اطاعت پروردگار کرنا چاہتا ہے۔

کون احکام الٰہی کو پروردگار کی عظمت کی بنا پر تسلیم کرتا ہے اور کون اپنے تجربہ یا سمجھ و شعور کی بنیاد پر

کس کے خیال میں بیت المقدس یا کعبہ کی عمارت ہے اور کون صاحب خانہ کی عظمت پر نگاہ رکھتا ہے۔

کون سرکار دو عالم پر ایمان مطلق رکھتا ہے اور کون ان کے بارے میں بھی سہو و نسیان اور غلطی اور خطا کا احساس رکھتا ہے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسئلہ بہرحال تھا کہ پرانی نمازوں کا کیا ہوگا ... اور انہیں کالعدم تصور کیا جائے گا یا دوبارہ ادا کرنا ہوگا؟

پروردگار نے اس مسئلہ کو ان الفاظ میں حل کیا کہ "اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کر سکتا ہے" جس کے بارے میں عام مفسرین کا بیان ہے کہ اس بیان سے مراد سابقہ نمازیں ہیں ... جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے نماز کو مجسم ایمان قرار دیا ہے اور یہی بات صحیح بھی ہے جس کی وضاحت صادق آل محمد نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "ایمان اور کفر کے درمیان ترک نماز کے علاوہ

کوئی فاصلہ نہیں ہے ... نماز رہے تو ایمان بھی ہے اور نماز نہیں ہے تو حقیقت ایمان بھی نہیں ہے صرف ظاہری اسلام ہے اور درحقیقت کفران نعمت پروردگار۔!

۸۰۔ معیار خشوع

اسلام نے بارگاہ احدیت میں خضوع و خشوع کی اس قدر ہمت دی ہے کہ یہی احساس ذلت عبودیت اور عزت ربوبیت کا بہترین مظہر ہے۔ خضوع و خشوع کے درمیان بھی خشوع کی اہمیت زیادہ ہے کہ خضوع ظاہری تواضع کا نام ہے اور خشوع باطنی تواضع اور تذلل کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قلب کے مسائل اعتقاد و جوارح کے مسائل سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

سورۂ مبارکہ بقرہ آیت ۴۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگو اور یہ نماز عام لوگوں کے لئے بہت سخت اور گراں ہے علاوہ ان افراد کے جو خاشعین ہیں اور جن کا خیال یہ ہے کہ انہیں پروردگار سے ملاقات کرنی ہے اور پلٹ کر اسی کی بارگاہ میں جانا ہے"

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کے دل کے اندر خشوع پایا جاتا ہے تو نماز ایک لذت آمیز عمل ہے اور اس میں روحانی سکون و راحت کی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن اگر دل کے اندر خشوع نہیں ہے تو نماز ایک مصیبت اور تکلیف ہے جس سے زیادہ کچھ نہیں ہے جس کے بعد بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے خشوع قلب کا اندازہ کرنا ہے تو اس کی کیفیت نماز پر توجہ دو۔ نماز میں سکون و راحت اور لذت و مسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے تو انسان خاشعین میں ہے اور یہ نہیں ہے تو انسان خاشعین میں نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہے کہ سورۂ مومنون میں کامیاب کو انہیں افراد میں منحصر قرار دیا گیا ہے جو نماز میں خشوع کی کیفیت رکھتے ہیں ورنہ باقی افراد نمازی ہیں خاشعین نہیں ہیں۔

نماز کی لذت کا اندازہ کرنا ہے تو ان افراد کا کردار دیکھنا ہوگا جن کا یہ عالم رہا ہے کہ رات بھر مصلے پر کھڑے رہیں اور پیروں سے تیر نکال لیا جائے اور درد کا احساس نہ ہو ملک گردن پر تلوار بھی چل جائے تو خشوع میں فرق نہ آنے پائے۔ انہیں سانپ بل کر گذر بھی جاتا ہے تو کسی قسم کا احساس نہ ہو اور سبحان ربی الاعلی ہی رہے۔!

۱۹۔ معراجِ مومن

اسلامی زبان میں معراج اس واقعہ کو کہتے ہیں جب سرکارِ دوعالم فرشِ خاک سے قربِ الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے عرشِ اعظم تک پہونچ گئے اور ساتوں آسمانوں کو پیچھے چھوڑ دیا جس کے بعد ایک طرف بندہ تھا اور ایک طرف معبود ۔ درمیان میں حجاب تک نہ تھے اور کلمات محبت و عطوفت۔

ظاہر ہے کہ عام انسان کے لئے اس منزل کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں ہے، اس کے حالات اور کیفیات کا اندازہ کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی روایات نے اس نکتہ کی نشاندہی کی ہے کہ سرکارِ دوعالم جب معراج سے واپس تشریف لائے تو آپ نے امت کے لئے تحفہ نماز رکھ دیا جس کے بعد ہر بندہ بھی ایک معراجی کیفیت پیدا کر سکے۔ اور علمائے اسلام نے اس کی تفسیر یوں اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح سرکارِ دوعالم نے منزلِ معراج تک پہنچنے کے لئے ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے کی تھیں۔ اسی طرح ایک نمازی کو منزلِ نماز تک پہنچنے کے لئے ہفت آسمان طے کرنا پڑتے ہیں۔

۱۔ پہلے وقتِ نماز کی تشخیص کرتا ہے۔
۲۔ اس کے بعد قبلہ کا تعین کرتا ہے۔
۳۔ اس کے بعد اپنے لباس کا جائزہ لیتا ہے۔
۴۔ اس کے بعد ہی جگہ کی کیفیت کا اندازہ کرنا ہوتا ہے۔
۵۔ اس کے بعد طہارت کے مسائل طے کرنا ہوتے ہیں۔
۶۔ اس کے بعد اذان دی جاتی ہے۔
۷۔ اس کے بعد اقامت کے ذریعہ مکمل آمادگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اور اس طرح ساتوں مرحلوں کے بعد سرحدِ نماز میں قدم رکھنے کی نوبت آتی ہے۔ یہ سات مراحل دیکھنے میں تو بہت آسان ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان کے مسائل میں تدقیق کرنے والا جانتا ہے کہ یہ پوری زندگی کے تجربہ کا عمل ہے جو چند منٹوں میں انجام پا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور سفرِ معراج شروع ہوتا ہے جو بندے کو ہفت مراحل طے کرا کے اس کو قرب کی اس منزل عرشِ اعظم تک پہونچا دیتا ہے۔ ان ہفت مراحل میں پہلے نیت کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے جس میں اخلاص اور ریا کا فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ قربِ الٰہی کا تصور پیدا کیا جاتا ہے۔ غیر اللہ سے صرف نظر کرنے کی ہمت پیدا کی جاتی ہے اور اول سے آخر تک اس نیت کو باقی رکھنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس کے بعد قیام کا مرحلہ ہوتا ہے جو ایک بندہ خاشع کی حاضری کی بہترین کیفیت اور جس سے ہر طرح کی کسمپرسی کی عکاسی ہوتی ہے۔

۳۔ قیام کے بعد ذکر ہی شروع ہوتا ہے جو سفرِ معراج کا بہترین توشہ ہے کہ مسافر کی یاد خدا سے بہتر نہ وسیلہ اطمینان ہے اور نہ سامانِ سفر۔

۴۔ قیام و ذکر کے بعد خضوع و خشوع کا پہلا مظاہرہ رکوع کی شکل میں ہوتا ہے۔

۵۔ رکوع کے بعد خضوع کا آخری مرحلہ سجدہ کے ذریعہ طے ہوتا ہے جہاں "سجدہ کر اور قرب حاصل کر" کا مصداق سامنے آجاتا ہے۔

۶۔ قربِ الٰہی کی اس عظیم منزل پر جانے کے بعد توحید و رسالت کی گواہی دیکر آل رسول پر دعائے رحمت کی جاتی ہے۔

۷۔ تشہد کے قرب آمیز مرحلہ کو طے کرنے کے بعد انسان اس بارگاہ عزت تک پہونچ جاتا ہے جہاں وہ تمام پیشرو حضرات موجود ہیں جو اس سے پہلے تقرب کی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ یہیں جب معراج رسول اکرم کو سلام کیا جاتا ہے اس کے بعد تمام علماء صالحین کو سلام کیا جاتا ہے اور سلام کے ساتھ رحمت و برکت الٰہی کی پیشکش کی جاتی ہے، اور اس طرح یہ سفرِ معراج تمام ہو جاتا ہے اور انسان گویا دوبارہ اپنی منزل پر واپس آجاتا ہے اور شاید اسی لئے ہر مومن سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے واپسی کے موقع پر سنتِ اسلام و علیکم سلام سے ملاقات کرے گویا اس سے ملنا چاہتا ہے کہ وہ سلسلہ یہیں تھے لیکن عرش تک پہونچ گئے اور سفر کو منزلیں طے کر کے واپس آ گیا ہے۔

۲۰۔ مخلوق شناسی

انسانی زندگی میں صبح و شام کا مشاہدہ ہے کہ پستی میں رہنے والا بلندی کے حالات سے باخبر نہیں ہوتا ہے لیکن بلندی پر رہنے والا پستی کے حالات کا برابر مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ دامنِ کوہ کے باشندہ کو بالائے کوہ کی خبر نہیں ہوتی ہے اور پہاڑ کے اس پار کا کوئی نظارہ رکھتا ہے لیکن بلندیٔ کوہ تک پہونچ جانے والا بلندی کی بھی اطلاع رکھتا ہے اور دونوں طرف دامنِ کوہ کے حالات کا بھی مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔

دورِ حاضر میں ملکی اور عالمی حالات معلوم کرنے کا یہی واحد مادی ذریعہ ہے کہ کیمرے اور ڈش بلندی پر نصب کئے جاتے ہیں اور دوسرے ملک یا ساری دنیا کے حالات کا جائزہ لے لیا جاتا ہے اور بوقت ضرورت بقدر ضرورت متعلقہ افراد کو باخبر بھی کر دیا جاتا ہے۔

سلام ہے سرکار دو عالم کو معراج مومن بنا کر اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اگر انسان نماز کی بلندیوں تک پہونچ جاتا ہے جہاں سے سارے عالم کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور سب کے پوشیدہ حالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

روحانی اور معنوی دنیا سے دور رہنے والے افراد تعجب ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ دوسرے حجروں میں زندگی گذارنے والا انسان جاسوسی کے مراکز میں طے ہونے والے منصوبوں سے کس طرح باخبر ہو جاتا ہے اور ان کی کاٹ کس طرح تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن روحانی دنیا میں زندگی گذارنے والوں کو اس امر سے کوئی تعجب نہیں ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان "پیر حضرت" کے پاس ایک الٰہی راڈار ہے جو معراج کی بلندیوں پر نصب کیا گیا ہے جس سے ساری دنیا کے حالات کا ہر وقت جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ اس سے کوئی بات راز نہیں رہ سکتی ہے۔ اور ان کے پاس یہ مستقل آلہ موجود ہے جو دن رات صبح و شام کسی وقت بھی اور کسی موسم میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اس میں کسی خاص عبادت کی قید بھی نہیں ہے۔

سرکار دو عالم نے سچ فرمایا تھا کہ "مومن کی فراست سے ہوشیار رہنا [illegible] چاہئے۔ وہ ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ نور خدا سے مشاہدہ کرتا ہے اور نور خدا [illegible]

کی پابندیوں میں اسیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

۲۱۔ وسیلہ تحقیر دنیا

بلندیوں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہاں تک پہونچ جانے والے کو دنیا کی ہر شے حقیر دکھائی دیتی ہے جس کا تجربہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے برابر کرتے رہتے ہیں کہ جیسے جیسے جہاز بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے اور جس قدر بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو عمارت سو منزلہ نظر آتی ہے وہ بلندی پر جانے کے بعد ایک ماچس کا ڈبہ دکھائی دیتی ہے اور انسان کی نگاہ سے ہر شے کی بلندی کا احساس مٹ جاتا ہے اب وہ خود اپنے کو ان بلندیوں پر دیکھ رہا ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی بلندیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب انسان کی بلندی ۳۰۔۴۰ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے ورنہ اس کے بعد پرواز کرنے والوں کا عالم اس سے بھی مختلف ہوگا۔ انھیں پورا ملک ایک نقطہ کے مانند نظر آئے گا اور پوری کائنات سمٹی ہوئی دکھائی دے گی جب کہ یہ بلندی بھی اسی نقطہ سے صعود کی ہے جو زمین یا چاند کے ارد گرد ہے۔ اب اگر کوئی انسان ہفت آسمان کے اس پار معراج کی بلندی پر پہونچ جائے تو اس کی نگاہ میں اس دنیا کی کیا حقیقت رہ جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ معراج حقیقی کی منزل پر جانے والے سے جب یہ کہا گیا کہ جو چاہو مانگ لو [illegible] عطا کر دیا جائے گا تو [illegible] دنیا کی کسی شے کا مطالبہ نہیں کیا کہ اب یہ دنیا بالکل حقیر ہو چکی ہے۔ اس کی نظر میں صرف جلوۂ معبود تھا اور مقصود بندگی کے علاوہ کوئی مطمح نظر [illegible] ہو سکتا ہے لہذا اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ: پروردگار اب ساری کائنات [illegible] آ گئی ہے۔ اب میری کوئی خواہش، کوئی تمنا اور کوئی آرزو نہیں ہے۔ اب اگر کوئی آرزو ہے تو [illegible] ہے کہ مجھے اپنا بندہ بنا لے اور اپنی زبان محبت سے اپنا بندہ کہہ دے۔"

[illegible] ہی انسان کو انھیں بلندیوں تک لے جانا چاہتی ہے جب [illegible] "ایاک نعبد" [illegible] کا اقرار کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں جلوۂ ربوبیت کے علاوہ کوئی مقصود نہیں [illegible] دنیا اس کی نگاہ میں حقیر ہو جائے اور اس کی عبودیت کسی وقت بھی اپنی طرف

حذب نہ کر سکے۔

۲۲۔ تفکر در کائنات

یہ غلط خیال کیا جاتا ہے کہ نماز انسان کو تمام دنیا سے غافل بنا کر صرف پروردگار کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ نماز کے احکام اس وہم کی کھلی ہوئی تردید ہیں جس کے بعد اس خیال کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

نماز انسان کو پروردگار کی طرف ضرور لے جانا چاہتی ہے — لیکن اس کا کوئی امکان درست نہیں ہے کہ انسان ہر چیز سے منہ موڑ کر اس سمت یا جہت کی طرف متوجہ ہو جائے اس کا جلوہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے اور اس کا پرتو ہر مخلوق میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کا منشا یہ نہیں ہے کہ انسان کائنات سے غافل ہو جائے۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان کائنات کے اندر جلوۂ پروردگار کا مشاہدہ کرے، اور "ذرشیی" کائنات میں گم نہ ہونے پائے۔ کائنات کو مشاہدۂ رب کا ذریعہ قرار دینا عین اسلام اور کمال انسانیت ہے اور کائنات میں الجھ کر رہ جانا عین کفر اور زوال انسانیت ہے۔

کافر کی نظر وہ ہے جو آفاق میں گم ہو

مومن کی نظر وہ ہے کہ گم جس میں ہوں آفاق

نماز کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو وہ مطالعہ کائنات، در تجزیہ فطرت کا بہترین ذریعہ ہے انسان مومن جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے پانی کی ماہیت کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ مطلق ہے یا مضاف ؟ — اس کا رنگ، بو، مزہ مطابق فطرت ہے یا خلاف فطرت ؟ پانی ممکن نہیں ہے تو یہی تجزیہ خاک کے بارے میں کرنا ہوتا ہے کہ خاک خالص ہے یا اس میں دوسرے عناصر کی آمیزش ہو گئی ہے۔ ؟

در حقیقت معنوی اعتبار سے دونوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ پاک ہیں یا نجس ؟ حلال ؟ حرام ؟ مباح ہیں یا غصبی ؟ قابل استعمال ہیں یا ناقابل استعمال ؟

اس کے بعد جب مصلائے عبادت کا رخ کرتا ہے تو سب سے پہلے سمتوں کا اندا

ہے اور علم نجوم اور کواکب کی مدد سے قبلہ کی تعیین کرنا ہوتی ہے۔

قبلہ کے دریافت کر لینے کے بعد جب سجدہ کا ارادہ کرتا ہے تو ایک مرتبہ پھر خاک کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ یہ قابل سجدہ ہے یا نہیں اور اگر خاک میسر نہیں ہے تو نباتات کے حالات کا جائزہ لینا ہوتا ہے کہ ان کا شمار ماکولات و ملبوسات میں ہوتا ہے یا نہیں — اور اس طرح خاک سے لے کر سماوات تک پوری کائنات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد مصلیٰ نماز میں قدم رکھنا ہوتا ہے اور پھر معنوی اور روحانی مشاہدات کا عالم الگ ہے جس سے نماز کا کوئی جز اور رکن خالی نہیں ہے اسی حالت میں یہ تصور کرنا کہ نماز انسان کو کائنات سے غافل بنا دیتی ہے ایک تصور شیطانی مغالطہ اور اسلام دشمنی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور عالم حقیقت و واقعیت میں اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ ساری تحقیقات حکم خدا کی تعمیل کے لئے ہوتی ہے۔ تحقیق کے عالم میں حکم خدا سے انحراف اور بغاوت کے لئے نہیں ہوتی ہے۔

سرکار سید الشہداء نے دعائے عرفہ میں اسی حقیقت کو نہایت درجہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "تیرے آثار میں بار بار غور و فکر کرنا تیری ملاقات کی منزل سے دور تر بنا دیتا ہے" اور "میرے مالک اس کمزوری کا علاج بتا یا کہ ہے خدایا! مجھے ہی طرف اپنی توفیق عنایت فرما کہ ساری دنیا سے قطع نظر کر کے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور نگاہیں تیری طرف نظر کرنے کی روشنی سے معمور ہو جائیں۔"

یعنی نظر کسی طرف رہے علاوہ تیری نظر کے اور کسی آن میں نگاہ جلوۂ کائنات میں نہ پائے۔

مدرسۂ تربیت

... نماز کے احکام پر نظر رکھنے والا اس حقیقت کی تصدیق کر سکتا ہے کہ ... زندگی کے لئے بہترین ذریعہ تربیت ہے اور یہ ایک مدرسۂ عمل ہے جس میں تعلیم ... حاصل کرنے والا ... کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔

... یہ بات بہت معمولی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اندازہ

ہوگا کہ نماز کے جزئی احکام بھی انسان کے لئے زندگی ساز اور معیار کردار ہیں۔ پروردگار کے سامنے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ کس طرح کھڑے ہوں گے اور کس طرح بیٹھ جائیں گے۔ اس کی عظمت میں تو کوئی اضافہ ہونے والا ہے اور نہ کوئی نقص۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ہر عمل کے آداب معین کر دیے ہیں تاکہ انسان دو لمحہ بھی ہماری بارگاہ میں گذارے تو ایک مہذب اور مودب انسان بن کر واپس جائے۔

ہاتھ انسان کو قیام کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے کہ انسان کسی بزرگ کے سامنے کس طرح کھڑا ہو۔ اس کے پیر کس طرح سیدھے ہوں اور اس کی نگاہ کس منزل پر ہے۔

اس کے بعد جھکنا پڑے تو جھکنے کا انداز کیا ہوگا۔ گردن کس طرح سیدھی ہو۔ پشت کس طرح ہموار ہو۔ ہاتھ کس طرح گھٹنوں پر رکھے جائیں۔ نگاہیں کس طرح پیروں کے درمیان زمین پر رہیں۔

اور پھر سجدہ کرنا پڑے تو کتنے اعضا خاک پر ہوں، ہاتھوں کا طریقہ کیا ہو، انگلیوں سے لے کر انگوٹھے تک سب کی ترتیب و تنظیم کس طرح ہو۔

سجدہ سے سر اٹھائے تو بیٹھنے کا طریقہ کیا ہو۔

جتنی دیر نماز میں مصروف رہے کسی انسان سے ایک حرف کی گفتگو نہ کرے پائے۔

کسی طرف مڑ کر دیکھنے نہ پائے۔

ہنسی کی بات آئے تو ہنسنے نہ پائے، اور رونے کی بات آئے تو آنسو نکلنے نہ پائیں۔

بھوک پیاس کا احساس ہو تو برداشت کرے اور کھانا پینا نہ شروع کر دے تاکہ واقعی یہ احساس پیدا ہو کہ کسی جلیل القدر اور عظیم الشان ہستی کی بارگاہ میں کھڑا ہے اور کسی دنیاوی، قصاب سے بھی افراد کا احترام اور زندگی کے آداب سے بے خبر ہو جائے۔ یہ رکوع اور سجدہ جیسا احترام حضرت احدیت کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

داخلی تربیت کے ساتھ ساتھ خارجی آداب کا سبق بھی سکھاتی ہے۔

انسان نماز کا ارادہ کرے تو پہلے خوشبو استعمال کرے اور کوئی ایسی شے استعمال نہ کرے جس کی بدبو ناپسندیدہ اور دوسرے افراد کے لئے ناقابل برداشت ہو۔

جماعت میں کھڑا ہو تو دوسرے سے ملا کر کھڑا ہو۔ دشمنوں کو درہم برہم کرنے اور اسلام کو برباد کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مل کر کھڑا ہو لیکن دوسروں کو اذیت نہ دے۔

جسے امام بنا دیا گیا ہے۔ اس کی اس طرح اطاعت کرے کہ اس کے ساتھ رکوع میں جھکتا اور اٹھتا رہے۔ اس کے ساتھ چلتا رہے، اور کسی مرحلہ پر اس سے انحراف نہ کرے۔ اس [illegible] تربیت عملی طور پر یکجا رکھے اور اس سے کسی مقام پر بے اعتمادی نہ کرے تاکہ اسی نماز میں ایک قومی ترتیب بھی حاصل ہو جائے۔ اور کرنے کا طریقہ بتا دیں کہ اگر وہ قیادت کی اطاعت کرتا رہے تو [illegible] رہے گی۔

یہ طریقہ کار [illegible] کے سہارے ایک ایسی مرتب منظم اور پابند اصول قوم تیار کر سکتا ہے جس کی نظیر دنیا میں [illegible] ہو اور جس کے حالات کا جواب کسی دور میں نہ مل سکے۔

نماز انسان کو سماجی تہذیب سکھانا چاہتی ہے کہ جب اس کا ارادہ کرے تو پہلے اذان و اقامت کہے تاکہ دوسرے افراد بھی متوجہ ہو جائیں اور وہ بھی اس خیر سے محروم نہ ہوں اور ساتھ میں دوسروں کو [illegible] کر چلنا بھی اسلام کی حقیقی تعلیم ہے اور سب کو نظر انداز کر کے صرف خود پرستی کرنا وہ غیر اخلاقی عمل ہے جسے اسلام کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

۲۲۔ اقدار کا احیاء

اسلام نے نماز کے مقدمات میں سب سے زیادہ زور جماعت پر دیا ہے اور اس کے لئے اتنا [illegible] قرار دیا ہے کہ بعض روایات میں یہاں تک وارد ہوا ہے کہ اگر جماعت [illegible] بہت سے افراد شریک ہو جائیں تو پروردگار اس قدر ثواب عنایت کرتا ہے کہ انسان اور [illegible] بھی حساب نہیں کر سکتے ہیں۔

جماعت کی اس قدر تاکید اسلام کی اجتماعیت کا اظہار بھی ہے اور اس کی طرف سے انسانی [illegible] بھی ہے۔

جماعت ایک طرف اسلام کی اعلیٰ مساوات کا اظہار ہے جہاں محمود و ایاز ایک ہی

صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور بندہ و بندہ نواز کا کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ امکان قوی ہوتا ہے کہ غلام صف اول میں ہو اور آقا صف دوم میں۔ جس کے بدولت سجدہ میں آقا کا سر غلام کے قدموں کے قریب ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلام نے ایک اور قدر کا احترام اور احیا کیا ہے اور وہ ہے قدر علم و تقویٰ۔ کہ اس نے اولاً تو امام جماعت کے شرائط بیان کئے ہیں کہ اتنے بڑے مجمع کی قیادت کرنے کا حق کس شخص کو ہے اور سارے سروں کو کس کے پیروں کے قریب رکھا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ امام جماعت علم کے اعتبار سے عارف احکام ہو، اور کردار کے اعتبار سے صاحب عدالت و تقویٰ۔

صنف کے اعتبار سے مرد ہو نسب کے اعتبار سے حلال زادہ تاکہ اسلام کے اندر اس کے خلاف اقدار کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔

صرف ایک عورت ہونا عیب نہیں تھا اور وہ ایک فطری امر تھا جبکہ عورت کو بھی عورتوں کی امامت کرنے کا حق دے رہا۔ مردوں کی امامت سے صرف اس لئے منع کر دیا کہ اسلام ایک ہم قدر حیات کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا، اور وہ ہے عصمت و عفت اور حسن سیرت۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر جماعت میں کسی عورت کو آگے کھڑا کر دیا گیا اور تمام مرد اس کے پیچھے کھڑے ہوگئے تو جدید آزاد ہو سکتے ہیں جن کی نیت سلامت رہ جائے اور وہیں پر کسی طرح کا خیال نہ پیدا ہو، ورنہ ستر بہر حال خطرہ ہے اور اس سے بہتری جدید ... نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلام اقدار قیام عورت کے حجاب کے تحفظ کے بھی خلاف ہے ورنہ اس کی نگاہ میں عورت ہونا کوئی نقص ہے اور نہ عیب۔ وہ عورت کو ام الائمہ بھی قرار دیتا ہے اور "ام ابیہا" بھی۔

لیکن یہ کمالات معنوی ہیں جن کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اجتماعیات میں بہر حال اجتماعی قدروں کا خیال کرنا پڑے گا کہ معاشرہ جدید رہیں مقاصد میں مسلمان اور تحصین ثواب کا جذبہ انسان کو مبتلائے عذاب نہ کر دے۔

امام جماعت کے شرائط کے بعد اسلام نے خود صف اول کے شرائط بھی

بہتر یہ ہے کہ صف اول میں صاحبان علم و تقویٰ کو رکھا جائے تاکہ اگر کسی وجہ سے امام اپنی نماز کو مکمل نہ کر سکے تو صف اول کا کوئی ایک شخص آگے بڑھ جائے اور نماز کو تمام کر دے۔ یہ بات ہنگامی حالات کا علاج بھی ہے اور اسلامی اقدار کا احیاء بھی۔

اسلام اس طرح کی بہت باتیں ... نہیں چاہتا ہے کہ غلاموں کو آگے کھڑا کر دیا جائے اور آقاؤں کو پیچھے اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ ہم نے دولت کو باعث عزت نہیں قرار دیا ہے بلکہ دولت کو غربت کے قدموں پر ڈال دیا ہے کہ اس طرح کے نعرے جذباتی دنیا میں تو کام آ سکتے ہیں حقائق کی دنیا میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اسلام دولت سے بیزار یا متنفر نہیں ہے وہ انسان دنیا کو حیرت سے تعبیر کرتا ہے، اور اس کی نگاہ میں کوئی کار خیر مال دنیا کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ وہ نہ یہ صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ دولت ایک ضرورت ہے اور تقویٰ الگ کمال اور جب ضرورت اور کمال کا مقابلہ ہو جائے گا تو کمال کو بہر حال مقدم کیا جائے گا۔ جس سے مغرب مادیت پرستوں کی تحت میں اسلام ہو جاتا ہے اور یہی اسلام کا بنیادی مقصد اور اس کی عظیم ترین قدر حیات ہے جس کے احیاء کے لئے نماز جماعت قائم کی گئی ہے۔

۲۵۔ اجتماعی مسائل کا حل

انسان انفرادی مسائل کو کسی طرح بھی حل کر سکتا ہے لیکن اجتماعی مسائل کے لئے بہترین طاقت اور اجتماعیت کی ضرورت ہے جسے کوئی انسان تن تنہا فراہم نہیں کر سکتا ہے۔

اسلام نے انسان کو اس مرکزی طاقت کی طرف بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ عظیم طاقت در بار کا ... سے ... کی جا سکتی ہے۔

"نماز اور صبر کے ذریعہ مدد مانگو"

یہ قانون اس امر کی علامت ہے کہ اجتماعیت کے سارے مسائل کو حل کرنے کے لئے جس طرح صبر کی ضرورت ہے اسی طرح نماز کی بھی ضرورت ہے۔ صبر کی ضرورت کا احساس ہر شخص کو ہے کہ ... ولا بھی جانتا ہے کہ صبر کے بغیر چاقو دوسرے کے چراغ کا کام انجام نہیں پا سکتا ہے۔

فکر ہماری کی اس عظمت سے اکثر لوگ بے خبر ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید صبر کے پہلو بہ پہلو نماز کی بھی تاکید کرتا ہے تاکہ انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ اجتماعی مسائل کے لئے جس طرح صبر کی ضرورت ہے اسی طرح نماز کی بھی ضرورت ہے۔

صبر منفی پہلو کے لئے درکار ہے جہاں نازل ہونے والے مصائب کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور نماز مثبت پہلو کے لئے ضروری ہے جہاں مصائب سے مقابلہ کرنے کی طاقت درکار ہوتی ہے۔ نماز صرف ذریعہ تسکین نہیں ہے بلکہ [illegible] نماز ذریعہ تسکین ہی نہیں ہے بلکہ ذریعہ انقلاب ہے۔

نماز کی اجتماعی طاقت کا اندازہ میدان جنگ میں دشمن کو بھی ہو جاتا ہے اور نماز کی روحانی طاقت کا اندازہ صرف اس مرد مومن کو ہوتا ہے جو رات کی تاریکی میں مصلیٰ پر کھڑے ہو کر رب مالک سے حوصلہ اور مدد طلب کرتا ہے اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ میدان جہاد میں قدم بڑھا دیتا ہے۔

۲۶۔ طاقت اور محاسبہ

نماز کے بنیادی اجزاء میں ایک سورۂ فاتحہ بھی ہے جس کے بغیر نماز کو نماز نہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور یہ سورۂ فاتحہ انسان کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں زندگی کی تمام خوبیاں [illegible] جاتی ہیں اور ہر طرح کے غضب الٰہی اور ضلالت و گمراہی سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

سورۂ فاتحہ نمازی کے دل میں ایک زندگی کی تعمیر دیتا ہے جہاں "الرحمٰن الرحیم" کی فکر انسان کو عظیم ترین امیدوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے وہاں "مالک یوم الدین" کا خیال عظیم ترین خوف سے دوچار کر دیتا ہے اور اس طرح انسان امیدوں کے سہارے جیتا اور خوف کے اندھیرے میں [illegible] ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں رحمت الٰہی کا [illegible] بھی رہتا ہے اور غضب پروردگار کا خوف بھی۔ اور یہی ایک بہترین زندگی کا مرقع ہے [illegible] بہتر کوئی زندگی میسر ہو سکتی ہے۔

خوف و رجاء کے علاوہ سورۂ فاتحہ انسان کو طاقت اور محاسبہ کا احساس بھی [illegible] دلاتا ہے [illegible] انسان کو یقین دلاتا ہے کہ جس قدر بھی قوت [illegible]

پروردگار کے پاس طاقتوں کا خزانہ موجود ہے اور وہ ہر طرح کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دنیا کی کسی مصیبت سے پریشان ہو جانا اس کی بے معرفتی یا ناقدری کا نتیجہ ہے اور یہ صفت انسان کو رحمت سے بعید کر دیتی ہے۔ اور دوسری طرف "مالک یوم الدین" کے ذریعہ احساس دلاتا ہے کہ دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اور انسان کی زندگی کا آخری انجام فنا یا ہلاکت نہیں ہے بلکہ اسے اس عالم سے ایک دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونا ہے اور اس عالم کا نام "یوم الدین" اور روز محشر ہے جہاں ہر شخص کے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور ذرہ ذرہ نیکی یا برائی پر ثواب یا عذاب دیا جائے گا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انسان سورۂ فاتحہ کی اسی ایک خصوصیت پر غور کرے تو اس کی زندگی کی مشکل کا علاج ہو سکتا ہے کہ زندگی میں فساد دو ہی چیزوں کی طرف سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو جانا ہی ہر مشکل کا بہترین حل ہے۔

۲۷۔ روح امداد باہمی

دین اسلام نے ایک طرف نماز کے احکام اور جماعت کی تاکید کے ذریعہ انسان کو اجتماعی زندگی کی اہمیت سے آشنا بنایا ہے کہ مسلمان روزانہ متعدد بار ایک مقام پر جمع ہوں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہوتے رہیں۔

نماز کے بعد ہفتہ میں ایک بار اجتماع کو جمعہ قرار دے دیا ہے اور اس کے دائرہ کو اور بھی وسیع بنا دیا ہے تاکہ پورے علاقہ کے مسلمان ایک مقام پر جمع ہو کر ایک دوسرے کے حالات دریافت کریں اور دوسروں کے کام آنے کو اپنا فریضہ قرار دیں۔

دوسری طرف اسلام نے [illegible] کو قابل مدح و ثنا قرار دیا ہے جس میں [illegible] طور پر [illegible] مسلمانوں کے ذہن سے [illegible] اور [illegible] فقراء کا خیال بھی [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ نماز میں مشغول ہو جاتا [illegible] سے غافل ہو جاتا ہے [illegible] کوئی تعریف نہیں کرتا

ہے اور [illegible] اس کے بارے میں کوئی آیت نازل کرتا ہے۔ لیکن اگر [illegible] مقدر [illegible] ہی کوئی تقصیر ہو جائے، [illegible] رکوع ہی میں اس کی علامت [illegible] ہو جائے تو یہ عمل [illegible] عظیم ہو جاتا ہے کہ [illegible] اس کے بارے میں آیت نازل کر دیتا ہے [illegible] عمل کرنے والے کے سر پر ولایت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اس کام کو بے حد پسند کرتا ہے جس میں [illegible] اعانت فقرا کی روح منزل معنویت سے نکل کر منزل اظہار تک آ جائے، [illegible] رہتے ہوئے بھی حاجت روائی کا وسیلہ بن جائے۔

[illegible] کی اسی معنویت اور اسلام کی اسی روحانیت سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ بعض احمق [illegible] کائنات کی نماز پر اعتراض کر دیتے ہیں کہ اس میں [illegible] توجہ الی اللہ کا جذبہ باقی نہیں رہ گیا [illegible] ہٹ کر [illegible] کی طرف متوجہ ہو گیا [illegible] کے معنی ہی نہیں جانتے ہیں [illegible] انھیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ [illegible] ایک بہترین وسیلہ [illegible] اعانت فقرا کا ایک بہترین [illegible] ولایت الٰہیہ کا حصہ [illegible]

۲۸۔ حفظ نظام کی تربیت

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے نماز جماعت میں یہ امر مستحب قرار دیا ہے کہ صف اول میں صاحبان علم و تقویٰ کو جگہ دی جائے تاکہ [illegible] اسلامی افکار کا احیاء [illegible] لیکن اس کا دوسرا فلسفہ یہ بھی ہے کہ اگر امام جماعت کسی حادثہ کا شکار ہو جائے اور [illegible] ممکن نہ رہ سکے تو صف اول کا کوئی شخص آگے بڑھ کر جماعت کو تمام کر سکے۔ جو اس علامت ہے کہ اسلام حفظ نظام کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور وہ نہیں چاہتا ہے کہ امام [illegible] کے [illegible] نظام درہم برہم ہو جائے اور جماعت پراگندہ ہو جائے [illegible] پہلے سے انتظام کر رہا ہے تاکہ جماعت [illegible] امام نہ رہنے پائے [illegible] کی صفوں میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جو اسلام نظام جماعت میں اس طرح کی ابتری [illegible] کر سکتا ہے اور اس کے قانون میں چند لمحوں کے انتشار کی گنجائش نہیں ہے وہ نظام

اس طرح کی ابتری کو کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔

[illegible] نظام ایک طرح کا اشارہ ہے کہ جس طرح جماعت میں امام کے پیچھے [illegible] ایک نائب امام کو رہنا چاہیے جو حوادث میں اس کی جگہ نظام کو سنبھال لے اور جماعت منتشر نہ ہو سکے۔ اسی طرح نظام کائنات میں امام کی [illegible] دوسرے امام کو موجود رہنا چاہیے تاکہ بروقت نظام کائنات کو سنبھال لے اور [illegible] جگہ خالی رہ جائے [illegible] کے فنا ہو جانے اور [illegible] کے [illegible] جانے کا بھی اندیشہ ہے [illegible] نظام [illegible] درہم برہم ہو جانے کا بھی خطرہ ہے [illegible] تاریخ کا [illegible] سال تک چل سکتا ہے اور امت کو کسی وقت انتشار [illegible] پراگندگی سے نجات نہیں مل سکتی ہے

۲۹۔ حفظ حیات

اسلام نے نماز کے قوانین کو [illegible] مرتب کیا ہے کہ [illegible] کسی وقت بھی [illegible] معنویت [illegible] نہ ہو سکے [illegible] پہلا [illegible] حیات میں مصروف [illegible] کے وقت کوئی [illegible] کے اعمال کا محاسبہ ہے۔

[illegible] معنوی حیات کا بھی [illegible] دو مزید احکام ایجاد کر دئے ہیں [illegible] کے لئے بنایا گیا تھا [illegible] ان اوقات کو بھی عشا اور فجر کے درمیان گھیر دیا گیا تاکہ اس کے لئے عشا اور فجر کا [illegible] عمل بھی ہوتا ہے [illegible]

[illegible] زندگی جس قدر [illegible] نظام کیا گیا ہے [illegible] کی عمر میں کسی [illegible] کی صلاحیت

نہیں ہوتی ہے اس لئے اسے نماز کی طرف سے آزاد رکھا گیا ہے۔ عورت کی زندگی اس عمر میں بھی ضرورت سے دوچار ہو سکتی ہے لہٰذا اس پر نماز واجب کر دی گئی تاکہ بارگاہ الٰہی میں مسلسل حاضری خوف خدا بھی پیدا کراتی رہے اور مسئولیت کا احساس بھی بیدار کرتی رہے۔

کسی مرد کی حرکت [illegible] مرد کے حریم سے حجرہ سے [illegible] کسے [illegible] یقین ہے کہ میرا پروردگار میری عبادت کو دیکھ رہا ہے اور وہی اس عمل پر انعام دینے والا ہے جا ہے سماج کو میری معرکہ کی عبادت کی خبر ہو یا نہ ہو اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب عبادت کی منزل میں پروردگار کی نگرانی کا احساس ہے اسے گناہ کی منزل میں بھی یہ خیال ضرور ہوگا کہ یہ گناہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہے نگاہ پروردگار سے نہیں چھپا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی نامحرم سے ہاتھ بھی لگا دیا تو پروردگار کی بارگاہ میں نامۂ اعمال میں درج ہو جائے گا اور روز قیامت اس کا حساب دینا پڑے گا۔

جناب یوسف نے زلیخا کو اسی فکر کا احساس دلایا تھا کہ غیرت دیکھنے والی ہے۔ لیکن میرا پروردگار سمیع و بصیر ہے۔ میں اس کی نگاہوں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا ہوں۔ وہ ہر ایک کی نگاہ کو دیکھتا رہتا ہے [illegible] کوئی نگاہ سے نہیں بچ سکتی ہے۔ وہ میں اس کی بنا پر نگاہوں کی [illegible] وسعت علم کی بنا پر [illegible] ہے

۳۰۔ شرط اخوت

قرآن مجید نے انسانی برادری میں ایک نئی برادری "ایمانی برادری" قائم کی ہے اور اس کے ذریعہ ایک نئے سماج کی تشکیل کی ہے اور مومن کو مومن کا بھائی بنا دیا ہے لیکن [illegible] بھی [illegible] کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور اسلام کو کوئی ایسی برادری پسند نہیں ہے جس کا نام "اسلامی برادری" ہو اور نماز کا جنازہ ہو۔

سورۂ مبارکہ برائت میں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "حرمت کے مہینوں کے گذر جانے کے بعد جہاں ملیں انھیں گرفتار کر لو۔ قتل کر دو اور ان کے حرکات کی نگرانی کرو [illegible] اگر توبہ کر لیں۔ نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں آزاد کر دو۔ چھوڑ دو"

پناہ مانگیں تو پناہ دے دو [illegible] پھر انھیں ان کے گھر پہونچا دو۔ ان کے عہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن پھر بھی معاہدہ کریں تو جب تک اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو کہ خدا متقین کو دوست رکھتا ہے۔ انھیں موقع مل جائے گا تو یہ کسی معاہدہ کی پرواہ نہ کریں گے۔ یہ صرف زبانی باتیں کرتے ہیں ان کے دل دشمن ہیں۔ یہ آیات خدا کا سودا کرنا چاہتے ہیں [illegible] لیکن [illegible] توبہ کے بعد بھی اگر توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔

گویا ان آیات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے مشرکین کی آزادی اور ان کے برادری میں داخلے کے [illegible] شرط لگا دی ہے کہ نماز کے بغیر نہ انھیں آزاد کیا جا سکتا ہے اور نہ انھیں برادری میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام برادری کے قیام میں نماز کو [illegible] درجہ دیتا ہے اور اس کے بغیر کسی برادری کا قائل نہیں ہے

۲۰۔ بنیاد محبت

عقل خود سے اسی [illegible] فرزند جناب [illegible] عمروبن [illegible] تو اس کی غرض [illegible] کی کہ میں چاہتا ہوں کہ میری ذریت نماز قائم کرے اور قیام نماز کے [illegible] خدا سے بہتر کوئی [illegible] ہے اور اس کے بعد دعا کی "خدایا لوگوں کے دلوں کو [illegible] طرف جھکا دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما" جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خلیل [illegible] کی بنیاد محبت ہے اور نماز [illegible] کا تقاضا ہے کہ پروردگار لوگوں کے دلوں کو [illegible] دوست اور لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دے۔ [illegible] مزید [illegible] کی علامت ہے کہ [illegible] رزق [illegible] کا ذریعہ ہوتی ہے [illegible] سے [illegible] حمایت کرتا ہے کہ کسی کو [illegible] بھی نہیں ہوتی ہے۔

[illegible] اس کا [illegible] بھی ہے کہ [illegible] عشق الٰہی میں اس وقت بستر کو چھوڑ دیتا ہے جب نسیم سحر [illegible] کے لئے آمادہ رہتے ہیں اور صبح کی ٹھنڈی ہوا [illegible] دعوت عیش دیتی رہتی [illegible] دو پہر [illegible] اسد کار ترک کر کے مصلیٰ پر آنا بھی عشق الٰہی کی ایک علامت ہے کہ محبوب [illegible] اس کی بارگاہ میں حاضری کے شوق میں بندے تمام دنیا کے کاروبار کو نظر انداز کر

ہے۔ بشرطیکہ تمام اسی جذبہ کے تحت ہو اور کوئی مادی عمل نہ ہو کہ اس کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

کیونکہ حیات کا ترک کر دینا ہی ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو رزق بے حساب کا مستحق بنا دیتا ہے کہ اس نے جانتے پہچانتے ہوئے وسائل کو نظر انداز کر دیا ہے تو اب رب العالمین کا فرض ہے کہ اسے اپنے وسائل سے رزق عنایت فرمائے کہ یہی اس کے احترام و اخلاص ہونے کا تقاضا ہے اور اسی کے اس اعلان کی تصدیق بھی ہے کہ پروردگار کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا ہے۔

۴۳۔ سبب زینت

سورۂ مبارکۂ اعراف آیت ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اولاد آدم ہر نماز کے وقت اور ہر مسجد کے پاس اپنی زینت کو ساتھ رکھو اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ پیغمبر آپ پوچھئے کہ آخر جس زینت کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام کر دیا ہے؟"

آیت شریفہ میں ایک طرف زینت کی اہمیت کا اعلان ہوا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے زینت بہترین شے ہے جس کی وجہ سے دوسرے مقام پر مال و اولاد کو بھی زندگانی دنیا کی زینت قرار دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف اسے نماز اور مسجد کے لوازم میں بھی قرار دیا گیا ہے [illegible] مسجد پر قدم رکھے یا نماز و سجدہ کیا جائے تو اسے چاہیے کہ زینت کو ہمراہ رکھے اور ان [illegible] جن کا عقیدہ یہ تھا کہ جس لباس میں [illegible] [illegible] نہیں ہو سکتا ہے اور اسی بنیاد پر [illegible] طواف کیا کرتے تھے۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ مسلمان زینت ہمراہ رکھے اور زینت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حاضری دے کہ اس نے زینت کو صاحبان ایمان ہی کے لئے پیدا کیا ہے، اور وہ زینت نماز کو دوسری عبادات سے [illegible] قرار دیتا ہے۔ انگشتری کے ساتھ نماز کی ایک زینت کی بنا پر بھی ہے کہ اس نے حکم الٰہی کا احترام [illegible] [illegible] ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام ہر جہتی مذہب ہے جو زندگی کے کسی پہلو کو [illegible]

نہیں کر سکتا ہے۔ [illegible] کو کسی [illegible] کا حکم دیا ہے اور اس سے بھی بہتر [illegible] ثواب کا وعدہ کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نامحرموں کے سامنے اس کی نمائش نہ ہو اور بغیر نمائش کے بھی اس کی آواز اگر غیروں کے دلوں میں غلط جذبات مرتب کر سکے تو ایسا انداز زینت اسلام کو ہرگز پسند نہیں ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں کسی زینت کے ساتھ حاضری دے جو معاشرتی زندگانی میں کثافت اور خباثت کا باعث بن جائے۔

۴۴۔ فرہنگ اوقات

ملاحظہ کیجئے یہی ایک عبادت ہے جسے اوقات کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور ہر نماز کے لئے ایک وقت معین کر دیا گیا ہے جس سے مقدم اور مؤخر دونوں جائز نہیں ہیں اور اسی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت اصل ہے اور نماز فرع ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن مجید کے [illegible] فرہنگ کی [illegible] یہ ہے کہ [illegible] زندگی کے لئے نماز اصل ہے اور [illegible] اوقات کی تعیین نماز ہی کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عبادت الٰہی کے لئے وقت معین ہے [illegible] نماز ہی کے ذریعہ وقت کی تعیین ہوتی ہے [illegible] کا احساس کیا جاتا ہے۔

سورۂ مبارکۂ نور آیت ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ایمان والو تمہارے غلام کنیز اور وہ بچے جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں ان سب کو چاہیے کہ تین اوقات میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کریں نماز صبح سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتار کر آرام کرتے ہو اور نماز عشاء کے بعد کہ یہ تین اوقات پردے کے ہیں۔"

اس آیت میں صبح و شام کے بجائے نماز صبح اور نماز عشاء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام اپنے چاہنے والوں کو یہ ذہن دینا چاہتا ہے کہ [illegible] اوقات کا معیار نماز ہو [illegible] مسلمان ساعت سے غافل ہو سکتا ہے لیکن نماز سے غافل نہیں ہو سکتا [illegible] اپنے امور زندگانی کو نماز ہی کے اعتبار سے مرتب کرنا چاہیے۔

۳۴۔ اصل تعمیرات

اسلام نے جس طرح وقت کی تشخیص کے لئے نماز کو معیار قرار دیا ہے اسی طرح اس کا منشا یہ ہے کہ مکانات کی تعمیر بھی نماز کے پیش نظر کی جائے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۸۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ قرار دو اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دے دو۔"

آیت کریمہ کے ذیل میں بعض مفسرین نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ مکانات کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے درمقابل میں بناؤ لیکن قیام نماز کی مناسبت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مکانات کے قبلہ رو ہونے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مکانات سے مساجد کا کام لیا جا سکے اور بوقت ضرورت ان میں نماز قائم کر سکے۔

نماز کے احکام کے ذیل میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ اوقات نماز کی تیاری کے لئے بیت الخلاء وغیرہ سے بھی فراغت حاصل کر لے کیونکہ پاخانہ کو روک کر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس طرح نماز کا ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اور بیت الخلاء کے احکام میں یہ بات شامل کر دی گئی ہے کہ قبلہ کی طرف رخ یا پیٹھ کر کے بیت الخلاء استعمال کرنا حرام ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو گھروں کی تعمیر میں قبلہ کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے تاکہ مقدمات نماز میں بھی کوئی شخص قدم نہ اٹھا سکے اور اصل نماز کے قائم کرنے میں بھی سہولت ہو اور وہ کسی انحراف میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نماز کو اپنی پوری ثقافت اور زندگی کا محور قرار دینا چاہتا ہے تاکہ مسلمان کو ہر آن نماز یاد رہے اور نماز کے ذریعہ پروردگار کو یاد کرتے رہیں جس کی بقا کے لئے نماز کو واجب کیا گیا ہے اور حق کی یاد ہی نماز کا اصل اور واقعی فلسفہ ہے۔ جیسا کہ جناب موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ "میری یاد کے لئے نماز قائم کرو"۔ اور سرکار دو عالمؐ سے کہا گیا کہ "نماز برائیوں سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے" کہ یہی جوہر نماز یہی درجہ بندگی ہے۔

۳۵۔ مظہر مساوات

نماز جس طرح اپنی جماعت کے اعتبار سے ایک اجتماعی مساوات کی مظہر ہے اسی طرح اپنے ذاتی اعمال کے اعتبار سے بھی ایک عجیب و غریب مساوات کی حامل ہے۔ نماز کا دیگر عبادات کے ساتھ قیاس کیا جائے تو اس کے امتیازات کا نہایت واضح طریقہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

روزہ اپنے اندر مختلف اعضاء کو شامل رکھتا ہے

حج میں مختلف اوقات میں مختلف اعضاء مشغول عمل ہوتے ہیں۔

جہاد میں قوت قلب اور دست و بازو کی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن نماز کا ایک منصب بارگاہ الٰہی میں سر بسجود ہونا ہے جو عجیب و غریب کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔

اگر انسان کے بدن کو تین حصوں پر تقسیم کیا جائے تو سب سے بلند ترین حصہ سر کی پیشانی ہے اور سب سے پست ترین حصہ اس کے پیروں کے انگوٹھے ہیں۔ درمیانی حصے میں اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پیروں کے گھٹنے آتے ہیں کہ ہتھیلیاں پورے بدن کے نصف کا تعین کرتی ہیں اور اس کے گھٹنے پیروں کے نصف کی تعیین کرتے ہیں۔

دین اسلام نے سجدہ میں انہیں ساتوں اعضاء کو اعضاء سجدہ قرار دیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کے عالم میں انسان کا پورا وجود مشغول عبادت رہتا ہے اور کسی حصہ بدن کو بھی عبادت سے نہیں روکا جاتا ہے۔ سر اگر بلند ترین حصہ ہے تو وہ بھی خاک پر ہے اور پست ترین حصہ بھی زمین پر لگے ہوئے ہیں اور کسی حصہ بدن کو کسی کے مقابلہ میں اکڑنے کا حق نہیں ہے اور نہ کوئی کسی کے مقابلہ میں محروم عبادت ہے۔ اس نماز کی داخلی مساوات کسی اور عمل میں نہیں ملتی ہے۔ جبکہ یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ نماز داخلی اور خارجی دونوں اعتبارات سے مساوات کی مظہر اور منظہر ہے اور اس سے بہتر کوئی دوسری عبادت نہیں ہے۔

۳۶۔ [illegible] رزق حلال

نماز کو معراج مومن قرار دینے والے قانون نے جہاں انسان کو ایک عظیم بلندی کا احساس

دلایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ پیشانی کے خاک پر رکھنے کا مطلب حقارت اور پستی نہیں ہے بلکہ اس پاکیزہ ہستی کی بارگاہ میں سر جھکا دینا ہی اصل بلندی ہے اور اس سے بالاتر کوئی بلندی نہیں ہے۔ دین یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ اتنی بلند ترین پرواز کے لئے قوت پرواز بھی پاکیزہ ترین ہونی چاہیے۔

یہ بات صبح و شام انسان کے تجربہ میں آتی رہتی ہے کہ جب پست رفتار سے چلنے والی گاڑیاں ڈیزل سے بھی چل جاتی ہیں لیکن جب رفتار کو تیز تر بنانا ہوتا ہے تو ڈیزل کی جگہ پر پیٹرول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پٹرول میں بھی سپر اور خصوصی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور جب زمین سے بلند تر ہو کر فضا میں پرواز کرنے کا وقت آتا ہے تو یہ سپر اور خصوصی بھی بیکار ہو جاتا ہے اور کثیف نظر آنے لگتا ہے اور وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ انتہائی صاف و شفاف اور پاکیزہ مادہ استعمال کیا جائے جو صرف سیٹ میں پرواز کے شایان شان ہو۔ حالانکہ یہ بلندی بھی ۳۰-۴۰ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اور اگر راکٹ وغیرہ کی پرواز کا بھی حساب کر لیا جائے تو ایک کرہ زمین یا کرہ قمر سے بالاتر نہیں ہوتی ہے جو کہ نظام شمسی کا پست ترین حصہ ہے۔ اس کے بعد انسان کو ساتوں آسمانوں سے بالاتر عرش اعظم کا طواف کرنا ہو تو اس کی پرواز کا سامان اس سے یقیناً شفاف تر اور پاکیزہ تر ہونا چاہیئے۔

اسلام نے نماز کو معراج مومن بنا کر انسان کو اس بات کی طرف [illegible] کہ اس بلند ترین پرواز کے لئے غذائی حیثیت سے [illegible] پاک و پاکیزہ رزق استعمال ہونا چاہیئے ورنہ کثیف اور ناپاک غذا کسی وقت بھی جہاز معرفت و بندگی کو میں برباد کر سکتی ہے اور بلند ترین پرواز کے ارادہ کرنے والے کو لمحوں میں جلا کر خاکستر بنا سکتی ہے۔ نماز بلند ترین پرواز تو ہے لیکن شرائط کے خلاف ہو جائے تو خاکستر بنا دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ رب کریم انسان مومن کو اس دور میں انجام سے محفوظ رکھے۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔

۳۷۔ سراسر وجود محو عبادت

نماز کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نماز انسان کے پورے وجود کو اپنے اندر شامل کر لیتی ہے اور انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ سر [illegible] نماز میں قدم رکھنے کے لئے [illegible] اعضاء کو کام دینے کے لئے پورے وجود کی طرف متوجہ رہے اور پورے وجود کو شریک عبادت [illegible]

نماز سے پہلے وضو کرے تو چہرہ اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے اور سر اور پیر کا مسح کرے کہ ان سارے اعضاء کی طرف متوجہ رہے اور سب کو پاک و پاکیزہ بنا کر شریک بندگی کرے۔

اس کے بعد جب نماز کا آغاز کرے تو حالت قیام میں پیروں کو شریک عبادت کرے۔ قنوت کے لئے ہاتھوں کو مشغول دعا بنائے، رکوع کے لئے کمر کی طاقت کا استعمال کرے اور سجدہ میں سارے اعضاء بدن کو محو بندگی بنا دے۔

اعضاء و جوارح کے ساتھ نظر کو بھی شریک عبادت رکھا گیا ہے کہ حالت قیام میں نظر سجدہ گاہ پر رہے۔ رکوع میں پیروں کے درمیان نظر رہے۔ سجدہ میں ناک پر نگاہ رکھے۔ تشہد اور سلام میں [illegible] گود پر نظر رکھے کہ یہی وقت دامن وجود کو نعمات [illegible] سے بھرنے کا ہوتا ہے اور اسی طرح انسان پوری نماز کے فیوض و برکات سے استفادہ کرتا ہے۔

۳۸۔ تعمیق اخلاص

نماز کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پیدا کی جاتی ہے کہ یہ ایک ہی قسم کے عمل کی تکرار ہے جس میں کسی طرح کی ندرت نہیں پائی جاتی ہے۔ صبح و مغرب و عشاء میں صرف اعداد کا فرق ہے ورنہ تمام ایک ہی قسم کی ہیں۔ اس کے بعد ہر رکعت میں قیام، رکوع، سجود، ہر منزل پر ایک ہی قسم کا [illegible] ایک ہی انداز کا عمل۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت عمل کی تکرار نہیں ہے بلکہ اخلاص کی گہرائی ہے کہ انسان [illegible] کھود کر پانی نکالنا چاہتا ہے تو ایک ہی پھاوڑا یا کدال [illegible] کر پانی نہیں نکال لیتا ہے بلکہ [illegible] ہر بار ایک ہی انداز سے بار بار پھاوڑا مارتا رہتا ہے جب تک کہ زمین کی گہرائی کی اس [illegible] تک پہنچ جائے جہاں سے پانی نکلتا ہے اور سیرابی کا انتظام ہوتا ہے۔

نماز کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے۔ یہ تمام ایک انداز کی رکعات اور حرکات کی [illegible] تکرار نہیں ہے بلکہ اخلاص کی چاہ کنی ہے جس کے بعد انسان آب حیات تک پہنچ جاتا [illegible] اور [illegible] عمل کر لیتا ہے جس کا امکان دوسرے اعمال یا دوسرے انداز عمل میں نہیں ہے [illegible] نماز کے عمل کو ظاہر والا انسان تکرار عمل تصور کرتا ہے اور چاہ کنی مقصد رسی کا ذریعہ

سمجھتا ہے۔ وہ سرور حاصل کر لیتا ہے جسے سرِ معراج دوسروں تقرب کہا جاتا ہے۔

۳۹۔ نماز بشرطِ حیات

جناب مریم جب فرزند کو لے کر قوم کے سامنے آئیں تو قوم نے فوراً یہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ "جب تمہارا کوئی شوہر نہیں ہے تو یہ بچہ کیسا ہے" جناب مریم نے فرمایا کہ "میں نے روزہ کی نذر کر رکھی ہے میں بات نہیں کر سکتی ہوں" اور یہ کہہ کر گہوارہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قوم نے فریاد کی کہ "اس گہوارہ کے بچے سے کس طرح بات کی جائے گی"۔

حضرت عیسیٰ نے آواز دی کہ "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے اس نے کتاب دی ہے، نبی بنایا ہے، اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت قرار دیا ہے، اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی ہے۔"

آیاتِ کریمہ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ نماز کی حد بندی حیات کے علاوہ کسی اور شرط سے نہیں کی جا سکتی ہے۔ رب العالمین نے جیسا کہ تم کو بھی یہی وصیت کی ہے کہ جب تک زندہ رہیں نماز قائم کرتے رہیں، اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس طرزِ بندگی سے الگ نہ ہونے پائیں۔

اسلامی قوانین میں اس حقیقت کے واضح اشارات پائے جاتے ہیں کہ [illegible] غرق بھی ہو رہا ہو، زمین میں [illegible] دھنس بھی رہا ہے تو اس کا فرض ہے کہ جب تک ہوش و حواس سلامت رہیں نماز پڑھتا رہے اور آخری سانسِ حیات تک اس فریضۂ نماز کو ادا کرتا رہے۔

اس کی ایک جھلک میدانِ جنگ میں بھی پائی جاتی ہے جہاں تلواریں چلتی رہتی ہیں، تیر برستے ہیں اور مجاہد [illegible] جہاد کے ساتھ فریضۂ نماز ادا کرتا رہتا ہے اور اپنے اس [illegible] زندگی سے غافل نہیں ہوتا ہے۔

۴۰۔ سیرتِ اولیاء اللہ

خاصانِ خدا اور اولیاء اللہ نے اپنی حیات میں جس قدر اہمیت فریضۂ نماز کو دی ہے اس کے بارے میں ایسا کوئی نمونہ اور موقع نہیں ملتا ہے۔

● مولائے کائنات نے صفین کے موقع پر عین عالمِ جنگ میں مصلیٰ بچھا دیا اور جب ابن عباس نے سوال کیا تو فرمایا کہ ہم اسی نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔

● میدانِ جنگ کے علاوہ زندگی کے آخری ایام میں آخری مرتبہ مسجد کوفہ میں تشریف لائے، قاتل کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھ کر [illegible] قتل سے آگاہ ہو کر بھی مصلائے عبادت پر تشریف لے گئے اور یہ ثابت کر دیا کہ ایسے سخت ترین موقع پر بھی نماز یا فریضۂ نماز ترک نہیں ہو سکتا۔

● امام حسین نے میدانِ کربلا میں ۳۰ ہزار کے نرغہ میں اس وقت نماز قائم کی [illegible] روکنے والے نہیں ہیں اور تیروں کی وجہ [illegible] بہر حال نماز قائم رہے گی جیسا کہ [illegible] زخمی ہو کر خاک پر گر پڑے لیکن قوم کی نماز کے اختتام تک سینہ سپر بنے رہے، اور اس طرح امام حسین نے اپنے عمل سے اور اصحابِ حسین نے اپنے جاں نثاری [illegible] سے اہمیتِ نماز کو ایک ابدی حیثیت دے دی۔

● علاوہ [illegible] کے ہر دور میں ایک سلسلہ شہدائے محراب کا بھی رہا ہے [illegible] مسجد میں [illegible] نماز کو ترک نہیں کیا ہے۔ [illegible] کوئی کام [illegible] کا حیا [illegible] مسجد میں [illegible] چھوڑ دیں [illegible] امام حسن اور امام حسین [illegible] باپ کے زخمی ہو جانے کے بعد مسجد سے [illegible] کے غلام کوئی [illegible] قدم کر سکتے ہیں [illegible] ہر کوئی عمل [illegible] سے حیات [illegible] حاصل ہو جاتی ہے۔

نمازِ مسجد

سورۂ مبارکۂ توبہ آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مساجد [illegible] جب کہ وہ خود اپنے شرک کے گواہ ہیں۔ مساجد کو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جن کا ایمان اللہ [illegible] ہے، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے

بیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ آبادیٔ مساجد ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس کی آبادکاری کے لئے پانچ قسم کے اوصاف درکار ہیں۔ ایمان کے اعتبار سے اس خدا پر ایمان رکھتا ہو جس کے سامنے سر جھکایا جاتا ہے، اور جس کی طرف یہ گھر منسوب کیا گیا ہے۔ روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو جس کی میدان میں پابندگی کی جاتی ہے اور اسے دنیوی اغراض و مقاصد سے بلند تر بنایا جاتا ہے۔

مالیات کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرتا ہو تاکہ آبادکاری کا انتظام کر سکے۔

نفسیات کے اعتبار سے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہ رکھتا ہو کہ دشمنوں کے طعنے اور سماج والوں کے طعنے اسے آبادیٔ مساجد سے روک نہ سکیں۔ اور پھر عملی اعتبار سے نماز قائم کرتا ہو کہ آبادیٔ مساجد کا اصل عنصر اقامۂ صلوٰۃ ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام عناصر [illegible] یا تابع ہیں۔ مسجد کی اصل آبادی نمازی ہی سے ہوتی ہے لہٰذا نمازی ہی کو مسجد کا واقعی معمار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۴۲۔ اعلانِ حقانیت

عاشور کا دن تھا۔ ظہر کا ہنگام قریب تھا کہ ایک مرتبہ ابو ثمامہ صیداوی نے امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مولا! وقت نماز آگیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ آخری نماز آپ کے ساتھ ہو جائے، اس کے بعد راہِ خدا میں قربان ہو جاؤں۔

امام حسینؑ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ بے شک یہ اول وقت ہے۔ خدا تمہیں نماز گزاروں میں قرار دے اور یہ کہہ کر [illegible] قیام کا حکم دے [illegible] دو اصحاب [illegible] ہو گئے اور باقی ماندہ اصحاب صف میں کھڑے ہو گئے۔ امام حسینؑ [illegible] کی [illegible] اصحاب کی تاب نہ لا کر چند لمحوں کے بعد راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

اس موقع پر یہ بھی ممکن تھا کہ امام حسینؑ خیمہ کے اندر جا کر نماز ادا کر لیتے [illegible] اسی طرح نماز ادا کر لیتے کہ اسلام میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا [illegible] لیکن امام حسینؑ مستحب کی پابندی کے ساتھ دشمن پر اپنی حقانیت کا اظہار بھی کرنا چاہتے [illegible] اسلام کے علمبردار تو سب ہی ہیں۔ لیکن ہنگام نماز تمہیں فریضۂ الٰہی کا ہوش نہیں [illegible]

پیش کر رہے ہیں اور یہ اس امر کی علامت ہے کہ حقیقت اسلام میرے پاس ہے اور مخالف کے پاس جھوٹے دعوے اور ریاکاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۴۳۔ بلند ترین مرتبہ

اسی وقت میں امام حسینؑ نے ابو ثمامہ کو جو عظیم ترین دعا دی ہے وہ یہ ہے کہ خدا تمہیں نماز گزاروں میں قرار دے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام کی نگاہ میں یہ صفت کا درجہ بلند ترین ہے جس کی دعا شہیدوں [illegible] کو بھی دی جا سکتی ہے کہ اس سے [illegible] کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ یہ بات اس امر سے بھی واضح ہے کہ نماز گزاروں میں شمار ہونے کی دعا خلیل خدا نے اپنے لئے اور اپنی ذریت کے لئے کی تھی جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم ترین مرتبہ [illegible] ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

مزید یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ امام حسینؑ کے الفاظ میں "مصلین" کا لفظ استعمال ہوا ہے [illegible] " اور خلیل خدا کی دعا میں "مقیم الصلوٰۃ" یعنی نماز قائم کرنے والا [illegible] واضح ہوتا ہے کہ [illegible] نماز [illegible] کرتا ہے [illegible] کا عظیم ترین مرتبہ [illegible] نماز قائم کرتا ہے [illegible] اعظم ترین درجہ [illegible] خلیل خدا نے [illegible] کی تھی [illegible] مصداق امام حسینؑ ہی کا وجود مقدس ہے جس کی بارگاہ میں [illegible] اعتراف [illegible] ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی ہے اور زکوٰۃ ادا کی ہے۔

[illegible] حیثیت

[illegible] یہ بھی ممکن تھا کہ جس طرح تمام مراحل جہاد پر امام حسینؑ ہدایت دیتے تھے اور [illegible] عمل کرتے تھے۔ ظہر کے ہنگام بھی امام حسینؑ اعلان فرما دیتے کہ اب وقت [illegible] قوت کر کے پہلے نماز ادا کر لو۔ [illegible] جہاد کا سلسلہ شروع ہوگا [illegible] وقت بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن امام حسینؑ نے سکوت اختیار فرما کر

سب کے حالات کا جائزہ لیتے رہے یہاں تک کہ ابو ثمامہ نے گزارش کی اور امام حسینؑ نے نماز کا اعلان فرما دیا۔ جس سے تاریخ عالم پر حقیقت واضح ہو گئی کہ امام حسینؑ کے چاہنے والوں کی پہچان صرف یہ نہیں ہے کہ امام حکم دیں تو مرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نوافل کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور جنگ کی سختیاں بھی انہیں نوافل سے غافل نہیں بنا سکتی ہیں۔ درحقیقت امام کے اصحاب اور وفا کا ایک عظیم امتیاز ہے جس کی مثال بڑے بڑے انبیاء کے اصحاب میں اور ان جیسے لوگ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ دوسرے افراد کا کیا تذکرہ ہے۔

۴۵۔ وسیلہ اتمام حجت

ابو ثمامہ کے تقاضے پر امام حسینؑ نے نماز جماعت کا اہتمام شروع کیا تو پہلے حبیب ابن مظاہر کو حکم دیا کہ فوج دشمن پر حجت تمام کریں اور ان سے کہیں کہ وقت نماز آ گیا، جنگ موقوف کر دو۔ فرزند رسولؐ نماز ادا کرنا چاہتا ہے اور تم بھی تو کلمہ گو ہو اور اپنے کو مسلمان کہتے ہو، تمہیں نماز کا خیال کیوں نہیں ہے۔؟

حصین بن نمیر نے بات کو مذاق میں اڑا دیا اور تہذیب و ادب کا دامن چھوڑ کر جملہ استعمال کیا جس کی تاب نہ لا کر حبیب ابن مظاہر نے حملہ بھی کر دیا۔ لیکن یہ بات بہرحال واضح ہو گئی کہ امام حسینؑ کی نگاہ میں مدعیان اسلام اور منافقین پر حجت تمام کرنے کا بہترین ذریعہ بھی نماز ہے کہ نماز کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو گویا ان کے دلوں میں ایمان کا شائبہ پایا جاتا ہے ورنہ صرف زبانی کاروبار ہے اور بس۔ حقیقت ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام حسینؑ کو فوج دشمن کو دعوت نماز دے کر حجت تمام کرنا ویسا ہی امر تھا جیسے امیر کائنات نے ۱۹ ماہ رمضان کی صبح کو مسجد کوفہ میں ابن ملجم کو یہ کہہ کر بیدار کیا "وقت نماز آ گیا ہے"۔

ظاہر ہے کہ ابن ملجم کے بیدار کرنے کی کوئی حیثیت ہے اور نہ لشکر یزید کی کوئی دعوت بیدار ہو سکتی ہے۔ لیکن امام حسینؑ اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے تھے کہ ان لوگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ورنہ ان کے لئے نماز سے بہتر کوئی [illegible]

ان کی نگاہ میں نماز کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

۴۶۔ مظہر اسلام ناب محمدی

عاشور کے دن امام حسینؑ نے مختلف انداز سے فوج دشمن کو خطاب کر کے اپنی حجت تمام کی۔ وہ اپنی حقانیت اور مظلومیت کا اعلان کیا یہاں تک کہ ایک مرتبہ فوج دشمن کے سامنے یہ سوال بھی رکھ دیا کہ "آخر مجھ سے کس بات پر جنگ کر رہے ہو۔؟ میں نے دین میں کوئی تبدیلی کی ہے، احکام شریعت میں کوئی ترمیم کی ہے۔ کسی کا ناحق خون بہایا ہے، دین اسلام سے انحراف اختیار کیا ہے"۔

فوج دشمن کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بہذا سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارے دلوں میں آپ کے باپ کا بغض ہے اور ہم آپ سے ان کے مظالم کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔

جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دشمن کے پاس کوئی حرف اعتراض نہیں ہے اور اس کی عداوت سراسر بغض و عناد پر مبنی ہے۔ حسینؑ اس حقیقت کا بھی اظہار کرنا چاہتے تھے کہ امام حسینؑ نے دین کو تبدیل نہیں کیا ہے اور ان کے پاس جو دین ہے وہ دوسرا دین نہیں ہے بلکہ حقیقی دین ہے اور اسلام [illegible] کی تصویر ہے۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کا فریضہ ہو گیا تھا کہ دین کے صحیح خدوخال کو نمایاں کریں اور یہ بتائیں کہ اسلام میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ وہی ہے اور اس کے اعمال ان کے سپرد ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام تیر و تلوار کے ذریعہ انجام پا سکتا تھا اور نہ نصیحت ہو سکتی تھی۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ دشمنوں کی نگاہ کے سامنے نماز قائم کریں اور دین کی روح کو واضح کریں [illegible] کے احکام تبدیل نہیں ہوئے ہیں اور جس کا مظہر سب سے بڑا نماز ہے۔ [illegible] آج بھی اپنے اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں اور جس کی خاطر تیروں کے سامنے سینے [illegible] قربانی دینے کو تیار ہیں لیکن [illegible]

ہمارا معاشرہ یہ دعویٰ کرتا ہے، اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ پیغمبر اکرم کے بعد جو خطرناک تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ اپنی اصلی صورت پر رہتی ہے۔ دعا یہ ہے کہ جو صحرائے کربلا میں دشمنوں کی تلواروں کے سائے میں ... جس کا اثر ... تمام امت کی شکل میں پیغمبر اکرم کا ذکر کر رہا ہے۔

۴۷۔ سرچشمۂ طاقت

دنیا کی ہر قوم اپنے وجود کے لئے ایک سرچشمۂ طاقت کی تلاش میں رہتی ہے جس کی طرف سے طاقت کی سپلائی برابر جاری رہے۔ ورنہ قوم یا ملک کے پاس کسی قدر بھی اسلحہ کیوں نہ ہو اگر سپاہیوں کو اندازہ ہو جائے کہ اس کے یہاں سپاہیوں کی سپلائی بند ہو گئی ہے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور میدان جنگ میں ان کا جوش ختم ہو جاتا ہے۔

تجارتی میدانوں میں انسان سرمایہ کے سرچشمہ کا محتاج ہوتا ہے اور جنگی میدانوں میں اسلحہ اور فوجوں کے سرچشمہ کا۔ سیاسی دنیا میں احزاب کی طاقت درکار ہوتی ہے اور معاشرتی دنیا میں عشیرہ، قبیلہ، قوم اور خاندان کی قوت۔

انسان کی زندگی میں ایک ایسا سرچشمۂ طاقت ہے جو ان تمام قوتوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے ... ایک ... کے سہارے میدان کو فتح کر لیتا ہے اور اتنی عظیم طاقت کا احساس کرتا ہے جو اسلحوں اور ... کے ذریعہ حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس اعتبار سے بڑا طاقتور کون ہوگا جس کے پاس "علیٰ کل شیء قدیر" جیسی ذات ہو اور اس سے ہر وقت ملاقات اور عرض مدعا کا امکان بھی ہو۔ یہ ایسا سرچشمۂ طاقت ہے جس کی سپلائی جنگ کے بند ہو جانے سے رک جائے یا دشمن کے آمادہ ہو جانے کے بعد ... ہو جائے ... کی دشواری کی بنا پر موقوف ہو جائے بلکہ اس کی طرف سے سپلائی سخت ترین حالات میں زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی تعریف ہی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ مضطر کی دعا کو قبول کرتا ... جب سارے وسائل منقطع ہو جاتے ہیں تب کام آتا ہے۔ وہ انسان کی آواز سنتا بھی ہے حاجت روائی کی قدرت بھی رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کو وہ

بعد سے سہورت کرنا پڑے گا ... میں ادا نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ کائنات کی ساری طاقتیں مخلوقات کی طاقتیں ہیں اور وہ خالق کائنات ہے جس نے طاقتوں کی بھیک مخلوقات پر تقسیم کر دی ہے تو ظاہر ہے کہ بھیک لینے والا غنی مطلق کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

۴۸۔ علاج امراض

نماز اپنے اعمال و اذکار کے اعتبار سے جسمانی اور روحانی دونوں طرح کے امراض کا علاج بھی ہے۔ دور حاضر میں جو فطری طریقۂ علاج ورزش کی شکل میں دریافت ہوا ہے اس کے ماہرین بھی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ نماز کے حرکات و سکنات میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو طبیعی علاج کے لئے ضروری ہیں۔ یہاں تک کہ بعض علماء طب کا کہنا ہے کہ انسان رات بھر آرام کرنے کے بعد جب سحر کے ہنگام اٹھ کر نماز شب ادا کرتا ہے اور پھر نماز صبح ادا کرتا ہے تو اس کے جسم کو وہ ساری ورزش حاصل ہو جاتی ہے جو ایک انسان کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے بشرطیکہ اس کے بعد پھر بستر کا شکار نہ ہو۔

نماز کے اعمال میں پہلا قیام اور اس کے بعد رکوع۔ رکوع کے بعد پھر قیام۔ قیام کے بعد جھکاؤ۔ جھکاؤ کے ... سجدہ۔ پھر دوبارہ اٹھ کر ایک خاص کیفیت کے ساتھ بیٹھنا۔ پھر دوبارہ سجدہ کرنا۔ پھر دوبارہ اٹھ کر بیٹھنا اور پھر دوبارہ اس پورے عمل کی تکرار کرنا ... اسی طرح ... رکعت تک تکرار کرنا ... اور ہر دوسری رکعت میں ... ہاتھوں کو بلند کرنا ... دعا میں اٹھائے رہنا۔ یہ وہ اعمال ہیں جنہیں جدید ترین علم بھی ... نہیں کر سکتا ہے ... بہترین طریقۂ علاج ایک مرد مسلمان کو صرف نماز کے طفیل میں حاصل ہو جاتا ہے اور اسے الگ سے کسی ورزش کے میدان میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

پھر ... بات یہ بھی ہے کہ ورزش کے ... جسمانی علاج کے ساتھ کبھی کبھی روحانی ... امراض بھی پیدا ہو جاتے ہیں لیکن نماز جسمانی علاج کے ساتھ روحانی امراض پر بھی نگاہ رکھتی ہے ... روحانی قسم کا ... نہیں پیدا ہونے دیتی ہے۔ ... یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ کسی ورزش ... عام میں ... کا مظاہرہ ... انسان ... ہو جائے ... ورزش کرے۔

۴۹۔ تھرمامیٹر

جس طرح دنیا میں تھرمامیٹر کے ذریعہ جسم کے اندر چھپے ہوئے بخار کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ایک بہترین تھرمامیٹر ہے جس سے انسان کے ایمان … کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس نفاق کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے اور … اوقات خود صاحب مرض کو بھی محسوس نہیں ہوتا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۲ میں منافقین کے سلسلہ علامات کی آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انہیں خود دھوکہ میں رکھے ہوئے ہے اور ان کی خصوصیت کی علامت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسلمندی کے ساتھ۔ صرف لوگوں کو دکھانا چاہتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ … تمام … اس … کا ہے جس کا تعلق دل کے اندر چھپا ہو … اور معاشرہ اسے محسوس نہ کر سکے لیکن پروردگار … نے اس راز کو اس طرح واضح کر دیا کہ یہ لوگ نماز میں شوق نہیں رکھتے ہیں اور کسلمندی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ روحانی بیماری کے سبب … کے … کا … ہو سکتا ہے … صاحب ایمان … ہے … میں … ہوگا … کے اندر روح ایمان نہیں ہے تو عادت کی مجبوری کی بنا پر نماز تو ادا کر دے گا لیکن اس کے عمل ہی سے اس کی بددلی کا اندازہ کر لیا جائے گا۔

۵۰۔ ترک نماز وجہ حسرت

سورۂ مدثر میں روز قیامت کا ایک نقشہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت و جہنم کے فیصلے کے بعد جب سب اپنی اپنی منزل پر پہونچ جائیں گے تو اہل جنت جہنم والوں سے پکار کر پوچھیں گے کہ تمہیں آج ہمارے ایمان و کردار اور وعدۂ الٰہی نے یہاں تک پہونچا دیا ہے۔ تمہیں کون سی چیز جہنم میں لے گئی ہے۔ تو وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے

اور بیہودہ بکواس کرنے والوں کی بکواس میں شریک ہو جاتے تھے اور روز قیامت کا انکار کرتے تھے یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی اور ہم اس انجام کو پہونچ گئے۔

ان آیات کریمہ میں جرائم کی فہرست میں سب سے پہلے نماز نہ پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل جہنم کو کسی دوسرے عمل خیر کے انجام نہ دینے کی حسرت ہو یا نہ ہو ترک نماز کی حسرت ضرور ہوگی لہٰذا انسان عاقل کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس کا نتیجہ حسرت و اندوہ کی شکل میں سامنے آئے۔

۵۱۔ شکست سکوت شب

رات کے سناٹے میں … سب … سو رہے تھے … سکون میں تھے … کے چین و سکون میں گم … راحت میں … کوئی انسان کسی طرح … برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ایک مرتبہ فجر کا ہنگام آ گیا اور نمازی نے اٹھ کر … کی آواز بلند کر دی۔ اور اس نے سکوت شب کو توڑ … کس حسن کے ساتھ کہ آواز … کی گہرائیوں میں … پہلے کبریائی پروردگار کا اعلان کیا … کے بعد اس کی وحدانیت کی گواہی دی … کے بعد … کے بندوں کی منزل کا اعلان کیا۔ اس کے بعد … کے پیغام کو عام کیا اور آخر میں پھر کبریائی … وحدانیت کا اعلان کر کے سکوت شب کو …

انسان غور کرے تو اندازہ ہوگا کہ … کے سکوت کو ختم کرنے … کوئی عظیم … نہیں ہے کہ … بہترین … کا … ہے جس سے … کے … سکوت … شب … نہیں بلکہ … جس سے … ہیں … اور جس میں … کا جواب … ہے۔ … بہترین عمل کا … بھی ہے۔

۵۲۔ تنبیہ الغافلین

… اگرچہ … ہے … کا سلسلہ عہد رسول کے دور … جیسے … ہوتا ہے۔ … اسلام نے اس … کو … خصوصیت یہ بھی … ہے کہ … زندگی کے اظہار کے ساتھ … الغافلین بھی بنا دیا … ہے … ہے کہ

اس ناہمواری سے اٹھ کر مسجد میں جا کر نماز ادا کرے، اور کسی کو حرص بھی نہ ہونے پائے۔ وہ اس طرح کی خود غرضی کو پسند نہیں کرتا ہے لہٰذا اس نے نماز سے پہلے اذان کا حکم دے دیا اور اذان میں دعوت الی اللہ کے کلمات رکھ دیے تاکہ انسان اپنی آواز کو بلند کر کے تمام افراد کو باخبر کر دے، اور انھیں پہلے توحید و رسالت جیسے عظیم مسائل کی طرف متوجہ کرے، اور اس کے بعد نماز، نجات اور بہترین عمل کی دعوت دے تاکہ نماز کے نام پر ہوشیار نہ ہو سکے تو نجات اور کامیابی کے نام پر متوجہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو بہترین عمل کا نام سن کر متوجہ ہو جائے اور اس طرح زندگی سے بیکاری اور بیگاری کا مسئلہ ختم ہو جائے اور انسان تمام کاموں کے درمیان نماز کی عظمت کا احساس کر کے ہر وقت بارگاہ الٰہی میں حاضری کے لیے تیار رہے۔

۵۳۔ حل مسائل سیاست

دنیا کے ہر ملک میں چند طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں ارباب سیاست ہمیشہ پریشان رہتے ہیں اور اگر کوئی ملک ان مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ سے محفوظ بھی ہے تو عالمی سطح پر بہرحال یہ مسائل موجود ہیں اور ارباب سیاست تمام تر ان مسائل کے حل سے عاجز ہیں اور جس قدر بھی حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مسئلہ الجھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ان مسائل میں ایک مسئلہ رنگ و نسل کا ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں سفید رنگ والا کالے رنگ والے سے افضل تصور کرتا ہے، اور اس کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔ جنوبی افریقہ کا مسئلہ ساری دنیا کو معلوم ہے اور اسی کی روشنی میں دنیا کا ہر درد مند انسان پریشان ہے۔

دوسرا مسئلہ زبان کا ہے کہ ہر انسان کو اپنی زبان پیاری ہوتی ہے اور اس کے تعصب میں دوسری زبان سے نفرت ہوتی ہے یا وحشت۔ اور ساری دنیا کے انسانوں کو ایک زبان پر جمع کرنا ممکن ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات ایک ہی ملک کے باشندے آپس میں لسانیاتی جھگڑوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ملک کا امن و امان خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

تیسرا مسئلہ طبقات کا ہے کہ سماج میں امیر و غریب، حاکم و محکوم، غلام و آقا جیسے طبقات بہرحال پائے جاتے ہیں اور یہ طبقات ایک طبقہ میں احساس برتری اور غرور پیدا کرتے ہیں اور دوسرے

طبقہ میں جذبۂ نفرت و بغاوت اور ارباب سیاست کے پاس ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔ نہ اوپر کے طبقہ والے نیچے اترنے پر آمادہ ہیں اور نہ نیچے طبقہ والے ان کی بیجا بلندی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اسلام نے ان تمام بنیادی سیاسی اور عالمی مسائل کو ایک نماز کے ذریعہ حل کر دیا جہاں سیاہ و سفید، بلند و پست ذات کا کوئی تفرقہ نہیں ہے اور ہر شخص ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ یہاں غلام اور آقا کا بھی امتیاز نہیں ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ غلام صف اول میں ہو اور مالک صف دوم بلکہ صف آخر میں ہو۔

زبان کے مسئلہ کو بھی اسلام نے یوں حل کر دیا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک خاص کلام کے ذریعے اور ایک خاص زبان میں نماز ادا کرنے کی دعوت دے دی تاکہ ہر انسان دائرۂ اسلام میں قدم رکھنے کے ساتھ اس زبان سے مانوس ہو جائے اور اسے کسی طرح کی وحشت نہ ہو کہ اگر کسی وقت عالمی نظام رائج کرنا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس زبان سے مانوس رہیں۔ اور کسی طرح کی وحشت کا شکار نہ ہوں۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

روزہ

اسلامی عبادات میں دوسری اہم ترین عبادت کا نام ہے روزہ۔

روزہ یعنی صبح صادق سے وقت مغرب تک قربت الٰہی کے ارادے سے تمام چیزوں سے پرہیز کرنا جنہیں روزے کے لیے مبطل قرار دیا گیا ہے۔

روزے کے بارے میں اسلامی روایات میں جو فضیلت وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ اسے جہنم کی سپر قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کو آتش جہنم سے بچانا چاہتا ہے تو اسے روزے کا سہارا لینا پڑے گا کہ اس کا اجر و ثواب آخرت میں عذاب جہنم سے بچا لیتا ہے اور اس کا انداز دنیا میں جہنم سے بچنے کا سلیقہ سکھا دیتا ہے۔

روزہ دار جب شدید گرمی میں بھوک پیاس کی شدت کا احساس کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ قیامت کی گرمی کا کیا عالم ہوگا جہاں آفتاب سوا نیزے پر ہوگا اور انسان کا پسینہ ٹپک رہا ہوگا اور کھانے کو کچھ نہیں ہوگا اور پانی کی … ایک سایہ پروردگار ہوگا اور وہ بھی انھیں … کو حاصل ہوگا جو اپنے ایمان و کردار کی بنا پر اس سایۂ رحمت کے حقدار ہوں گے۔

حدیث قدسی میں روزے کے بارے میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دینے والا ہوں … "میں ہی اس کی جزا ہوں"۔ روزہ دار … تک پہونچ جاتا ہے جس کے بعد اس کا حق ہو جاتا ہے کہ … اس کی نگاہ کے سامنے یوں جلوہ گر ہو جاؤں کہ گویا اس نے زندگی بھر کا صلہ حاصل کر لیا ہے اور وہ میرے … میں اس کا ہو گیا ہو۔

روزے میں بیشمار انفرادی اور اجتماعی فوائد اور امتیازات پائے جاتے ہیں جن کا شمار کر

نہیں ہے۔ لیکن سردست صرف چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور اس سے پہلے روزہ اور ماہ رمضان کے بارے میں سرکار دو عالمؐ کے ایک خطبہ کا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جو آپ نے ماہ شعبان کے آخری جمعہ کے دن ارشاد فرمایا تھا اور لوگوں کو ماہ مبارک کے ورود کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اس خطبہ کو امام رضاؑ نے نقل کیا ہے اور اپنے آباء و اجداد کے حوالے سے ایک مسلسل سند کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔ جو سلسلہ امیر المومنینؑ پر تمام ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ہمارے درمیان اس طرح خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تمہاری طرف اللہ کا مہینہ برکت و رحمت و مغفرت کے ساتھ آ رہا ہے۔ وہ مہینہ ہے جو خدا کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے۔ اس کے دن تمام دنوں سے، راتیں تمام راتوں سے افضل ہیں۔ اس کی ایک ایک ساعت تمام ساعات سے بہتر ہے۔ اس مہینہ میں تمہیں پروردگار کی ضیافت میں مدعو کیا گیا ہے … لہٰذا نیک نیت اور پاکیزہ قلب کے ساتھ اس سے دعا کرو کہ تمہیں اس کے روزہ و تلاوت قرآن کی توفیق عنایت فرمائے کہ اگر کوئی شخص اس مہینہ میں مغفرت سے محروم ہو گیا تو اس سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں ہے۔

اس کی بھوک اور پیاس کے ذریعہ قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔

فقراء و مساکین کو صدقہ دو۔

بزرگوں کا احترام کرو۔

چھوٹوں پر رحم کرو۔

قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

زبانوں کو قابو میں رکھو۔

جن چیزوں کا دیکھنا حرام ہے ان سے آنکھوں کو محفوظ رکھو۔

دوسروں کے یتیموں پر مہربانی کرو تاکہ کل لوگ تمہارے یتیموں پر رحم کریں۔

گناہوں کے بارے میں توبہ کرو۔

نماز کے اوقات میں دعا کے لئے ہاتھوں کو بلند کرو کہ یہ بہترین ساعت ہے جس میں پروردگار بندوں پر نگاہ رحمت رکھتا ہے اور ان کی دعا کو قبول کرتا ہے ان کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔

اے لوگو! تمہارے نفوس تمہارے اعمال کے ہاتھوں رہن ہیں لہٰذا استغفار کے ذریعہ انھیں آزاد کراؤ۔ تمہاری پشت پر اعمال کا بوجھ ہے لہٰذا طولانی سجدوں کے ذریعہ سے ہلکا بناؤ۔

یاد رکھو کہ پروردگار نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ نمازیوں اور سجدہ گذاروں پر عذاب نہیں کرے گا اور انھیں ہول قیامت سے محفوظ رکھے گا۔

ایہا الناس! اگر کوئی شخص کسی مومن روزہ دار کو افطار کراتا ہے تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا ہے اور اپنے گناہوں کو بخشوا لیا ہے۔

اسی درمیان کسی شخص نے یہ سوال کر لیا کہ ہر شخص تو دعوت افطار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے؟ — فرمایا کہ چاہے ایک دانہ خرما یا ایک گھونٹ پانی سے ہو لیکن اس کے ذریعہ اپنے کو جہنم سے بچاؤ۔

ایہا الناس! جو شخص اس ماہ میں اپنے اخلاق بہتر بنائے گا وہ پل صراط سے گذر جائے گا جہاں لوگ برابر پھسل کر گر رہے ہوں گے۔ اور جو اپنے غلاموں کے کاموں میں سہولت برتے گا اس کا حساب آسان ہو جائے گا۔

اور جو اپنے شر کو روکے گا خدا اس سے اپنے عذاب کو روک دے گا۔

اور جو کسی یتیم کا احترام کرے گا خدا اسے محترم بنا دے گا۔

اور جو قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا خدا اسے اپنی رحمت سے ملا دے گا۔

اور جو قطع رحم کرے گا خدا اسے اپنی رحمت سے قطع کر دے گا۔

اور جو کوئی سنتی نماز ادا کرے گا خدا اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ عنایت کرے گا

اور جو کوئی فریضہ ادا کرے گا اسے عام حالات سے ستر گنا زیادہ اجر دیا جائے گا

اور جو زیادہ نمازیں ادا کرے گا اس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔

اور جو قرآن مجید کی ایک آیت کی تلاوت کرے گا اسے دوسرے مہینوں میں قرآن ... کا ثواب دیا جائے گا۔

ایہا الناس! دیکھو اس مہینہ میں جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ خدا ... تمہارے لئے بند نہ ہونے پائیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ کوشش کر...

کہ کھلنے نہ پائیں۔ شیطانوں کو قید کر دیا گیا ہے۔ دعا کرو کہ تم پر مسلط ہونے نہ پائیں۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ میں نے اس موقع پر کھڑے ہو کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ — فرمایا محرمات الٰہیہ سے پرہیز کرنا۔ اور یہ کہہ کر رونے لگے۔

میں نے عرض کی کہ حضور گریہ کیوں فرما رہے ہیں؟ — فرمایا کہ اس مہینہ میں تمہارے بارے میں حرم کو حلال کر لیا جائے گا۔ میں وہ منظر دیکھ رہا ہوں جب تم سجدۂ پروردگار میں ہو گے اور دنیا و آخرت کا بدترین شخص تمہارے سر پر ضرب لگائے گا اور تمہارے محاسن خون سے رنگین ہو جائیں گے۔

میں نے عرض کی کہ حضور! اس طرح میرا دین محفوظ رہے گا؟ — فرمایا بے شک — یا علیؑ! تمہارا قاتل میرا قاتل ہے اور تمہارا دشمن میرا دشمن ہے۔ جس نے تمہیں برا بھلا کہا اس نے مجھے برا بھلا کہا کہ تم میرے نفس کی جگہ پر ہو۔ تمہاری روح میری روح ہے اور تمہاری طینت میری طینت۔ خدا نے مجھے اور تمہیں پیدا کر کے منتخب قرار دیا ہے۔ میرا انتخاب نبوت کے لئے ہوا ہے اور تمہارا انتخاب امامت کے لئے ہوا ہے۔ تمہاری امامت کا منکر، حقیقتاً میری نبوت کا منکر ہے۔

(عیون اخبار الرضاؑ شیخ صدوقؒ ج ۲، ص ۲۶۵)

۱۔ روزہ عمل بے ریا

ریاکاری عبادات میں نیت کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی عمل ضرور پایا جاتا ہے۔ نماز میں رکوع و سجود دکھائی دیتے ہیں۔ حج میں ارکان و مناسک حج ہیں۔ زکوٰۃ میں مال نکالا جاتا ہے۔ جہاد میں رزم آزمائی کی جاتی ہے۔ امر بالمعروف میں دوسرے کو کسی عمل کا مطالبہ کیا جاتا ہے — لیکن روزہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نیت کے علاوہ کوئی عمل نہیں ہے اور اسی لئے بعض علماء نے اسے عمل کے بجائے ذہنی عبادت قرار دیا ہے کہ اس کا تعلق عمل سے نہیں بلکہ باطن سے ہے اور عمل سے عدم عمل سے ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جس عبادت میں کوئی ظاہری عمل نہ ہوگا اس میں ریاکاری کے امکانات کم ہوں گے۔ اس لئے گویا یہاں ریاکاری اور دکھاوے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حدیث قدسی میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "الصوم لی" روزہ صرف میرے لئے ہوتا ہے لہذا اس کی جزا کی ذمہ داری بھی میرے ہی اوپر ہے اور عمل اس قابل ہے کہ اس کا اجر میں خود بن جاؤں تاکہ بندہ یہ محسوس کرے کہ جس نے ایسا مخلصانہ عمل انجام دیا ہے گویا خدا کو پالیا ہے۔

۲۔ روزہ اخلاص محض

مذکورہ خصوصیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روزہ ایک اخلاص مجسم عبادت کا نام ہے جس کا دار و مدار صرف نیت پر ہے۔ یہاں مسائل میں دلچسپ فرق پیدا ہوتا ہے [illegible] باطل ہو جاتا ہے جب کہ نماز کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں [illegible] رکعت ادا کرنے والا اگر یہ خیال کرے کہ تیسری رکعت میں نماز توڑ دے گا اور پھر تیسری رکعت آنے سے پہلے دوبارہ دل میں توبہ کرے تو نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن روزہ دار اگر صبح کو یہ ارادہ کرے کہ بارہ بجے دن میں روزہ توڑ دے گا تو روزہ اسی وقت سے باطل ہو جاتا ہے اس لئے کہ [illegible] سوائے نیت کے کچھ نہیں ہے۔ اور اگر نیت ہی سالم نہیں ہے تو انسان کے [illegible] [illegible] میں ایسا کہا جائے کہ [illegible] نیت ہیں کہ ان کا سرچشمہ نیت کے [illegible] اور روزہ نیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی نیت ہی وہ خصوصیت ہے [illegible] اعمال میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کے [illegible] اور وہ [illegible] میرے ہاتھ پیر آزاد ہوتے تو بھی میں نماز ضرور ادا کرتا تو اس کو نمازی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا ہی آدمی اگر یہ طے کرے کہ اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد بھی ہوتے تو بھی میں [illegible] روزہ شکن امور سے پرہیز کرتا تو اسے روزہ دار بہرحال شمار کر لیا جائے گا اور [illegible] ثواب مل جائے گا اور [illegible] رسائل عملیہ میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص نے [illegible] تک مفطرات میں سے کسی چیز کا استعمال نہیں کیا ہے اور غروب کے قریب مستحق روزہ کی [illegible] اور [illegible] کر لیا ہے کہ [illegible] استعمال کرنے کا [illegible] مل جاتا [illegible]

روزہ کی نیت کر چکا ہوتا تو بھی مفطرات میں کسی شے کا استعمال نہ کرتا تو پروردگار عالم اس کے روزے کو روزہ شمار کر لیتا ہے اور اسے روزہ دار کا اجر و ثواب دے دیتا ہے۔

[illegible] روزہ عمل پر موقوف نہیں ہے بلکہ ماہ [illegible] روزہ میں بھی اگر عاقل انسان نے [illegible] [illegible] بے ہوش ہو جائے [illegible] روزہ کی نیت کر لی ہے تو [illegible] بظاہر [illegible] ہو گیا ہے لیکن روزہ مکمل ہی رہے گا اور اسے ایک روزہ کا اجر و ثواب مل جائے گا قضا کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

۳۔ لہجہ وجوب

روزہ کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ پروردگار عالم نے اسے فرض کرنے کے لئے ایک ایسا لہجہ اختیار فرمایا ہے جو تمام عبادات میں نہیں پایا جاتا ہے نماز اور زکوٰۃ کو امر کے ذریعہ [illegible] ہے۔ حج کو "علی الناس" کہہ کر فریضہ قرار دیا ہے۔ [illegible] میں "ولتکن منکم [illegible]" [illegible] ہے۔ لیکن روزہ میں کتابت کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے "کتب علیکم [illegible]" [illegible] کتابت کسی امر کو [illegible] مستحکم بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جس [illegible] کا خطرہ نہیں ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے اس لہجہ کو تمام حیات آفریں مسائل کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ [illegible] کے بارے میں "کتب علیکم القتال" کہا گیا ہے تاکہ [illegible] کی [illegible] اور منفعت کا [illegible] ہے اس میں کسی طرح کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ [illegible] کے بارے میں بھی [illegible] اختیار کیا گیا ہے اور [illegible] صاف وضاحت کر دی گئی ہے [illegible] حیات کا ذریعہ ہے بلکہ اصل حیات ہے۔

وصیت کے بارے میں یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ وصیت مال کی [illegible] اس طرح گویا مرنے والے کا اختیار اور تصرف زندہ ہے اور وہ اپنے مال میں خود [illegible]

[illegible] بالاتر یہ ہے کہ پروردگار نے اپنی رحمت کے بارے میں بھی یہی انداز اختیار

کہا ہے "کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلیٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَة" یعنی تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لکھ دی ہے اور اسے اپنا فریضہ قرار دے لیا ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ رحمت کی بات آئی ہے تو [illegible] کا استعمال کیا گیا ہے اور اپنے کو لکھنے کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور روزہ جیسے زحمت والے عمل کی بات آئی ہے تو اس کی رحمت نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ اسے اپنی طرف منسوب کرکے [illegible] جائے بلکہ صیغہ کو مجہول بنا دیا گیا ہے جب کہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بندوں کے اوپر کسی بھی فریضہ کے لکھنے اور واجب کرنے کا حق پروردگار کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔

۴۔ روزہ سیرتِ امم

"کُتِبَ عَلَی الَّذِینَ مِن قَبْلِکُمْ" ایک طرف انسان کے ذہن سے احساس [illegible] کے نکالنے کا ذریعہ ہے کہ یہ کوئی نیا عمل نہیں ہے جس میں اس امت کو مبتلا کر دیا گیا ہے بلکہ یہ دور قدیم سے چلا آ رہا ہے اور اب اس کے قواعد و احکام میں کافی سہولت پیدا کر دی گئی ہے۔ پہلے روزہ [illegible] بات کرنے پر بھی پابندی تھی لیکن اب وہ پابندی اٹھا لی گئی ہے۔ پہلے رات کے وقت بھی [illegible] سے قربت حرام تھی لیکن اب رات کے وقت [illegible] دور ہو گئی ہے۔

اور دوسری طرف اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اس کی افادیت میں [illegible] پروردگار عالم نے کسی قوم کو اس کے خیرات و برکات سے محروم نہیں رکھا ہے [illegible] طرز بندگی اور حیات آفرین عمل میں شریک رکھا ہے۔ درحقیقت [illegible] کے لئے ہر دور میں [illegible] ضروری ہے [illegible] کے لئے زکوٰۃ کی ضرورت [illegible] روزہ بھی ضروری [illegible] کے پاس ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ [illegible] شیطان کے وسوسوں [illegible] اپنے اخلاص عمل کو محفوظ رکھ سکے [illegible] کسی طرح کا [illegible] اس کے باوجود [illegible] ہونے کا اہتمام کرتا رہے۔

۵۔ روزہ خیر محض

روزہ کا قانون نافذ کرنے کے بعد سورۂ بقرہ آیت ۱۸۴ میں اعلان ہوتا ہے کہ روزہ صرف چند روزہ عبادت ہے جسے ماہ رمضان میں واجب کیا گیا ہے لہٰذا اگر کوئی ایسا مسافر یا مریض ہے تو اس کا فرض ہے کہ روزہ رکھے اور اگر مریض ہے تو [illegible] یہ روزہ واجب نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اسی قدر ایام میں دوسرے زمانے میں روزہ رکھے اور کسی شخص کی ساری کمزوری کی بنا پر روزہ مشقت طلب ہے تو اس سے روزہ ساقط کر دیا گیا ہے اور اس کے ذمہ صرف روزانہ ایک مسکین کا کھانا واجب ہے۔ یہ درست ہے کہ زیادہ کار خیر کرے گا تو زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہے کہ روزہ بہرحال خیر ہے۔ تاکہ انسان کے دل و دماغ میں یہ وسوسہ پیدا ہونے پائے کہ جس طرح بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت یا پیاس کے مریض کو معاف کر دیا گیا صرف کفارہ واجب کر دیا گیا ہے کاش دوسرے افراد کو بھی اسی طرح آزاد کر دیا جاتا اور ان پر بھی کوئی ٹیکس لگا دیا جاتا۔ اس لئے کہ صدقات و خیرات [illegible] کی فضیلت اپنی جگہ پر ہے لیکن جو شرف روزہ کو حاصل ہے وہ کسی بدل کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ پروردگار عالم اصل روزہ کی توفیق دے جو خیر محض ہے اور جس کی طرف سرکار دو عالم نے اشارہ فرمایا ہے کہ [illegible] پاک دل کے ساتھ دعا کرو کہ پروردگار [illegible] روزہ کی توفیق دے اس لئے کہ روزہ کی فضیلت کسی دوسرے عمل میں [illegible] ہے اور کوئی دوسری شئی اس کا بدل ہو سکتا ہے۔

۶۔ روزہ وسیلۂ التقویٰ

انسانی زندگی میں کمال کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا تقویٰ اور پرہیزگاری [illegible] انسان جب صحیح عقیدہ کا مالک ہوتا ہے تو اسے صاحب ایمان کہا جاتا ہے اور [illegible] عمل کے [illegible] میں داخل ہو جاتا ہے تو اسے متقی اور پرہیزگار کہا جاتا ہے۔ [illegible] بہت مختصر ہے لیکن وہ تقاضا بہت طویل ہے اور اسی لئے قرآن مجید نے بار بار تاکید

کی گئی ہے کہ ایمان والو تقویٰ پیدا کرو۔ تقویٰ کے بغیر ایمان کی کوئی حیثیت نہیں ہے جب تم نے صراطِ ایمان میں قدم رکھ دیا ہے تو اب منزلِ تقویٰ تک جانے کی فکر کرو ورنہ بیچ ہی منزل میں رہ جاؤ۔

ظاہر ہے کہ ایسے طویل فاصلے کو طے کرنے کے لئے عظیم زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم نے یہی زادِ راہ روزہ کو قرار دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ ایمان والو تم پر روزے اسی لئے واجب کئے گئے ہیں تاکہ تم اسی طرح متقی و پرہیزگار بن جاؤ۔

گویا کہ روزے کے تمام فضائل و مناقب ایک طرف ہیں سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ انسان کو متقی بنانے کا [illegible] ذریعہ ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ [illegible] کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچاؤ کا نام ہے اور روزہ میں انسان کو ان تمام امور کو چھوڑنا پڑتا ہے جن سے پروردگار ناراض ہوتا ہے اور اس کے عذاب کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے جہنم کی سپر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

روزہ [illegible] عمل ہے [illegible] اس میں آدمی کے روزے سے زیادہ پسند ہے جہاں نفس [illegible] دوسرے کی [illegible] حاصل ہوتا ہے [illegible] طاعتِ پروردگار کی بنا پر اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اس طرح جذبۂ طاعت کی ترتیب کو بہترین موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ روزہ انسان کے جذبۂ طاعت کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ اگر یہی [illegible] باقی رہ جائے اور حکمِ خدا کا یہی احترام دل [illegible] سال کے باقی دنوں میں بھی [illegible] انسان کے متقی ہوجانے میں کوئی کسر نہیں رہ سکتی ہے اور انسان واقعاً متقی ہوسکتا ہے۔

۷۔ روزہ جرائم کش

دنیا کے ہر ملک اور ہر نظام میں جرائم کی روک تھام کے لئے مختلف [illegible] کئے جاتے ہیں۔ پولیس متعین کی جاتی ہے، خفیہ سراغ رسانی کا محکمہ قائم کیا جاتا ہے۔

عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کی سزائیں تجویز کی جاتی ہیں اور اس کے بعد بھی جرائم کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ بڑھتا ہی رہتا ہے کہ مجرمین کے لئے قانون شکنی اور قانون کی مخالفت ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس کا سبب [illegible] تقاضات ابھرتے رہے جاتے ہیں اور جرائم کا [illegible] سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے ان جرائم کے اسباب کے لئے ایک [illegible] ایجاد کیا ہے جس کا نام ہے روزہ

اس کے بارے میں ایک طرف اعلان کیا گیا کہ روزہ شہوت کو توڑنے کا بہترین ذریعہ ہے اور اس طرح بہت سے جرائم کا سبب [illegible] ہے اور دوسری طرف روزہ [illegible] کا احساس [illegible] ہے جو جرائم کشی کا بہترین وسیلہ ہے۔ [illegible] اسباب [illegible] جرائم [illegible] جن کا کفارہ روزہ کو قرار دیا گیا ہے اور اس طرح روزہ خود بھی جرائم کے انسداد کا بہترین ذریعہ بن گیا ہے۔ [illegible] ماہِ رمضان کے روزے واجب کئے گئے [illegible] اس کا احساس [illegible] پیدا ہوا لیکن جب یہ اعلان کر دیا گیا کہ ایک روزہ کھانے میں [illegible] روزے رکھنا پڑیں گے [illegible] انسان کو روزہ کا پابند [illegible] اور شاید یہی وجہ ہے کہ کفارہ کے روزوں میں شدت سے کام لیا گیا ہے اور [illegible] کی شرط رکھ دی گئی ہے تاکہ روزہ جرائم کے اسباب کا مکمل وسیلہ بن سکے۔

۸۔ روزہ بدل قربانی

اسلام کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ حج تمتع کے موقع پر حج کرنے والا [illegible] حج کرے [illegible] تو اس کا فرض ہے کہ دس ذی الحجہ کو عید کے دن منیٰ میں [illegible] ایک جانور قربان کرے اور اس قربانی کی یادگار [illegible] جنہیں خدا [illegible] جنت سے دنبہ بھیج کر جنابِ اسماعیلؑ [illegible] ہر صاحبِ حیثیت مسلمان پر [illegible] قربانی بھی واجب ہو جائے

اب اگر [illegible] کثرتِ حجاج میں [illegible] یا حج کرنے والا [illegible] قربانی کے لائق نہ رہ گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اسلام نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا ہے کہ ایسے شخص کو دس روزے رکھنا ہوں گے تین روزہ مکہ مکرمہ میں دوران حج اور سات روزے وطن واپس آنے کے بعد۔ اس طرح دس روزے ایک قربانی کا بدل بن جائیں گے اور مسلمان کو اندازہ ہو جائے گا کہ اگر روزہ کا قانون نہ ہوتا تو اسلام میں کوئی عمل قربانی کا بدل بننے کے لائق نہیں تھا۔

روزہ کے بدل بننے کا راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روزہ خود بھی ایک طرح کی قربانی ہے اور اس سے اس اخلاص کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اگرچہ جانور قربان کرنے کے قابل نہیں ہے تو منزل قربانی سے پیچھے نہیں ہٹا ہے بلکہ اپنی قربانی دینے کے لئے تیار ہے اور دس دن تک مسلسل تمام ضروریات زندگی اور لذات حیات کو نظرانداز کر سکتا ہے۔

۹۔ روزہ کفارۂ جرائم

دین اسلام نے جس طرح روزہ کو قربانی کا بدل قرار دیا ہے اسی طرح بعض جرائم کا کفارہ بھی قرار دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ انسان ماہ رمضان میں روزہ کھا جائے تو اس کا کفارہ بھی روزہ ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان شریف ہو تو اسے ماہ مبارک میں ایک ہی روزہ رکھنا ہے اور مجرم بن جاتا ہے تو اسے ایک روزہ کے بدلے ساٹھ روزے رکھنے ہوتے ہیں اور اس طرح جرم کی شدت کا احساس بیدار رہتا ہے۔

روزہ کے کفارۂ جرائم ہونے کا ایک نمایاں مظہر یہ ہے کہ حج بیت اللہ کے دوران ہر مسلمان کا فرض ہے کہ نویں ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہے اور جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میدان سے قدم باہر نہ نکالے لیکن اگر کوئی شخص جلد بازی یا حکم الٰہی سے بغاوت کی بنا پر میدان عرفات سے غروب سے پہلے نکل جائے تو اس کا فرض ہے کہ ایک اونٹ قربان کرے اور اگر اونٹ قربان نہ کر سکے تو اٹھارہ روزے رکھے۔ جس طرح گوسفند کی قربانی کے بدلے میں ۱۰ روزے واجب کئے گئے تھے۔ جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام میں روزہ جرائم کی روک تھام کا بہترین ذریعہ ہے کہ جب مسلمان کو خیال پیدا ہوگا کہ پانچ دس منٹ کی جلد بازی کا کفارہ ۱۸ روزوں کی شکل میں ادا کرنا ہوتا ہے

سے کام لے گا اور حکم الٰہی میں جلد بازی یا بغاوت سے کام نہ لے گا۔

۱۰۔ روزہ کفارۂ یمین

اسلام کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی چیز کی قسم کھائی ہے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے کہ اسلام میں قسم صرف اللہ کے نام کی ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ کسی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اب اگر انسان نے اللہ کی قسم کھائی اور اسے مخالفت میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ چاہے اس پر عمل کرے یا نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نام خدا کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اسے کسی وقت بھی بطور تفریح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ایسے شخص پر واجب ہے کہ کفارہ ادا کرے اور کفارہ کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دے۔ اور اگر یہ سب کچھ ممکن نہ ہو تو تین دن مسلسل روزہ رکھے کہ اس طرح قسم کی مخالفت کا کفارہ ادا ہو جائے گا اور انسان کو روزہ کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ کتنے بڑے گناہ کا بچانے والا روزے کے علاوہ کوئی نہیں ہے روزہ کے علاوہ کپڑے جیسا کام صرف امیر کر سکتے ہیں۔ غریب آدمی کا واحد سہارا روزہ ہے اور یہ اس امر کی بھی تنبیہ ہے کہ جب غربت کی زندگی گزار رہا ہے تو اس میں حکم خدا کی مخالفت کی جرأت کس طرح پیدا ہو جب کہ اس کے سامنے امراء و سلاطین کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۱۱۔ روزہ تنبیہ الغافلین

سورہ مائدہ آیت ۹۳-۹۵ میں ارشاد ہوتا ہے "ایمان والو! اللہ ان شکاروں کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے جن تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ جاتے ہیں تا کہ وہ یہ دیکھے کہ کون غائبانہ طور پر خوف رکھتا ہے پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

ایمان والو! حالت احرام میں شکار کو نہ مارو اور جو تم میں سے عمداً ایسا کرے گا اس کی

سزا اٹھیں جانوروں کے برابر ہے جسے قتل کیا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں گے اور اس قربانی کو کعبہ تک جانا چاہیے یا مساکین کے کھانے کی شکل میں کفارہ دیا جائے یا اس کے برابر روزے رکھے جائیں تاکہ یہ اپنے کام کا مزہ چکھیں۔ اللہ نے گزشتہ معاملات کو معاف کر دیا ہے لیکن اب جو دوبارہ شکار کرے گا تو اس سے انتقام لے گا اور وہ سب پر غالب آنے والا اور بدلہ لینے والا ہے۔"

آیت کریمہ میں جہاں حالت احرام میں شکار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے موت جرم قرار دیا گیا ہے۔ وہیں اس کے کفارہ کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے اور کفارہ یہ ہے کہ اس جانور کے برابر کا جانور قربان کیا جائے، ورنہ ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت کا گندم لے کر تین پاؤ فی کس کے حساب سے غریبوں پر تقسیم کر دیا جائے، ورنہ یہ بھی ممکن نہ ہو تو ہر تین پاؤ کے بدلے ایک روزہ رکھا جائے تاکہ انسان کو حالت احرام کی بے حرمتی کا احساس پیدا ہو۔ اور جو لوگ صرف شکاری کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے دل میں خوف خدا نہیں ہے۔ ان میں حکم خدا کی عظمت کا احساس پیدا ہو اور یہ روزہ ہو کہ یہ عظمت معمولی شے نہیں ہے، روزہ اس کا آخری علاج یا اس کی معافی کا آخری سبب روزہ ہی ہے۔

۲۔ روزہ وسیلہ اثبات عصمت مریمؑ

پروردگار عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے جناب مریمؑ کو بغیر شوہر کے صاحب اولاد اور ایک عظیم مقام پر امر ولادت کا سلام بھی کر دیا۔ لیکن مریم کے سامنے سب سے بڑا یہ تھا کہ اس بچہ کو لے کر قوم کے سامنے کس طرح جائیں گی اور اس ناہنجار قوم کو کس طرح جواب دیں گی جو مادیت پرست بھی ہے اور کسی طرح کا الزام لگانے سے باز آنے والی بھی نہیں ہے۔ مریمؑ کی پریشانی کو دیکھ کر قدرت نے اس کا بھی انتظام کر دیا کہ اگر کوئی شخص بچے کے بارے میں کوئی سوال کرے تو تم کہہ دینا کہ میں نے روزہ کی نذر کی ہے، میں کسی سے بات نہیں کر سکتی ہوں اور پھر بچہ کی طرف اشارہ کر دینا وہ مسئلہ کی وضاحت کرے گا۔ جناب مریمؑ بچہ کو لے کر قوم کے سامنے گئیں تو قوم نے دیکھتے ہی ہنگامہ کر دیا کہ

باپ کا کردار خراب تھا، نہ ماں بدکردار تھیں تو آخر یہ بغیر شوہر کا بچہ کیسا ہے؟

مریم نے ہدایت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے گہوارہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قوم نے کہا کہ "ہم اس بچے سے کس طرح بات کریں گے جو ابھی گہوارہ میں ہے"؟

جناب عیسیٰؑ نے گہوارہ سے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

قوم خاموش ہو گئی اور عصمت حضرت مریمؑ کا اثبات ہو گیا۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر جناب مریمؑ نے روزہ کو بہانہ بنایا ہوتا اور خود اپنی عصمت کے بارے میں بحث کرتیں تو یہ قوم اس قدر شرافت سے خاموش نہیں تھی۔ یہ تو جناب مریمؑ کے روزہ کی برکت تھی کہ انہوں نے سکوت اختیار کر لیا اور جناب عیسیٰؑ نے گہوارہ سے بولنا شروع کر دیا جس کے بعد قوم کے پاس بولنے کے لئے کوئی بات نہ رہ گئی اور عصمت مریمؑ کا اثبات ہو گیا۔

۱۳۔ روزہ احترام وقت

یوں تو پروردگار نے نماز کو بھی "کتاب موقوت" یعنی وقت معین والی عبادت قرار دیا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اول و آخر میں پابندی وقت کے باوجود درمیان میں بہرحال وسعت پائی جاتی ہے۔ نماز وقت سے ایک سیکنڈ پہلے یا وقت گزر جانے کے ایک سیکنڈ بعد پڑھنا حرام ہے اور یہ ایک ایک سیکنڈ کی اہمیت کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صبح کی دو رکعت کے لئے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی وسعت یا ظہرین و عصرین کے لئے ۶-۷ گھنٹہ کی وسعت انسان کو یہ تقدیر آزادی دیتی ہے کہ انسان اس پورے وقت کے اندر کسی وقت بھی ادا کر سکتا ہے لیکن روزہ میں اس طرح کی کوئی وسعت نہیں ہے۔

اس کا زمانہ ماہ رمضان معین ہے اور اس کے حدود اول و آخر سے محدود ہیں طلوع فجر غروب آفتاب یعنی زوال سرخی مشرق تک جس میں ذرا ایک سیکنڈ کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔ کوئی شخص اپنی نیت میں طلوع فجر سے ایک سیکنڈ بعد یا مغرب کے ایک سیکنڈ قبل کا وقت شامل کرے تو اس کے روزہ کو بدعت اور باطل قرار دے دیا جائے گا اور اس کے عمل کی کوئی قیمت

نہیں ہوگی۔

روزہ رکھنے میں تو وقت کا مکمل احترام کرنا پڑتا ہے اور اس کے سلسلہ میں کسی طرح کی غفلت یا تساہل قابل معافی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ نماز میں غفلت ہو جائے تو قضا کے طور پر دوبارہ نماز بھی ادا کی جا سکتی ہے اور دوسرا کوئی جرمانہ مستحق ہونے کے علاوہ نہ ہوگا لیکن روزہ میں ایک منٹ کی تساہل اور وقت معین سے ایک منٹ قبل افطار کرنے یا وقت معین کے ایک منٹ بعد سحری کھانے میں ایک غلام آزاد کرنا ہوگا یا ۶۰ روزے رکھنا ہوں گے یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ بلکہ وقت کی تحقیق کے بغیر لاپروائی میں اقدام کیا ہے تو اس کی بھی سزا دینا ہوگی تاکہ مرد مسلمان وقت کی قیمت پہچانے اور اس کا مکمل احترام کرے۔ وقت کو ضائع اور برباد نہ کرے اور اس کے بارے میں غفلت اور تساہلی سے بھی کام نہ لے۔

۱۴۔ روزہ تقویت قوت ارادی

علم النفس کا مسئلہ بھی ہے اور روز مرہ کا تجربہ بھی کہ دنیا کا کوئی بڑا کام قوت ارادی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔ میدان جنگ میں اسلحہ سے زیادہ اہمیت قوت ارادی کی ہے۔ فوج کے حوصلے بلند ہیں اور اس کی قوت ارادی مضبوط ہے تو اسلحہ کے بغیر بھی ثابت قدم رہ سکتی ہے اور اگر ارادہ کی قوت کمزور ہو گئی ہے تو اسلحہ بھی اس کے قدموں کو ثبات نہیں دے سکتا ہے۔

روزہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔ نماز کا کام بھی یہی ہے۔ وہ بھی انسان کو خواہشات کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی ارادی قوت بخشتی ہے اور وہ کھانے پینے کے علاوہ پیسے اور دوسرے امور پر بھی کنٹرول کرتی ہے۔ لیکن یہ کام چند لمحات کا ہوتا ہے جب کہ روزہ میں یہ کام ۱۲ ۔ ۱۴ ۔ ۱۶ ۔ ۱۸ گھنٹے تک جاری رہتا ہے اور انسان صرف حکم خدا کی خاطر تمام ضروریات اور لذات کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس طرح ایک ارادہ کی طاقت کو اس قدر مضبوط بنا لیتا ہے کہ اگر یہ استحکام باقی رہ جائے تو اس سے بڑا متقی اور پرہیزگار کوئی نہ ہوگا۔ لیکن انسان کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس کے اکثر کمالات وقتی ہوتے ہیں اور وقت کے گزر جانے کے ساتھ کمالات کی مدت حیات بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان

واقعی صاحب کمال نہیں بن پاتا ہے ورنہ شریعت کی مشقیں اس کی زندگی پر دوامی اثر انداز ہو جائیں تو اس کے باکمال ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

۱۵۔ روزہ ترک لذات

روزہ انسان کی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ انسان ترک لذات پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس انسان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس کے سامنے حسین و جمیل عورت موجود ہو۔ کوئی شرعی رشتہ بھی ہو۔ ماحول بھی حسین اور سازگار ہو۔ فطرت کا جذبہ بھی اندر سے شعلہ کے مانند ہو رہا ہو۔ کسی طرح کی سماجی بدنامی یا پریشانی کا خطرہ بھی نہ ہو۔ مگر وہ صرف حکم خدا کی خاطر ہاتھ نہ بڑھائے اور اپنی فطری خواہش پر کنٹرول کر لے۔ بلکہ اس نوجوان کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس کے جذبات کو ماحول نے بھڑکا دیا ہو اور اس کے پاس تسکین جذبات کے بیرونی وسائل نہ ہوں اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی تسکین نفس کا سامان کر سکتا ہو اور وہ خلوت بھی میسر ہو جہاں خود کاری کا عمل انجام دیا جا سکتا ہو۔ لیکن اپنے نفس پر کنٹرول کرے اور ایسا کوئی عمل انجام نہ دے جس سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ یقیناً اس کو روزہ کا فیض کہا جائے گا کہ اس نے انسان میں ترک لذات کی وہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ اب وہ کسی وقت بھی اس قسم کے حرام سے محفوظ رہ سکتا ہے اور حکم الٰہی اسے ہر قسم کی برائی سے روک سکتا ہے

۱۶۔ روزہ ترک ضروریات

انسانی زندگی میں لذتوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن ظاہر ہے کہ لذت کا مرتبہ حیات کا نہیں ہے۔ بعض ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق زندگی کے ضروریات سے ہے جن کے بغیر زندگی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

مرد عورت کے بغیر اور عورت مرد کے بغیر زندگی گزارنے کا احساس کر سکتی ہے لیکن اس سے اس کی موت نہیں واقع ہو سکتی ہے۔ کھانے پینے کی حیثیت اس سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی ضرورت ہے اور اس کا احساس دو روزے کے بعد کے اندر بھی پایا جاتا ہے

جو حس اور لذت کے تصور سے بھی نا آشنا ہے۔ بچہ کا رونا اور دودھ کے لئے طلب کرنا اس امر کی علامت ہے کہ یہ انسان کا جبلی تقاضا ہے — لیکن روزہ نے انسان کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنا دیا ہے کہ وہ اس طلب کے سامنے بھی کھڑا ہو سکتا ہے اور سارے دن اس مطالبہ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کے پروردگار نے روک دیا ہے اور وہ پروردگار کے حکم سے سرتابی نہیں کرنا چاہتا ہے۔

روزہ انسان کے جملہ جذبات و خواہشات کی تطہیر کا ذریعہ ہے اور روزہ دار سے زیادہ باہمت، پرہیزگار اور قوی الارادہ کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ روزہ وسیلۂ طہارت

انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے عرف عام میں نجاست تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن وہ عام حالات سے مختلف قسم کی ایک کیفیت ہوتی ہے جسے اسلامی اصطلاح میں حدث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ کیفیت کبھی پیشاب، پاخانہ، ریاح اور نیند وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے تو اسے حدث اصغر کہا جاتا ہے جس کا ازالہ وضو کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی یہ کیفیت جنابت، حیض، نفاس اور استحاضہ وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے جسے حدث اکبر سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کے ازالہ کے لئے وضو کافی نہیں ہے بلکہ غسل کی ضرورت ہوتی ہے۔

روزہ انسان زندگی میں حدث اصغر کو تو برداشت کر سکتا ہے کہ یہ زندگی کا ضروری اور مسلسل روز مرہ کا مسئلہ ہے — لیکن حدث اکبر کو برداشت نہیں کر سکتا ہے کہ اس کے اسباب میں جنابت تقریباً اختیاری مسئلہ ہے اور حیض و نفاس و استحاضہ کے مسائل میں جب ان سے پیدا ہونے والی کیفیت بھی قدرے شدید ترین ہوتی ہے جس کا صحیح فرق ہر وہ انسان محسوس کر سکتا ہے جو بیداری اور نیند کی حالت میں ہونے والے احتلام کے فرق کو پہچانتا ہے اور ان کی کیفیات سے آشنا ہے۔

اسلام نے روزہ کے آغاز میں یہ قانون بنا دیا کہ انسان جنابت اور حیض و نفاس کی

[illegible] کے ساتھ روزہ کا آغاز نہیں کر سکتا ہے بلکہ اسے فجر سے پہلے غسل کرنا ہوگا اور اس کے بعد روزہ کا آغاز ہوگا۔

غسل کے بغیر روزہ جائز نہیں ہے جو اس امر کی علامت ہے کہ روزہ انسانی زندگی میں تطہیر کا عمل بھی انجام دیتا ہے اور وہ انسان کو طیب و طاہر اور پاک و پاکیزہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

۱۸۔ روزہ وسیلۂ تطہیر جذبات

روزہ کے محرمات میں مجامعت کے علاوہ استمناء اور خود کاری بھی شامل ہے جس عمل سے عام طور سے کوئی انسان باخبر نہیں ہوتا ہے۔ انسان کے کھانے پینے کو دوسرے افراد دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کے عمل جماع کو کم سے کم دوسرا فریق ضرور دیکھتا ہے — لیکن خود کاری ایک ایسا عمل ہے جس سے کوئی شخص بھی باخبر نہیں ہوتا ہے — لہذا انسان کھانے پینے اور جماع کو چھوڑنے کے بعد بھی خود کاری کر سکتا ہے اور اس کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے کہ سماج اسے مقدس اور [illegible] تصور کرے گا اور اسے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی برباد کرنے کی سہولت بھی حاصل رہے گی — لیکن روزہ نے اس خباثت نفس کا بھی علاج کر دیا اور جماع کے ساتھ استمناء کو بھی [illegible] جس کا کفارہ بھی شدید تر [illegible] کہ بیوی سے مجامعت کرنے والے پر ایک کفارہ [illegible] ہوگا اور استمناء کرنے والے کو تین کفارے ادا کرنے ہوں گے کہ اس نے قانون فطرت کی بھی مخالفت کی ہے اور آب حیات کو ضائع بھی کیا ہے جو ایک انسانی وجود کا سنگ بنیاد [illegible] اور یہ ساری شدت اس لئے ہے کہ روزہ کی برکت سے ایک پاکیزگی نفس [illegible] ہو جائے کہ انسان تنہائیوں میں بھی خلاف شریعت اور خلاف دین فطرت عمل انجام نہ دے سکے اور زندگی جلوت اور خلوت دونوں مراحل پر پاک و پاکیزہ ہو جائے۔

۱۹۔ روزہ تطہیر زبان

یوں تو روزہ کی حالت میں زبان کے تمام غلط استعمالات جھوٹ، غیبت، بہتان، [illegible] چغلخوری وغیرہ سب ہی حرام ہیں لیکن ایک جھوٹ ایسا بھی ہے جو روزہ کو باطل

بھی کر دیتا ہے، اور وہ بے خدا، رسول اور معصومینؑ کی طرف کسی ایسی بات کا منسوب کرے جو انھوں نے نہ فرمائی ہو اور یہ قانون جہاں انسان کو جھوٹ سے روکتا ہے وہاں تحقیق کی دعوت بھی دیتا ہے کہ کسی کی طرف بات کو منسوب کرنے سے پہلے تحقیق کرو کہ اس نے یہ بات کہی ہے یا نہیں کہی ہے۔ اگر نہیں کہی ہے تو تمہیں نسبت دینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس طرح نظام زندگی کے برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا روزہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ اپنی زبان کو پاکیزہ رکھو اور بغیر تحقیق کے کوئی بات نہ کہو اور پہلے بیکار باتوں سے بزرگ ترین ہستیوں کو محفوظ رکھو تاکہ دوسرے افراد کے احترام کا سلیقہ پیدا ہو۔

۲۰۔ روزہ دعوت تلاوت قرآن

پروردگار نے روزہ کو اس مہینہ میں واجب قرار دیا ہے جس مہینہ میں اپنا مقدس کلام نازل کیا ہے، اور اس طرح ایک روزہ دار کو یہ احساس دلایا ہے کہ یہ زمانہ اگر صیام کا ہے تو نزول قرآن کا بھی ہے تو کیا وجہ ہے کہ صرف ایک مناسبت کو یاد رکھا جائے اور دوسری مناسبت کو نظر انداز کیا جائے۔ ہر روزہ دار کا اخلاقی فرض ہے کہ ماہ رمضان میں نازل ہونے والے قرآن کے حق کا بھی احترام کرے، اور تمام سال سے زیادہ اس مہینہ میں تلاوت قرآن کرے کہ یہ نزول کا زمانہ ہے اور اسی مہینہ کی ایک رات میں قرآن نازل ہوا ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت جہاں انسان کے وجود ثواب میں اضافہ کرے گی وہاں اس کے کردار کو بھی طیب و طاہر اور نیک و پاکیزہ بنائے گی کہ قرآن عالم ایمان کے لئے شفا و رحمت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کا کام سیدھے راستہ کی ہدایت کرنا ہے۔ وہ انسان کے نفس کو پاکیزہ بناتا ہے اور اس کے کردار کو عظیم ترین بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ اسی طرح متقین کے لئے ہدایت ہے جس طرح روزہ متقی بنانے کا وسیلہ ہے، اور اس طرح جب دونوں اسباب جمع ہو جائیں گے تو انسان مرحلہ تقویٰ سے قریب تر ہو جائے گا اور تقویٰ کے تمام نتیجوں اور برکات کا استحقاق پیدا کرلے گا جن میں سے دنیا میں مصیبتوں سے باہر نکل آنے کا راستہ اور رزق بھی ہے اور آخرت میں جنت و فردوس کی عظیم ترین منزل بھی ہے۔

۲۱۔ روزہ دعوت توبہ و استغفار

روزہ اپنے احکام و قوانین کے اعتبار سے ایک طرف تطہیر جذبات اور تزکیہ نفس کی دعوت دیتا ہے، اور دوسری طرف ماضی کی غلطیوں کے سلسلہ میں احساس کو شدید تر بنا دیتا ہے اور انسان بار بار یہ سوچتا ہے کہ اگر ماضی کی خطاؤں کا ازالہ نہ ہوا اور ان غلطیوں کی بخشش اور معافی کا بندوبست نہ کیا گیا تو صرف مستقبل کا پاکیزہ کردار کیا کر سکتا ہے اور اس طرح نفس میں خود بخود توبہ و استغفار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور انسان جس طرح تعمیل احکام سے مستقبل کا انتظام کرتا ہے اسی طرح توبہ و استغفار سے ماضی کا بھی علاج کر لیتا ہے۔

توبہ و استغفار انسانی زندگی کی وہ عظیم ترین دولت ہے جس کے آثار دنیا میں بھی نظر آتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ جناب نوحؑ نے اپنی قوم سے صرف استغفار پر تمام نعمات دنیا کا وعدہ کر لیا تھا کہ استغفار سے بارش بھی ہو سکتی ہے۔ سبزہ بھی لہلہا سکتا ہے، اولاد بھی ہو سکتی ہے، مال بھی فراہم ہو سکتا ہے اور آخرت میں خطائیں بھی معاف ہو سکتی ہیں۔

استغفار مالک کے مقابلہ میں اپنی کمتری کا احساس ہے اور یہ انسانی زندگی کی بہت بڑی دولت ہے جو متکبرین اور مستکبرین کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور اس سے تمام نااہل و غافل بد معرفت افراد محروم رہتے ہیں۔ استغفار کی لذت سے وہی افراد آشنا ہوتے ہیں جن کی نگاہ میں اپنی حیثیت اور مالک کی ہستی ہوتی ہے۔ جنہیں یہ احساس رہتا ہے کہ ہم کچھ نہیں ہیں اور جو کچھ ہیں وہ صرف مالک کے کرم کا نتیجہ ہے، اور اس طرح ان کے استغفار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کا استغفار گناہوں کا انتظار نہیں کرتا ہے۔ گناہوں کے بعد استغفار کا پہلا محرک گناہ کا احساس ہوتا ہے اس کے بعد مالک کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن گناہوں کے بغیر صرف مالک کی عظمت و بزرگی کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سے بلند تر کوئی منزل نہیں ہے جس کے ذہن میں گناہ کے بجائے مالک کی عظمت کا احساس رہے اور وہ اسی احساس کی بنیاد پر توبہ و استغفار کرتا رہے اور پھر مالک اسی استغفار کی برکت سے دنیا کو برکات سے بھی نواز دے اور اسے حق شفاعت بھی دیدے کہ اگر وہ خود گنہگار

نہیں ہے تو گنہگاروں کو بخشنے کی سفارش کر سکتا ہے اور اس کی سفارش قابل سماعت ہوگی کہ اس نے گناہ کے بغیر توبہ و استغفار کا سلسلہ قائم رکھا ہے اور مسلسل اپنے مالک کی عظمت و جلالت کو نگاہ میں رکھا ہے۔

۲۲۔ روزہ وسیلۂ اطعام

فقہ اسلامی میں بعض جرائم کے سلسلہ میں جن کفارات کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں سے بعض کفارات تخییری ہیں جہاں انسان کو اختیار ہے کہ مختلف کفارات میں سے جسے چاہے اختیار کرے جیسے ماہ رمضان کا روزہ توڑنے میں انسان کو اختیار ہے کہ چاہے ایک غلام آزاد کرے یا ساٹھ روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

لیکن بعض کفارات ترتیبی ہیں جیسے کفارۂ ظہار کہ اگر کسی شخص نے زمانۂ جاہلیت کے انداز سے زوجہ سے جان چھڑانے کے لئے اسے اپنی ماں کی پشت جیسا قرار دے دیا تو اس کا فرض ہے کہ پہلے ایک غلام آزاد کرے اور یہ ممکن نہ ہو تو ساٹھ روزے رکھے۔ اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے کہ یہاں، طعام کا مرتبہ صیام کے بعد ہے اور گویا کہ یہ صیام کا بدل ہے۔

اور یہ علامت ہے کہ اسلام میں روزہ کا کوئی بدل ہے تو وہ اطعام ہے اور اس طرح روزہ کا غیر ممکن ہونا فقیروں کے، طعام کا سبب بن جاتا ہے اور خود روزہ کی حالت میں اسلام نے افطار طعام پر اس قدر زور دیا ہے کہ گویا اس عمل میں بھی ایک روزہ کا ثواب ہے اور اس طرح چاہا ہے کہ روزہ قربت الٰہی کے علاوہ اطعام مساکین و مومنین کا سبب بھی بن جائے۔

۲۳۔ روزہ علامت ترحم

اسلامی شریعت نے ماہ رمضان کے روزہ کو اس قدر اہم قرار دینے کے بعد ایک روزہ توڑنے میں ساٹھ روزے کا کفارہ واجب ہو جاتا ہے پھر یہ قانون پیش کیا

بوڑھے مرد، بوڑھی عورت، حاملہ عورت، دودھ پلانے والی عورت، پیاس کے مریض افراد کے لئے اگر روزہ تکلیف دہ ہے تو انہیں روزہ نہیں رکھنا ہوگا اور بعض افراد کو ہر روز بطور فدیہ دینا ہوگا۔ اور بعد میں قضا کرنا ہوگی اور بعض افراد کے لئے فدیہ یا قضا بھی نہیں ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ روزہ انسانی حالات پر ترحم کی نشانی ہے۔ اور روزہ کے احکام انسان کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ تمہارا پروردگار تمہارے حال پر کس قدر مہربان ہے کہ تمہاری کمزوری پر رحم کھا کر اپنے قانون کو پیچھے ہٹا لیا ہے اور یہ گوارا نہیں کیا ہے کہ صرف اپنی حاکمیت کے اظہار کے لئے تمہیں مصیبت میں مبتلا کر دے۔ اسے تمہارے روزہ سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ جو کچھ فائدہ ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں ہے۔

۲۴۔ روزہ ناقابل ترک مطلق

پروردگار نے ایک طرف ضعیف انسانوں سے روزہ معاف کر کے اپنے رحم و کرم کا اعلان کیا ہے اور دوسری طرف حائضہ عورت پر قضا واجب کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ روزہ ترک مطلق کے قابل نہیں ہے اور روزہ بعض حالات میں ترک بھی ہو جائے تو اس کی قضا بہرحال واجب ہے حالانکہ نماز ترک مطلق کا شکار ہو سکتی ہے اور حائضہ عورت کو ایام حیض کی نمازوں کی قضا نہیں کرنا ہے حالانکہ عام تصور یہی ہے کہ نماز کی اہمیت روزہ سے زیادہ ہے اور اسلامی احکام سے بھی اسی طرح کے تصور کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے فروع دین میں اول نماز کو رکھا ہے اور بعد میں روزہ کا درجہ قرار دیا ہے۔

۲۵۔ روزہ غیر مخل

حائضہ عورت کی نماز اور اس کے روزہ کے اس تفرقہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اس پر نماز کی قضا واجب نہیں ہے لیکن روزہ کی قضا واجب ہے اسلامی روایات نے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ نماز زندگی کے دوسرے مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے اور نماز کی

حالت نماز میں ہنسنے اور رونے سے بھی مجبور ہے دوسرے احوال و افعال کا کیا ذکر ہے لیکن روزہ کا یہ حال نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے روزہ دار فطری تقاضوں کی بنا پر ہنس بھی سکتا ہے اور رو بھی سکتا ہے۔ بات کرنا چاہے تو وہ بھی کر سکتا ہے۔ داہنے بائیں دیکھنا چاہے تو اس پر بھی پابندی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام امور زندگی ملازمت، تجارت، زراعت، صنعت، اجتماعیات، اقتصادیات، سیاسیات جملہ امور انجام دے سکتا ہے۔ روزہ کسی اعتبار سے مانع نہیں ہے روزہ اگر کھانے پینے یا مجامعت کرنے سے روک دیتا ہے تو یہ بھی تہذیب نفس کے علاوہ وقت کی آزادی ہے کہ انسان اس وقت کو دوسرے اہم کاموں میں صرف کر سکتا ہے ورنہ روزہ کی حالت میں کھانا پکانے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو روزہ کی وسعت دامان کی بہترین علامت ہے اور جس سے اس کی اہمیت کا بھی کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

زکوٰۃ

عربی زبان کے اعتبار سے لفظ زکوٰۃ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پاکیزگی اور نمو۔

اسلام نے اس لفظ کو ہر اس کار خیر کے لئے اختیار کیا ہے جس کا تعلق دیانت اور مالیات سے ہو، اور اس کے بعد اس کار خیر کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے، واجب اور مستحب۔

واجب زکوٰۃ نو چیزوں پر رکھی گئی ہے جس کے لئے تمام قسم کے سکوں میں سے صرف سونے چاندی کے سکوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور تمام قسم کے غلوں میں سے صرف گندم، جو، کشمش اور کھجور کا انتخاب کیا گیا ہے اور تمام قسم کے جانوروں میں سے صرف اونٹ، گائے، اور بھیڑ بکری کا انتخاب کیا گیا ہے۔

اس انتخاب کا راز عرب کے حالات ہیں یا مصالح ہیں۔ اس کا علم صرف پروردگار کو ہے جس نے اس قانون کو بنایا ہے اور پھر اس راز سے اپنے نمائندوں کو باخبر کر دیا ہے۔ ورنہ تشریع کے معاملہ میں نہ کسی کی رائے کا کوئی دخل ہے اور نہ کسی کو دریافت کرنے کا حق ہے۔

زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بعد عام طور پر مستحب کار خیر کو صدقہ سے تعبیر کیا جانے لگا اور واجب زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہا جانے لگا۔ ورنہ قرآن حکیم میں اس کے خلاف تعبیری استعمال کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ کہ زکوٰۃ کا مصرف بیان کرنے کے لئے لفظ "انما الصدقات" استعمال ہوا ہے جس کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ یہ مصرف زکوٰۃ واجب کا مصرف نہیں ہے بلکہ تمام امور خیر کا مصرف بھی آٹھ موارد ہیں جہاں عام طور سے مال کو صرف ہونا چاہیئے اگرچہ اس کے علاوہ صلۂ رحم وغیرہ بھی مال خیرات کے موارد میں شامل ہے۔

صدقات کو زکوٰۃ کے معنی میں استعمال کرنے کے بعد قرآن مجید نے لفظ زکوٰۃ کو صدقات کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ آیت [illegible] میں "یؤتون الزکوٰۃ" کہا گیا ہے۔ جب کہ وہاں صدقات زکوٰۃ مفروضہ کوئی نصاب نہیں تھا جو سائل کو دیا جاتا اور جو انگوٹھی دی گئی تھی اس کا زکوٰۃ واجب یا مستحب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن قرآن مجید نے اسے لفظ زکوٰۃ ہی سے تعبیر کیا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں ۳۲ مقامات پر ہوا ہے اور اکثر مقامات پر نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مقامات پر نماز کے بغیر بھی ہوا ہے تاکہ اس کی استقلالی حیثیت برقرار رہے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ زکوٰۃ کا اپنا ایک اثر ہے اور تمام اثرات کا تعلق صلوٰۃ و زکوٰۃ کے مجموعہ سے نہیں ہے۔

سورۂ اعراف آیت ۱۵۶ میں رحمت الٰہی کا حقدار ان لوگوں کو قرار دیا گیا ہے "جو متقی ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آیات الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں"۔ اس مقام پر صلوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

سورۂ فصلت میں اس کے برعکس مضمون کا اعلان ہوا ہے کہ "ویل ان مشرکین کے لئے ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں"۔ اور یہاں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے۔

نماز بلا زکوٰۃ کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ لیکن عام طور سے مقام حکم میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کہ زکوٰۃ کا امکان ہی نہ ہو جیسے زکوٰۃ کا [illegible] کے طور پر جناب لقمان نے اپنے فرزند کو نصیحت کی کہ "نیکیوں کا حکم دو، نماز قائم کرو اور مصائب پر صبر کرو کہ یہ مستحکم امور کی شان ہے"۔

اس مقام پر زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے۔ اور غالباً اس کا راز یہ ہے کہ نماز غریب سے بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ جب کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان صاحب مال و ثروت نہ ہو اور لقمان اپنی وصیت کو ایسے حالات کے ساتھ مخصوص نہیں کرنا چاہتے ہیں جہاں دولت و ثروت کا وجود پایا جاتا ہو۔ اس لئے لفظ زکوٰۃ کو نکال دیا ہے اور صرف نماز کا تذکرہ کیا ہے۔

امتیازات زکوٰۃ

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین اسلام نے مسئلہ زکوٰۃ کو بے حد اہمیت دی ہے اور اس کے متعدد خصوصیات و امتیازات کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں سے سر دست صرف ان خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ باقی قیود [illegible] کا اندازہ مطالعہ کرنے والے حضرات خود کر سکتے ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ تزکیۂ نفس ہے

اسلام نے اپنے اس مالیاتی محور کو زکوٰۃ کا نام اس لئے دیا ہے کہ انسان کو محبت دنیا سے پاک بنانے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ انسان کی مال کی محبت اسے [illegible] بنا دیتی ہے اور دنیا کے وہ [illegible] جو انسان کو [illegible] کے [illegible] تک پہنچا دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک مال دنیا بھی ہے جس کی طرف خود قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا اسلام نے چاہا کہ انسان سے وقتاً فوقتاً کچھ مال لے لیا جائے [illegible] تاکہ انسان محبت دنیا سے دور رہ کر [illegible] کی زینت حاصل کرے اور اسے یہ اندازہ ہوتا رہے کہ مال کا جیب میں ہونا [illegible] نہیں ہے۔ جس طرح ایک دن امیر کے قبضہ میں رہ سکتا ہے ویسے ہی دوسرے دن فقیر کی جیب میں بھی جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح نفس انسانی کو اس غرور سے بھی نجات مل جائے گی جو انسان کو شیطان کی سرحد تک پہنچا سکتا ہے۔

زکوٰۃ کے تزکیۂ نفس ہونے کی طرف اشارہ سورۂ توبہ آیت ۱۰۳ میں بھی کیا گیا ہے جہاں صدقہ کو طہارت مال اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور سورۂ اعلیٰ میں بھی ہے جہاں تزکیہ زکوٰۃ ادا کرنے ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ حفاظت مال ہے

سورۂ توبہ آیت ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور قرض حسنہ

کی پیشی میں ہوں گے سے خدا کی بارگاہ میں پائیں گے"۔ آیت شریفہ میں اجر و ثواب کا ذکر نہیں بے فکر … کا تذکرہ ہے جو اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ان کو محفوظ رکھنا … اس کی جگہ کوئی … تجوری یا بینک نہیں ہے۔ اس کی اصل جگہ بارگاہ احدیت ہے جہاں … زکوٰۃ دے کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے … یعنی اس بارگاہ میں … ہوتا ہے … استفادہ کرتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ حفاظت اجر ہے

سورۂ بقرہ آیت ۲۷۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کیا، نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے پروردگار کی بارگاہ میں اجر ہے اور ان کے لئے کوئی خوف اور حزن بھی نہیں ہے"۔

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ دینے سے صرف مال محفوظ نہیں ہوتا ہے بلکہ پروردگار اس … کرم پر ثواب بھی عنایت کرتا ہے اور اس ثواب کا … سے ہم تصور … ہے کہ اسے ہر طرح کے خوف اور حزن سے محفوظ کر دیتا ہے

… خوف … حالات سے پیدا ہوتے … اضطراب … مستقبل کی فکر سے پیدا ہوتے … کا نام ہے اور زکوٰۃ انسان کو دونوں سے نجات دلا دیتی ہے … اس طرح … وقت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا مال بھی محفوظ ہو جاتا ہے … اور ثواب بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور خود انسان بھی محفوظ ہو جاتا ہے کہ اسے کسی طرح کا خوف اور خطرہ نہیں رہ جاتا ہے … زکوٰۃ کے ذریعہ اپنی ہستی کا … کر لیتا ہے کہ جس طرح انشورنس میں ایک حصہ ادا کرنے سے انسان کسی حادثہ کی طرف سے بےفکر ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ میں سے ایک حصہ ادا … آخرت کی … سے محفوظ ہو جاتا ہے

۴۔ زکوٰۃ باعث اجر عظیم

اہل کتاب میں راسخین فی العلم اور مومنین کی شان یہ ہے کہ وہ پیغمبر اور ان سے

پہلے … تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرنے والے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والے ہیں اور خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ہم انہیں عنقریب اجر عظیم عطا کریں گے۔ (سورۂ نساء آیت ۱۶۲)

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ زکوٰۃ میں فقط اجر و ثواب ہی نہیں ہے بلکہ اجر عظیم ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ عظیم جب پروردگار کی زبان سے استعمال ہوتا ہے تو اس کی عظمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نے ساری دنیا کے سرمایہ کو قلیل قرار دیا ہے تو جس کی نگاہ میں عظیم ہو … اس کی عظمت کا اندازہ … ممکن ہے۔ بہرحال اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ … زکوٰۃ سے … اس منزل پر پہونچ سکے … اجر عظیم کا وعدہ کرتا ہے اور اس وعدہ کو … قریب کے انداز سے بیان کرتا ہے تاکہ کسی طرح کا شک اور شبہ نہ پیدا ہو سکے۔

۵۔ زکوٰۃ کفارہ گناہ

سورۂ مائدہ آیت ۱۲ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں سے بارہ نقیب بھیجے اور پروردگار نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لے آئے۔ ان کا احترام کیا اور خدا کو قرض حسن دیا تو ہم تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے اور تمہیں ان جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی"۔

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جن اعمال کو گناہوں کا کفارہ اور بخشش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہے جس سے حق … ادا ہو جاتا ہے جس طرح نماز سے حق … کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں نماز و زکوٰۃ کو ایمان بالرسل کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔ گویا کہ … احکام کی … مرتبہ ہے جو ایمان اور احترام مرسلین … کیا جاتا ہے اور یہ فضیلت کے اظہار کا عظیم ترین اسلوب اور لہجہ ہے۔

۶۔ زکوٰۃ بنیاد ولایت

اسی سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ آیت ولایت ہے جس میں صاف اعلان کیا گیا ہے کہ "ایمان والو! تمہارا ولی صرف اللہ، اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

علماء اصول کا بیان ہے کہ جب کسی کلام میں مختلف امور کے بعد کسی حکم کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ اہمیت آخری شرط کی ہوتی ہے جس کے بغیر حکم مکمل نہیں ہوتا۔ آیت کریمہ میں خدا، رسول اور علیؑ تینوں کی ولایت کا ذکر ہے۔ لیکن علیؑ کا آخر میں تذکرہ اشارہ ہے کہ اصل اعلان ولایت علیؑ کا ہے اور ولایت خدا و رسول کا تذکرہ صرف ایک طرح کی تمہید ہے جس سے عظمت ولایت کا اظہار کیا گیا ہے۔

جس طرح کہ علیؑ کے تذکرہ میں ایمان، نماز اور زکوٰۃ تینوں باتوں کو جمع کیا گیا ہے لیکن آخر میں حالت رکوع میں زکوٰۃ ہی کا تذکرہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولایت کی اصل اس زکوٰۃ کا سبب ہے اس کا ایمان اور نماز کا نہیں ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ایمان اور نماز کا مسئلہ تو روز اول سے تھا ہی لیکن ولایت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ ولایت کا اعلان اسی وقت ہوا ہے جب ان دونوں کے ساتھ حالت رکوع کی زکوٰۃ شامل ہو گئی ہے اور مولائے کائنات نے سائل کے سوال کو پورا کر کے مسجد رسولؐ، خانۂ خدا اور بندگان خدا سب کے وقار کو محفوظ کر لیا ہے ورنہ سائل یہی شکایت لے کر جا رہا تھا کہ اللہ کا گھر تھا، رسولؐ کی مسجد تھی اور نمازیوں کا اجتماع تھا لیکن کوئی ایک سائل کے سوال کا پورا کرنے والا نہیں تھا۔

۷۔ زکوٰۃ موجب رحمت

پروردگار عالم رحمن و رحیم اور ارحم الراحمین ہے۔ اس کی رحمت کا ہر دو کل کائنات کو شامل ہے لیکن جب جناب موسیٰ ستر افراد کو لے کر منزل معین پر میقات الٰہی کے لئے حاضر ہوئے اور سب کو ایک جھٹکا لگا تو سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے خدایا! انہیں دنیا

اور آخرت دونوں میں نیکی عنایت کر تاکہ ہم تیری ہی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا "ہم جس پر چاہیں گے عذاب کریں گے اور ہماری رحمت تو تمام اشیاء کو شامل ہے اور ہم اسے ان لوگوں کے واسطے لکھ دیتے ہیں جو متقی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں"۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۵۶)

اس مقام پر اسلام کے اہم ترین عمل نماز کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا تذکرہ ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ رحمت الٰہی کے مخصوص استحقاق میں جو درجہ زکوٰۃ کا ہے وہ کسی عمل کا نہیں ہے اور شاید اس کا ایک راز یہ بھی ہو کہ زکوٰۃ خود بھی غریبوں کے حال پر رحم کرنے کا ایک مرحلہ ہے کہ انسان جب تک رحم کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہونچ جاتا ہے اس وقت تک جیب سے مال نکالنے کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔ برخلاف اس کے نماز ہر شخص ادا کر سکتا ہے اس میں کسی جذبۂ ترحم کا کام نہیں ہے۔ گویا رب العالمین نے مشہور مقولہ "ارحموا ترحموا" کی بنیاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قابل رحم وہی انسان ہوتا ہے جو دوسروں کے حال پر مہربان ہوتا ہے۔

۸۔ زکوٰۃ موجب رہائی

مشرکین کی بدعہدی کے بعد جب اسلام نے معاہدہ کو توڑ دینے کا اعلان کر دیا کہ محترم مہینوں میں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد "جب محترم مہینے گذر جائیں تو مشرکین جہاں بھی مل جائیں انہیں قتل کر دو اور گرفتار کر لو اور راستوں پر ان کی تاک میں رہو۔ اس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں آزاد کر دو کہ اللہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے"۔ (توبہ آیت ۵)

آیت شریفہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مشرکین کی توبہ بھی صرف لفظی توبہ و استغفار نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عمل ضروری ہے اور عمل کی منزل میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ ضروری ہے جس کے بغیر انہیں آزاد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کس قدر نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ غریب بندگان خدا پر رحم نہیں کر سکتے ہیں تو پروردگار بھی ان پر رحم کرنے والا نہیں

ہے کہ ... جو ہے۔ اس نے معافی کی صورت میں اپنے غفور اور رحیم ہونے کا جو ذریعہ
کہ انسان پہلے اپنی مہربانی کا اظہار کرے۔ اس کے بعد پروردگار دوسرا اجر عنایت کرے گا۔ غفور ہونے کے اعتبار سے تو قدیم عہد شکنی کو معاف کر دے گا اور رحیم ہونے کے اعتبار سے آزادی عنایت کر دے گا

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اسلام میں مشرکین کی توبہ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر قبول نہیں ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کی توبہ ان عبادتوں، اعمال اور فرائض کے بغیر کس طرح قبول ہو سکتی ہے

۹۔ زکوٰۃ بنیاد اخوت

سورۂ توبہ کی آیت ۱۱ میں اعلان ہوتا ہے کہ "اگر مشرکین توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔"

اسلام کی فراخدلی یہ ہے کہ وہ کل کے مشرکین کو آج کا برادر دینی بنانے کے لئے تیار ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کر دیں۔ جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلامی برادری میں وہی شخص شامل ہو سکتا ہے جو نماز قائم کر کے خالق کے حق سے سبکدوش ہو جائے اور زکوٰۃ دے کر بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو۔ جس کے بغیر کوئی انسان اسلامی برادری میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہے چاہے اس کا شمار مسلمانوں کی کسی بھی برادری میں ہوتا ہو۔

۱۰۔ زکوٰۃ وصیت پروردگار

پروردگار نے اپنے احکام کے لئے مختلف لہجے اور انداز اختیار کئے ہیں۔ بعض احکام کو شکل امر و حکم بیان کیا ہے۔ بعض میں تقاضا و دعوت کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ بعض بشکل تحریر لکھے گئے ہیں اور بعض کو وصیت و نصیحت کے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں ہر لہجہ کا ایک اثر ہے اور سب ... کی محبت سے متعلق کیا گیا ہے۔ مثلاً جذبات و احساسات سے تعلق رکھتا ہو تو وصیت سے بہتر کوئی لہجہ نہیں ہو سکتا

ہے۔ اسی لئے جناب عیسیٰ نے حضرت مریم کی عصمت کی گواہی دینے کے لئے گہوارہ میں کلام کیا تو اپنی عبدیت، نبوت اور کتاب کا اعلان کرنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ میرا پروردگار میرے حال پر بے حد مہربان ہے چنانچہ اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت و نصیحت کی ہے اور وصیت و نصیحت کا تعلق ہمیشہ ان ہی اعمال سے ہوتا ہے جو انسان کے لئے باعث عز و افتخار ہے۔ (مریم آیت ۳۱)

۱۱۔ زکوٰۃ بقید حیات

اسی آیت مبارکہ میں ایک لفظ "مَا دُمْتُ حَيًّا" بھی ہے کہ اس کی وصیت ہے کہ جب تک زندہ رہوں نماز قائم کرتا رہوں اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ پروردگار کی نگاہ میں نماز کی طرح زکوٰۃ بھی کوئی وقتی یا ہنگامی شے نہیں ہے کہ کسی غریب کو چند پیسے دے دیئے جائیں اور پروردگار کا ... کا حق ادا ہو جائے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے تا حیات جاری رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ انسان مالی کار خیر اسی وقت انجام دیتا ہے جب پروردگار اسے مال عنایت کرتا ہے۔ تو جب پروردگار کی عنایت کا سلسلہ مستمر ہے اور تا حیات ختم ہونے والا نہیں ہے۔ تو انسان کے ایثار کو بھی تا حیات مستمر رہنا چاہئے اور اس کے سلسلہ کو منقطع نہیں ہونا چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ یہ انسان کوئی قیمت دینے والا نہیں ہے بلکہ نعمات الٰہیہ کا شکریہ ادا کرتا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے پروردگار اسے عنایت کرتا جاتا ہے۔ وہ اس کی راہ میں غریب بندگان خدا کو عطا کرتا جاتا ہے۔

۱۲۔ زکوٰۃ باعث عظمت کردار

سورۂ مریم آیت ۵۵ میں جناب اسماعیل کے تذکرہ کے ذیل میں کہا "وہ صادق الوعد اور ... تھے" ... اور یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور ... نگاہ میں پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے"

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا حکم دینا رسالت و نبوت کے شایان شان

اور اسی شخصیت کے پسندیدہ ہونے کے لیے زکوٰۃ لازم ہے، اور اس کے بغیر کوئی شخص بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ شخصیت کا مالک نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۳۔ زکوٰۃ عمل مرسلین

سورۂ انبیاء آیت ۷۳ میں اعلان ہوتا ہے کہ ہم نے گذشتہ ادوار میں مخصوص افراد کو امامت اور قوم کی قیادت کا کام سپرد کیا ہے لیکن ان کی طرف وحی کر دی ہے کہ نیک کام کرتے رہیں، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں اور عبادت گزار بنے رہیں" جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا امامت کے بنیادی پروگرام میں شامل ہے اور جو شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا ہے وہ نگاہِ پروردگار میں امامت کا اہل نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات علی بن ابی طالبؑ نے زکوٰۃ کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا ہے اور حالتِ نماز میں بھی کوئی سائل آگیا ہے تو اسے محروم نہیں کیا ہے بلکہ رکوع کے دوران اشارہ کر کے انگوٹھی اس کے حوالہ کر دی ہے۔ جس کو پروردگار نے خود زکوٰۃ سے تعبیر کیا ہے اور اس پر ولایت کا شرف عنایت کیا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کو الگ الگ ادا کرنے والا امامت کا اہل ہے اور زکوٰۃ کو رکوع کے دوران ادا کرنے والا ولایت کا حقدار ہے جو صرف خدا اور اس کے رسول کے لئے ہے اور ان کے علاوہ کسی تیسرے کے لئے نہیں ہے۔

۱۴۔ زکوٰۃ بنیادِ حکومت

اگرچہ اسلام میں امامت حکومت سے الگ کوئی شے نہیں ہے، اور پروردگار نے کسی کو امام بنا دیا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ شخص حکومت کرنے کا اہل ہے، اور اصلی حکومت اسی کا حق ہے۔ لیکن اس کے باوجود جہاں ایک طرف امامت کے اوصاف میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ امام خود زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ وہیں دوسری طرف اس کی حکومت کے پروگرام کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مبارکۂ حج آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "خدا کی مدد کے مستحق وہ مظلوم افراد وہ ہیں کہ جنہیں روئے زمین پر اقتدار دے دیا جائے تو نماز قائم کریں گے

اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے، اور برائیوں سے منع کریں گے اور انجام کار بہرحال پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔"

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بنیادی پروگرام میں جہاں مالک کی بارگاہ میں حاضری شامل ہے وہیں مخلوقاتِ خدا کی حاجت روائی اور فریاد رسی بھی شامل ہے اور اس کے بغیر کوئی حکومت اسلامی کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

۱۵۔ زکوٰۃ وسیلۂ کامیابی

سورۂ مبارکۂ مومنون کے آغاز میں اعلان ہوتا ہے کہ یقیناً کامیابی ان صاحبانِ ایمان کا حصہ ہے جو نماز خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں، لغو باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور زکوٰۃ برابر ادا کرتے رہتے ہیں" اور یہ ان کے عمومی اعمال کا ایک حصہ ہے کہ مالی کارِ خیر کرتے رہیں اور کسی بھی محتاج انسان کو اپنے کارِ خیر سے محروم نہ رکھیں۔

اس کامیابی کا آخری منظر یہ ہے کہ یہ افراد جنت الفردوس کے وارث ہیں اور وہاں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

۱۶۔ زکوٰۃ علامتِ مردانگی

سورۂ نور آیت ۳۷ میں ان گھروں کے ذیل میں جن کی عظمت و رفعت کا حکم دیا گیا ہے اور جن میں صبح و شام تسبیح پروردگار ہوتی رہتی ہے اعلان کیا گیا ہے کہ ان گھروں میں وہ مرد رہتے ہیں جنہیں تجارت یا کاروبار ذکرِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے نہیں روک سکتا ہے اور ان کے دلوں میں اس دن کا خوف پایا جاتا ہے جب دل و نگاہ سب پلٹ جائیں گے"

جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مردانگی صرف میدانِ جہاد میں تلوار چلانے میں نہیں ہے بلکہ نفس کے مقابلہ میں قیام کرکے اسے محبتِ دنیا کے جذبہ سے نکال لینا اور اس کے اندر شجاعت کے ساتھ معنویت کو زندہ کر دینا ہی جہادِ اکبر ہے اور مردانگی کی سب سے بڑی علامت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر جنگ و جہاد کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ مگر ان بندگانِ خدا کو لفظ "رجال"

سے تعبیر کیا گیا ہے جو عام اعتبار سے کسی بھی مرد کو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مقام حقیقت میں انہیں افراد کو کہا جاتا ہے جن میں جہاد نفس کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جو سب سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں اور اسے زیر بھی کر سکتے ہوں۔

۷۔ زکوٰۃ وجہ ہدایت و بشارت

سورۂ نمل کے آغاز میں قرآن مجید اور اس کی آیات بینات کی عظمت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ قرآن ہدایت اور بشارت ہے ان صاحبان ایمان کے لئے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت کا یقین بھی رکھتے ہیں۔"

اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو قرآنی ہدایت سے فائدہ اٹھانا ہے اور اسے اپنے واسطے بشارت قرار دینا ہے تو اسے نماز بھی قائم کرنا ہوگی اور زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر قرآنی ہدایت سے استفادہ کرنا ناممکن ہے اور وہ اس کے لئے بشارت بھی نہیں بن سکتا ہے۔

۱۸۔ زکوٰۃ اضافۂ خیرات

سورۂ روم آیت ۳۹ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "سود کا مال بظاہر اضافہ مال کا سبب بنتا ہے حالانکہ خدا کے یہاں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی بظاہر نقصان مال کا سبب ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے مال دگنا چوگنا ہو جاتا ہے اور مال ادا کرنے والا کسی طرح کے خسارہ سے دوچار نہیں ہوتا ہے۔" شرط صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ "لوجہ اللہ" ادا کی جائے اور اس میں کسی طرح کی ریاکاری یا مردم آزاری کا جذبہ شامل نہ ہو۔

۱۹۔ زکوٰۃ فریضۂ زوجیت پیغمبرؐ

سورۂ احزاب آیت ۳۳ میں ازواج پیغمبرؐ سے خطاب ہوتا ہے کہ "تمہارے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت اولیٰ جیسا بناؤ سنگار نہ کرو۔

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتی رہو۔"

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ازواج پیغمبرؐ کے فرائض میں شامل ہے اور یہ زوجیت پیغمبرؐ سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام ازواج پیغمبرؐ سے یہ زکوٰۃ ادا کرنا ممکن کام نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود پروردگار عالم نے یہ حکم عام دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مقدار میں مالی کار خیر بہرحال انجام دینا ہے اور حقیقت یہ جناب خدیجہؓ کے کردار کی قدردانی بھی ہے کہ یہ آیت کریمہ ان کے انتقال کے بعد نازل ہوئی ہے اور ان کے دور حیات میں اس قسم کے اوامر کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود اس قدر ایثار کر رہی تھیں کہ پروردگار نے پیغمبرؐ کو غنی بنانے کے لئے انہیں کو ذریعہ بنا دیا تھا اور پیغمبر اسلامؐ کے گھر میں حضرت خدیجہؓ کی دولت صرف ہو رہی تھی۔

۲۰۔ ترک زکوٰۃ علامت شرک

سورۂ فصلت کے آغاز میں پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ "آپ یہ کہہ دیں کہ میں تمہارا ہی جیسا ایک بشر ہوں لیکن میری طرف یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔ اسی کی طرف سیدھے رخ رکھو اور اسی سے استغفار کرتے رہو اور ویل ہے ان مشرکین کے لئے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا شرک کی ایک علامت ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کا ایمان آخرت پر نہیں ہے اور یہ بات واضح ہے کہ انسان جب مال کار خیر سے گریز کرتا ہے تو اس کے دو ہی اسباب ہوتے ہیں:

۱۔ مال کو اتنا عظیم سمجھتا ہے کہ اپنی زندگی کو اسی کے حوالہ کر دیتا ہے اور گویا اسی کے اشاروں پر رقص کر رہا ہے اور یہ ایک طرح کا شرک خفی ہے۔ مسلمان کی نظر میں حکم خدا سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے اور وہ اس کے حکم پر کل کائنات قربان کر سکتا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کو مال کی بربادی سمجھتا ہے کہ مال اپنے قبضہ سے نکل گیا اور خسارہ کے کچھ ہاتھ نہ آیا اور یہ بھی درحقیقت آخرت کا انکار ہے جس کے بارے میں بار بار ڈہرایا گیا

ہے کہ انسان جو کچھ راہِ خدا میں دے دیتا ہے وہ سب خزانۂ غیب میں محفوظ ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اس کی بارگاہ میں پہنچے گا سب اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور کسی طرح کی کمی واقع نہ ہوگی۔

۲۱۔ زکوٰۃ کفارۂ ترکِ نجویٰ

مالکِ کائنات نے پہلے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب رسولؐ سے راز کی باتیں کرنا ہوں تو پہلے صدقہ دے کر رسولؐ کی بارگاہ میں آؤ، اور پھر باتیں کرو کہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہے اور یہی تمہاری طہارتِ نفس کا ذریعہ ہے۔ لیکن اگر تمہارے پاس صدقہ کے لئے مال نہیں ہے تو خدا غفور و رحیم بھی ہے۔

اس کے بعد جب صاحبانِ ثروت نے بھی صدقہ دینا اور رسولؐ کی خدمت میں حاضری بند کر دی تو قرآن مجید نے اس طرزِ عمل کی مذمت کی۔ "کیا تم لوگ نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے بھی ڈر گئے۔ خیر اگر اب نہیں کیا ہے اور توبہ چاہتے ہو تو نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو اور خدا و رسولؐ کی اطاعت کرو۔" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مالی کارِ خیر بہرحال ضروری ہے، اور اس کے بغیر توبہ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۲۲۔ زکوٰۃ بدلِ نمازِ شب

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو نمازِ شب کا حکم دیا گیا، دو ثلث شب یا نصف شب یا ایک ثلث شب تمام کا مطالبہ کیا گیا تو یہ بات مسلمانوں کے لئے مشکل ثابت ہوئی کہ شب کا حساب کرنا بھی دشوار تھا اور سفر و مرض جیسے عوارض بھی تھے اور بنیادی بات یہ ہے کہ جس ہیبتِ اسلامی کا مظاہرہ کرنا مقصود تھا وہ ظاہر بھی ہو چکی تھی لہٰذا پروردگار نے قیامِ شب کی ذمہ داری کو ختم کر دیا اور اس کے بدلے بقدرِ امکان تلاوتِ قرآن یا نماز و زکوٰۃ دی۔ اس معافی کو اس امر سے مشروط کر دیا کہ اصل نماز جب تک قائم کرتے رہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں بلکہ خدا کو قرضِ حسن بھی دیتے رہیں کہ اس کارِ خیر کے بغیر کسی معافی کی کوئی حیثیت

ہے کہ یہ مالی کارِ خیر تمام بندگی کا وہ عظیم ترین عمل اور کردار سازی کا وہ بنیادی وسیلہ ہے جسے کسی حالت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۲۳۔ زکوٰۃ علامتِ دینِ محکم

سورۂ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اہلِ کتاب پہلے دلیل کے طلبگار تھے اس کے بعد جب واضح دلیل آ گئی تو دین سے الگ ہو گئے حالانکہ انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خلوصِ عمل کے ساتھ پروردگار کی عبادت کریں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں کہ یہی مستحکم دین کی نشانیاں ہیں۔"

آیتِ مبارکہ میں صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کو تمام معاملات میں سہولت فراہم کی جا سکتی ہے لیکن نماز اور زکوٰۃ کے معاملہ میں کوئی سہولت نہیں دی جا سکتی ہے کہ یہ مسائل دین کے استحکام کی علامتیں ہیں اور وہ دین مستحکم نہیں ہو سکتا ہے جس میں نماز اور زکوٰۃ نہ ہو یا اس کے ضعیف ہو کر خدا اور بندوں سے رشتہ ٹوٹ جائے۔ دین کے استحکام کے لئے معبود اور بندوں سے رابطہ ضروری ہے۔ اور دونوں کو ان کا حق ادا کرنا ہوگا۔

۲۴۔ زکوٰۃ قوامِ معاشرہ

کسی معاشرہ کے قیام کے لئے جس طرح کے افراد کی ضرورت ہے اور ذمہ داری ہر مالی ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ صاحبانِ حیثیت سمائے معاشرت سے الگ ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں ان کا زندہ رہنا بھی ممکن نہیں ہے اور پھر معاشرہ کی تشکیل میں صاحبانِ حیثیت سے زیادہ مستحق لوگ، افراد اور عوام کے پروگرام کا دخل ہوتا ہے۔

معاشرہ کی ترقی و تمدن کے لئے ضروری ہے کہ فقراء و مساکین کی زندگی کا انتظام کیا جائے، کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، غیر قوم کے قرض کو ادا کیا جائے، معذور افراد کی مدد کی جائے، غلاموں کو آزادی دلائی جائے۔ رفاہ عام کے پروگرام بنائے جائیں، وطن سے دور مسافروں کو ان کے وطن تک پہنچایا جائے اور اسلام ... کام

زکوٰۃ کے ذریعہ انجام دیئے ہیں جن کا مطلب یہی ہے کہ معاشرہ کے قیام میں جس قدر زکوٰۃ کا حصہ ہے کسی دوسرے عمل خیر کا نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات معاشرہ کے وجود میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بغیر معاشرہ کا قیام ممکن نہیں ہے۔

۲۵۔ زکوٰۃ بہرحال خیر و برکت

شریعت اسلام نے اپنے اکثر اعمال میں نمائش کو ممنوع قرار دیا ہے اور اکثر اوقات پر اظہار عمل، عمل کے اجر و ثواب کو بھی برباد کر دیتا ہے لیکن زکوٰۃ و خیرات کی صورت یہ ہے کہ اسے دکھا کر نمایاں طور سے دیا جائے تو بھی بہترین عمل ہے اور خاموشی سے فقیر کو دیدیا جائے تو بھی عمل خیر ہے بلکہ علی الاعلان عمل اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح دوسرے افراد میں بھی کار خیر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور انھیں بھی انفاق کی دعوت حاصل ہوجاتی ہے جو کام مخفی عمل کے ذریعہ نہیں انجام پا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت حال میں احتیاط بہرحال ضروری ہے کہ عمل کا انداز واضح طور پر ریاکارانہ نہ ہو جائے۔ اور بجائے صرف خدا کے لئے ہونے کے درمیان میں غیر خدا کا دخل ہوگیا تو عمل کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی اور وہ ریاکاری میں شامل ہو جائے گا جو باعث اجر و ثواب ہونے کے بجائے سبب وزر و عذاب ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

حج بیت اللہ

اسلامی عبادات میں یہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں اسلامی سیاست کے مظاہر نہایت نمایاں انداز سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

حج بارگاہ الٰہی کی طرف ایک اجتماعی سفر ہے جس میں انسان مادی اور معنوی سفر ایک ساتھ شروع کرتا ہے۔

نماز تقرب الٰہی کا ایک سفر ضرور ہے لیکن صرف معنوی ہے جس کا اندازہ معراج سے ہوتا ہے۔

روزہ ایک معنوی سفر ہے جو نیت قربت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ "سلام" [illegible] کامل سفر ہے لیکن نماز کو عبادت الٰہی کی وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کا رخ خانہ خدا کی طرف ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی جسم کو سکون کا سامان ہوتا ہے۔

حج بیت اللہ میں یہ دونوں باتیں جمع ہوگئی ہیں۔

احرام کا تلبیہ علامت ہے کہ انسان کسی کی آواز پر لبیک کہتا ہوا قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ یہ مادی سفر علامت ہے کہ وہ واقعاً خدا کی طرف سفر کر رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ احرام کا جو سکون انسان کو سفر حج کے موقع پر حاصل ہوتا ہے وہ زمانے کے سفر معراج میں بھی نہیں ہوتا ہے۔

اس کے بعد سفر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ سفر کبھی انفرادی ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی۔

انفرادی سفر میں زحمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے اور لذت سفر کا احساس کم ہوتا ہے۔

اجتماعی سفر میں زحمت کا احساس تقسیم ہو جاتا ہے یا بٹ جاتا ہے اور راحت کا احساس دگنا چوگنا ہو جاتا ہے۔

شریعت اسلام نے ان ملاقات "سفران اللہ" کو مزید ترتیب دینے کے لئے حج کے سفر میں قافلہ کا عنوان پیدا کر دیا ہے اور سرکار دو عالم سے لے کر تمام ذمہ داران اسلام نے ہمیشہ قافلہ کے ساتھ سفر حج اختیار کیا ہے تاکہ زحمت سفر، راحت سفر و رفاقت میں بدل جائے اور انسان ہر آن یہ محسوس کرے کہ ایک قافلہ شریعت ہے جو بارگاہ الٰہی کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ ہے جو مکمل طور پر پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے جا رہا ہے۔

اس طرح حج بیت اللہ کی عبادت کا سلسلہ اسلام کی سیاست سے بھی مل جاتا ہے کہ اجتماعی سفر میں باہمی تعلقات، ایک دوسرے کے حالات کی اطلاع [illegible] خصوصیات [illegible] کے حاصل ہو جاتے ہیں اور یہ وہ فوائد ہیں جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد اسلام نے احکام میں بھی قافلہ کی رعایت رکھی ہے اور [illegible] صرف قافلہ کی خاطر [illegible] دیا ہے یا ایسی سہولت پیدا کر دی ہے تاکہ انسان کو قافلہ کی [illegible] کا احساس رہے اور وہ یہ دیکھے کہ اجتماعی سفر میں کافی شرعی سہولتیں [illegible] اور اس طرح پورے سفر حیات میں اجتماعی سفر کا پروگرام بنائے اور [illegible] پورے معاشرہ کو ساتھ لے کر چلے۔

"اماکن" [illegible] "جمع کے صیغے بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان تنہا بارگاہ الٰہی میں حاضر نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک قافلہ [illegible] ہمراہ ہے لیکن یہ صرف ایک معنوی تصور ہے جس سے انسان [illegible]

حج کے موقع پر [illegible] اور معنویت میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور نفس کو ایک مخصوص سکون حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ تنہا اپنے رب کی طرف محو سفر ہے اور اس کا ہر قدم ایک منزل تقرب کی طرف آگے بڑھ رہا [illegible] معراج بندگی ہے۔

ذیل میں فریضۂ حج کے بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن کا اندازہ حج کی آیات اور اس کے احکام سے کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ حج عالمی اجتماع

موجودہ ترقی یافتہ دور میں دنیا کے ہر ملک میں مختلف اوقات میں عالمی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں اور امریکہ میں مستقل ایک عالمی ادارہ قائم ہے جس میں سال بھر دنیا کے ہر ملک کے نمائندے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سارے اجتماعات کو حج بیت اللہ کے اجتماع سے ملا کر دیکھا جائے تو ان اجتماعات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ حج کا اجتماع ایک مذہب کے ماننے والوں کا اجتماع ہوتا ہے اور دیگر اجتماعات میں مختلف مذاہب اور نظریات کے افراد شریک ہوتے ہیں لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ کسی بھی قوم یا ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اتنا بڑا اجتماع عدیم النظیر ہوتا ہے جب کہ اس اجتماع میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دنیا کے دوسرے اجتماعات میں مفقود ہیں بلکہ ناممکن ہیں۔

● اس اجتماع میں کسی فرد، جماعت یا حکومت کی پسند کا دخل نہیں ہوتا ہے اور نہ کسی خاص نظریہ کے پسندیدہ افراد طلب کئے جاتے ہیں بلکہ [illegible] اعلان عام حج بھی قرآن میں محفوظ ہے اور مندوبین اسی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں۔

● اس اجتماع میں کسی طرح کی قومی، لسانی، طبقاتی یا نظریاتی تقسیم نہیں ہوتی ہے بلکہ سارے عالم اسلام کے افراد شاہ و گدا، سلطان و رعایا، عرب و عجم سب ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں اور سب کو مشترکہ طور پر دعوت دی جاتی ہے "[illegible] علی الناس حج البیت"۔

● اس اجتماع میں تقاتل اور علاقائی تقسیم کا بھی کوئی ظہور نہیں ہوتا ہے اور سارے ایک لباس اور ایک ہیئت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور ہر طرح کی [illegible] ہو جاتی ہے۔ "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز"۔

● — اس اجتماع میں تمام شرکا کے لیے ایک قسم کا عام اور ایک قسم کی پابندی ہوتی ہے اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصی رعایت نہیں ہوتی ہے۔

● — اس اجتماع کا مرکز ایسے مقام پر ہے جہاں [illegible] تاکہ مسلمان اپنے مسائل وہاں [illegible] سے طے کر سکیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اصلی اجتماع صرف [illegible] میں ہوتا ہے جہاں دیگر افراد بھی شریک ہو سکتے ہیں تاکہ اسلام پر جاسوسیت اور دہشت گردی کا الزام نہ لگایا جا سکے اور ہر آدمی کو اندازہ ہو جائے کہ مسلمان تمام اہل عرب کے مسائل میں غور کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ان کا مقصد کسی طرح کی فرقہ واریت یا دہشت گردی نہیں ہے۔

حج بیت اللہ نے آج یہی عالمی حیثیت اور سیاسی افادیت کو گم کر دیا ہے اور یہ انہی مسلمانوں کا قصور ہے جو اس اجتماع کے خود ساختہ منتظم ہیں اور جنھوں نے اس کی عمومی اور سیاسی حیثیت کو طاق میں رکھ دیا ہے اور اسے صرف چند صوری قسم کے اعمال کا مجموعہ بنا دیا ہے کہ ہر انسان دنیا کے دوسرے انسان سے الگ۔ اس کے مسائل سے بیگانہ اور بعض اوقات اس کے عادات و اطوار سے بیزار نظر آتا ہے۔ نہ باہمی انس و محبت ہے نہ باہمی مسائل کے حل کی کوشش۔ نہ ایک دوسرے کے درد میں شریک ہیں نہ ایک دوسرے کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر اجتماع کو اتنا ہی بے معنی ہو کے رہ جانا تھا تو اس کے نامکمل ہونے کا اعلان کر دیا جاتا اور مسلمانوں کو مطمئن کر کے ان کے گھروں میں بٹھا دیا جاتا کہ کسی طرح کا خطرہ ہی نہ پیدا ہوتا۔ [illegible] کو چند میدانوں میں دوڑ دھوپ [illegible] میں بٹھانے یا چند پتھروں کو پتھر مارنے اور چند جانوروں کا ذبیحہ کرنے کو [illegible] اسلام کا معراج ہے اور اسلام اس طرح کی بے مقصد عبادت کا قائل ہے۔

اسلام نے ساری دنیا میں مساجد کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو مسجد حرام تک بلایا ہے اور ساری دنیا کے میدانوں کے ہوتے ہوئے میدان عرفات میں جمع کیا ہے، کروڑوں روپے کا سرمایہ خرچ کروایا ہے تو کیا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان یہاں سات چکر لگا لیں اور وہاں ایک دوپہر دھوپ یا سایہ میں گزار دیں اور بس [illegible]

یہ کام تو صرف رسمی طور پر بھی انجام پا سکتا تھا اور اس میں مسافت اور [illegible] حکومت والوں کے لیے سہولت بھی تھی تو پھر سب کو ایک وقت میں جمع کرنے کی ضرورت کیا تھی اور اس کے لیے مخصوص مقام اور مخصوص سمت کی ضرورت کیا تھی۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی عظیم سیاسی اور اجتماعی فلسفہ ہے جسے تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۲۔ حج نتیجہ صدائے خلیل

خلیل جب تعمیر کعبہ مکمل کر چکے تو قدرت نے حکم دیا کہ "اب لوگوں کو حج کے لیے آواز دو۔ لوگ سواری اور پیدل لبیک کہتے ہوئے دور دراز علاقوں سے آئیں گے اور [illegible] تاکہ اس کے نتیجہ میں بہت سے منافع کا مشاہدہ کریں گے۔" (حج آیت ۲۷)

خلیل خدا نے گزارش کی کہ پروردگار ایک انسان کی آواز ساری دنیا تک کس طرح پہنچ سکتی ہے؟

ارشاد ہوا کہ تمہارا کام آواز دینا ہے۔ آواز کا پہنچانا ہمارا کام ہے [illegible] سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس آواز کو اصلاب و ارحام تک پہنچا دیں گے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ پروردگار نے صدائے خلیل کو یہ تاثیر عطا کی ہے کہ آج تک [illegible] پہاڑوں کی چوٹیوں سے "لبیک" کی صدائیں آ رہی ہیں۔ [illegible] لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

حیرت صرف تاریخ کے اس منظر پر ہے کہ [illegible] رسول اکرم [illegible] تھا۔

کیا رسول اکرمؐ کی آواز صدائے خلیل سے بھی کمزور تھی [illegible] طاقت پر دوں کے اندر بھی نہیں تھا؟

[illegible] ایک عظیم حسرت اور [illegible] کا احساس کرتا ہے کہ [illegible] کا احسان ہے [illegible] کی طرف سے دعوت [illegible] کے پیچھے ہی سے اس دعوت کو رجسٹرڈ کرا دیا ہے۔

اور احساس ہر قسم کی زحمت سفر کو ختم کر دیتی ہے اور ہر قسم کے جذبہ اطاعت و عبادت کو بیدار کر دیتا ہے بشرطیکہ انسان اس معنویت کی طرف متوجہ رہے اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ حج اعلان برائت مشرکین

سنہ ۸ھ میں مکہ فتح کر لینے کے بعد وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ مشرکین کو ان کی اوقات اور حیثیت سے باخبر کر دیا جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ اب انھیں اس پاکیزہ سرزمین پر قدم رکھنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا عظیم اعلان کس موقع پر کیا جائے اور اس کا اعلان کرنے والا کون ہو؟

مکہ مشرکین کی بستی ہے۔ کوئی شخص بھی جا کر انھیں باخبر کر سکتا ہے۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ یہ اطلاع ساری دنیا کے مشرکین تک پہونچ جائے اور مسلمانوں کو بھی یہ اندازہ ہو جائے کہ اب اسلام ایسی طاقت و شوکت کا مالک ہو گیا ہے کہ مشرکین کو مکے کی سرزمین سے باہر نکال سکتا ہے۔ اب وہ دن نہیں رہے ہیں کہ رسول اکرم کو اپنے وطن میں رہنا نصیب نہ ہو اور مکہ چھوڑ کے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑے۔ یہ بات مسلمانوں کی ترقی و اقبال کا باعث بھی ہوگی اور اس طرح انھیں ایک گونہ قلبی سکون بھی حاصل ہو جائے گا۔

اس اہم اعلان کے لئے قدرت نے حج کے موقع کا انتخاب کیا کہ اس موقع پر سارے مشرکین مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور اعلان انتہائی آسانی کے ساتھ عالم اسلام و کفر دونوں تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن اتنا خطرناک اعلان مشرکین کے اتنے عظیم مجمع میں ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا۔ اس کے لئے عظیم ترین ہمت و صلاحیت اور بلند ترین عزم و ارادہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وحی الٰہی نے حضرت علی بن ابی طالب کا انتخاب کیا اور سورۂ برائت کی آیات کو ابوبکر سے لے کر ان کے حوالے کر دیا گیا تاکہ مشرکین کی نجاست اور ان سے برائت و بیزاری کا اعلان کر دیں اور مسلمانوں کو اندازہ ہو جائے کہ برائت مشرکین کے لئے مکے سے زیادہ مناسب سرزمین اور

حج بیت اللہ سے زیادہ موزوں موقع کوئی دوسرا نہیں ہے اور یہ اعلان جہاں ایک طرف مشرکین عالم کو ان کی خباثت و شرارت سے آگاہ کرے گا وہیں دوسری طرف مسلمانوں میں ایک نیا عزم اور نیا حوصلہ پیدا کرے گا جس کے بعد بڑے سے بڑے مرحلہ کو بھی سر کیا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑے طوفانوں کا رخ بھی بدلا جا سکتا ہے۔

۴۔ حج تمہید قربانی

حج بیت اللہ کا ایک بنیادی قانون یہ ہے کہ جس فرد نے حج تمتع انجام دیا ہے وہ ایک جانور کی قربانی بھی دے جسے قربانی خلیل کی یادگار قرار دیا گیا ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جناب اسماعیل کے بدلے میں جنت سے دنبہ آگیا تھا اور وہ قربان ہونے سے بچ گئے تھے لہٰذا امت اسلامیہ کا فرض ہے کہ تاسی ابراہیم میں جانور قربان کرے۔ ورنہ اگر اسماعیل ذبح ہو گئے ہوتے تو امت کا فرض ہوتا کہ میدان منیٰ میں اپنی اولاد کی قربانی دیں اس لئے کہ کسی انسان کا فرزند اسماعیل سے زیادہ عزیز تر اور عظیم تر نہیں ہے اور جب اس راہ میں اسماعیل قربان ہو سکتے ہیں تو دیگر فرزندوں کی قربانی میں کیا تکلف ہے۔

(حج تمتع ان افراد کے حج کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے ۴۸ میل یعنی تقریباً ۸۸ کلومیٹر دور رہتے ہیں۔ مکے کے اطراف کے رہنے والوں کا فریضہ حج افراد یا حج قران ہی ہوتا ہے جس کے ارکان کی ترتیب حج تمتع سے قدرے مختلف ہے)۔

اس کے بعد دوسرا ایسا ہی قانون یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر احرام باندھنے کے بعد حاجی کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا جائے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے داخل نہ ہو سکے تو اس کا فرض ہے کہ ایک قربانی کا جانور مکہ بھیج کر وہاں ذبح کرا دے اور اس کے بعد اپنے احرام کو ختم کرے اور اگر کسی وجہ سے جانور کا بھیجنا بھی ممکن نہ ہو تو جس جگہ روک دیا گیا ہے وہیں جانور ذبح کر کے احرام سے آزاد ہو جائے۔

ان دونوں قوانین سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ حج بھی ایک طرح کی قربانی ہے اسے قربانی کی تمہید بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر انسان حج کے بعض مراسم پر عمل نہ کر سکے تو قربانی

کے ذریعہ اس کی تلافی کر سکتا ہے اور اس کا حج صحیح ہو جائے گا۔

۵۔ حج للہ

یوں تو اسلام میں تمام عبادات کا مشترک قدر یہ ہے کہ عبادات کو خالصۃً اللہ کے لئے انجام دیا جائے اور ان میں کسی طرح کی ریاکاری یا دکھاوے کا جذبہ شامل نہ ہونے پائے لیکن حج اپنی خصوصیات کی بنا پر زیادہ للہیت کا حامل ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان روز اول سے حج کے ارادہ سے اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر خدا کا رخ کرتا ہے اور اس کی للہیت کا سلسلہ اس کے گھر ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حج کا آغاز لبیک سے ہوتا ہے جو خلیل خدا کی آواز پر لبیک کہنے کے مرادف ہے اور یہ لبیک کا مسلسل مظاہرہ ہے کہ انسان صرف ادائے فرض کی بنا پر گھر سے نہیں نکلا ہے بلکہ اس دعوت الٰہی پر لبیک کہنے کے لئے نکلا ہے جس کا پیغام خلیل خدا کے ذریعہ پہونچا ہے۔

تیسری بات یہ بھی ہے کہ حج کے اکثر اعمال و مناسک کی بنیاد نفس کی خواہشات و جذبات کی مخالفت پر ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج تمام عبادات میں سب سے زیادہ للہیت چاہتا ہے کہ انسان اپنے وجود سے غافل ہو جائے لیکن اپنے پروردگار کے حکم سے غافل نہ ہونے پائے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ جسم کے اندر پائے جانے والے جانوروں کی اذیت اور نفس کے اندر پائے جانے والے حرص و دنیا سے غافل ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے پروردگار کے حکم سے غافل ہو جائے اور یہ للہیت کی وہ منزل ہے جس کی مثال دوسری عبادات میں نہیں پائی جاتی ہے۔

حالت نماز میں جوں کو مار بھی سکتے ہیں اور اٹھا کر پھینک بھی سکتے ہیں لیکن حالت احرام میں اس کا امکان بھی نہیں ہے۔

اسی طرح حالت قیام میں اپنی جگہ دوسرے کو دے سکتے ہیں لیکن حالت احرام میں اس کا بھی امکان نہیں ہے۔

گویا حج مکمل طور پر للہیت کا ایک نمونہ ہے جس کے بعد انسان اپنا نہیں رہ جاتا ہے بلکہ اپنے پروردگار کا ہو جاتا ہے

اور اسی کا نام زبان شریعت میں تلبیہ ہے جو سرکار دو عالم کا مکمل انتساب اور ان کی زندگی کا بہترین مظہر ہے۔

"پیغمبر کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادات، میری حیات اور میری موت سب اس اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین اور وحدہ لاشریک ہے، میں اسی کا بندہ ہوں اور اسی کے احکام پر سر تسلیم خم کرنے والا ہوں۔"

۶۔ حج اور کائنات

سورۂ بقرہ آیت ۱۸۹ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "پیغمبر! لوگ آپ سے چاند کے تغیرات کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے اور موسم حج کی تعیین کا وسیلہ ہے۔"

دین اسلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے جن مسائل کو حیثیت دی ہے ان کے حل بھی اسی انداز کے قرار دئے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ کو خواص سے وابستہ کیا ہے تو اس کے حل بھی ویسے ہی ہیں جن کا ادراک خواص کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے اور اگر کسی مسئلہ کو عوام الناس سے مربوط کیا ہے تو اس کے وسائل بھی اسی قسم کے عمومی بنائے ہیں۔

معاملات زندگی اور عبادات کا سلسلہ عمومی تھا تو اس کے پرکھنے کا معیار بھی ایسا عام بنا دیا ہے جس کا ادراک ہر جاہل انسان بھی کر سکتا ہے۔

چاند کب نکلتا ہے۔ کس طرح بڑھتا ہے۔ کب کامل ہوتا ہے۔ کس طرح کم ہوتا ہے۔ کب غائب ہو جاتا ہے اور پھر کب نکلتا ہے؟

یہ وہ مسائل ہیں جنہیں ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں حج و صوم بھی عوام ہی کی شہادت پر اعتماد کیا گیا ہے اور اس کا علم و فضل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام نے اپنی تقویم قمری قرار دی ہے کہ اس کا تعلق تمام خواص و عوام سے ہے اور اس کے ذریعہ ہر شخص اپنی زندگی اور بندگی کا نظام مرتب کر سکتا ہے اور کوئی کسی کا محتاج نہیں ہے۔

اوقات نماز کے واسطے سورج کے طلوع، زوال اور غروب کا حوالہ دیا گیا ہے کہ یہ بھی ایک روزمرہ کا مسئلہ ہے اور اس کا تعلق بھی ہر اس انسان سے ہے جس پر نماز واجب کی گئی ہے۔

گویا اسلام میں اوقات کا معیار سورج ہے اور تاریخوں کا معیار چاند۔ اسلام نے دوسرے حسابات کو نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اپنے حساب کا معیار چاند ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلامی طریقہ پر معاملات کو انجام دینا چاہتا ہے اسے چاند کی کیفیات پر بہرحال نظر رکھنا ہوگی۔

دوسرے عرب اور دوسرے غیر اسلامی ممالک ہر معاملہ حیات کو کائنات سے لاتعلق ہو کر بھی شروع کر سکتے ہیں کہ آج جنوری کی پہلی تاریخ ہے لہٰذا سال کا آغاز ہو گیا ہے لیکن عالم اسلام پہلی تاریخ کے تعین کے لئے بھی نظام کائنات پر نظر کرنے کا محتاج ہے اور اس طرح اسلام نے ہر شخص کو آیات الٰہیہ کی طرف لاشعوری طور پر متوجہ کر دیا ہے اور کسی فرد مسلمان کو زمین پر رہ کر آسمان سے غافل نہیں ہونے دیا ہے۔

اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ چاند کے اعتبار سے حج کا موسم معین کرنے کا راز یہ بھی ہے تاکہ انسان کا حج بیت اللہ کائنات سے غفلت کا سبب نہ بن جائے بلکہ حقیقی حج بیت اللہ کرنے والا وہی ہو جو نظم کائنات پر نظر رکھے اور یہ دیکھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ کب شروع ہے اور چاند کی کیفیت کس تاریخ کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس طرح حج بیت اللہ [illegible] میں ایک رابطہ پیدا کر دیتا ہے اور زمین کا رشتہ آسمان سے جوڑ دیتا ہے اور اسی بات کو [illegible] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ مالک کائنات نے چاند کو معیار بنانے کے بعد [illegible] کی تاریخیں انتہائی روشن راتیں قرار دے دی ہیں کہ دنیا کے تمام وسائل روشنی ختم بھی ہو جائیں تو وادی [illegible] کی شب اور [illegible] کی شب کو مزدلفہ میں بقدر ضرورت

رہے گی۔ پھر منیٰ میں شب باشی کا کام گیارہویں اور بارہویں شب میں قرار دیا جس وقت چاند کی صورت تقریباً نصف کے قریب ہوتی ہے اور کائنات کو بقدر امکان روشن بنا رہتا ہے تاکہ لوگ اس کی روشنی میں ایک دوسرے کے حالات پر نظر رکھ سکیں اور اپنے اعمال کو انتہائی سہولت و آسانی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

اسلام کی انہیں حکمتوں نے اسے دین فطرت بنا دیا ہے اور اس کا کوئی قانون اصول فطرت اور قوانین طبیعت کے خلاف نہیں ہے۔

۷۔ حج سفر الی اللہ

اسلام کے جملہ عبادات کے مقابلہ میں حج بیت اللہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں فی سبیل اللہ کا عنوان واضح طور پر نظر آتا ہے اور اس میں اس کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کا بہترین مصداق ہے لیکن اس کی حیثیت معنوی ہے ظاہری اعتبار سے اس میں کوئی سفر نہیں ہوتا ہے، وہ کسی وقت کسی مقام پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں مقام بدر جیسا سفر بھی ہو سکتا ہے اور جنگ خندق کی طرح گھر کے اندر بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن حج بیت اللہ میں سفر کی کیفیت بہرحال ضروری ہے باہر کے رہنے والوں کو مکہ کا سفر کرنا پڑتا ہے اور مکہ والوں کو بھی عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کی منزلوں سے گذرنا ہوتا ہے اور وہ بھی چند مخصوص تاریخوں میں جب سارا عالم اسلام ایک نقطہ پر جمع ہو جاتا ہے۔

حج کی اس مخصوص کیفیت کا اندازہ چند باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ حج کے وجوب میں راستہ طے کرنے کی استطاعت کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے جس میں صحت بھی شامل ہے، اور راستہ کا زاد راہ بھی شامل ہے۔ جو اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حج ایک اجتماعی سفر الی اللہ ہے جس میں ہر انسان کو ایک وقت روحانی و معنوی سفر ہوتا ہے اور اس طرح عبودیت کی منزلوں کو طے کرنا ہوتا ہے۔

ب۔ عرفات میں زوال سے غروب تک قیام کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "عرفات سے واپس ہونے کے بعد مشعر الحرام میں ذکر خدا کرو" (بقرہ آیت ۱۹۸)۔ جس میں ایک اجتماعی

کیفیت پائی جاتی ہے، اور اسی عرفات سے غروب سے قبل نکل جانے پر ایک اونٹ کی قربانی کا شدید ترین کفارہ رکھ دیا گیا ہے۔

ج۔ "مشعر الحرام میں عبادت گذارنے کے بعد تمام لوگوں کے ساتھ منیٰ کی طرف کوچ کرو" (بقرہ ۱۹۹)۔

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام ایک اجتماعی سفر کا منظر پیش کرنا چاہتا ہے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ باطنی اور معنوی سفر سے انسان تقرب کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کرے۔ اسے وہ لذت عبادت حاصل نہیں ہوتی ہے جو اس اجتماعی اور مادی سفر میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں ہر شخص ایک خاص لباس میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنے پروردگار کی طرف سفر کرتا ہے اور اس کی نظر میں عبادت الٰہی کے علاوہ کوئی محرک نہیں ہوتا ہے، اور اس کی تاکید برابر دعاؤں یا لبیک سے ہوتی رہتی ہے۔

۸۔ حج مانع لذات وخرافات

"حج چند مقررہ مہینوں میں ہوتا ہے اور جو شخص بھی اس زمانے میں اپنے اوپر حج کو فرض کرے اسے عورتوں سے مباشرت، گناہ اور جھگڑے کی اجازت نہیں ہے"۔ (البقرہ۔ ۱۹۰)

انسانی فطرت ہے کہ عالم مسافرت میں وحشت سفر سے انس و راحت کی طرف متوجہ کرتی ہے، اور جب چار افراد جمع ہو جاتے ہیں تو وہاں گرمی محفل کے لئے یا اپنی برتری کے اظہار کے لئے بے بنیاد مذاکرے شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح عبادت بھی معصیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عبادت گذار انسان کبھی بھی اس نکتہ کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن قرآن مجید نے خصوصیت کے ساتھ حج کے موقع پر ان چار امور اور عادات پر پابندی عائد کر دی تاکہ انسان کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ عالم غربت کا سفر نہیں ہے جب انس و جنس سے دل بہلانے کی ضرورت پڑے۔ یہ پروردگار کی بارگاہ کی طرف سفر ہے جہاں انسان تمام ماسوا سے غافل ہو جاتا ہے، دوسرے ہر ذات میں ایک رحمت کا احساس ہوتا ہے۔

اور پھر یہ اجتماع بھی دنیاداری کا اجتماع نہیں ہے جہاں اپنی برتری کے اظہار

ضرورت پڑے بلکہ یہ بندگی کا مجمع ہے جہاں ہر حسن ذات و عاکساری انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اور معراج تک پہونچا دیتا ہے۔

غلط بیانی انسانی کردار کے لئے اور فخر و مباہات انسانی بندگی کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ غلط بیانی کے بعد انسان کی بات کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور فخر و مباہات سے انسان کی بندگی شیطنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شیطان کی کل شیطنت یہی تھی کہ اس نے امر الٰہی کے بعد بھی مقام بندگی میں فخر و مباہات کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون و مردود قرار پا گیا۔

۹۔ حج فریضۂ انسانیت

حج بیت اللہ کے امتیازات میں ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ دین اسلام نے اسے اسلام و ایمان کے مقتضیات و لوازم میں قرار دینے کے بجائے انسانیت کے لوازم میں قرار دیا ہے اور بار بار اس نکتہ کی تاکید کی ہے کہ جس طرح انسان فطری طور سے بڑی شخصیتوں کے دربار میں حاضری کا خواہشمند رہتا ہے اسی طرح اس کے دل میں بارگاہ الٰہی میں حاضری کا اشتیاق بھی ہونا چاہیے جب کہ اس عظیم ذات کے دربار میں حاضری کی اجازت بھی دے دی اور بارگاہ عبودیت میں لسان عظیم و پیغمبر جلیل کے ذریعہ مدعو بھی کیا ہے۔ یہ وہی اشتیاق حج ہے جس کا تعلق صرف مسلمان کا نقش نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کی آواز ہے کہ انسان دین و مذہب اور مسلک کا امتیاز کئے بغیر اس سلسلہ میں اتنا بھی نہیں کرتا ہے جتنا عام شخصیتوں کے سلسلہ میں تقاضائے انسانیت انجام دے لیتا ہے۔

حج بیت اللہ کے سلسلہ میں انسانیت کا حوالہ حسب ذیل طریقوں سے دیا گیا ہے:

ا۔ "بلا شبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ مکہ میں ہے اور مبارک ہے اور عالمین کے لئے ہدایت ہے"۔ (آل عمران۔ ۹۶)

ب۔ "اللہ کے لئے انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کے گھر کا حج کریں"۔ (آل عمران۔ ۹۷)

ج۔ "پیغمبر! لوگ آپ سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ

نشانیوں اور حج کے لئے وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔" (بقرہ ـ ۱۸۹)

د ـ "اس کے بعد اس طرح کوچ کرو جس طرح تمام انسان کوچ کرتے ہیں۔" (بقرہ ـ ۱۹۹)

ک ـ "اللہ نے بیت الحرام کعبہ کو انسانوں کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ہے۔" (مائدہ ـ ۹۷)

و ـ "اللہ و رسول کی طرف سے روز حج اکبر سب انسانوں کے لئے یہ اعلان ہے کہ اللہ و رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔" (توبہ ـ ۳)

ز ـ "مسجد الحرام کو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر قرار دیا گیا ہے چاہے وہ حاضر ہو یا باہر والا ہو۔" (حج ـ ۲۵)

ح ـ "ابراہیم، انسانوں کے درمیان حج کا اعلان کرو۔" (حج ـ ۲۷)

ان آیات کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حج بیت اللہ اپنے مکان، اعمال، فرائض، مناسک، تاریخ اور فوائد سب کے اعتبار سے تمام انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے فوائد کا تعلق صرف عالم اسلام و ایمان سے نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کی تمام تجارتی کمپنیاں، دنیا کے تمام تجارتی ادارے ... کے تمام صنعتی کارخانے حتیٰ کہ ایک حج بیت اللہ سے مستفید ہو سکتے ہیں، دنیا کی کسی قوم یا جماعت سے ... استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ ... حج بیت اللہ سے اپنے مقاصد کے لئے مسلسل استفادہ کر رہے ہیں اور مسلمان اس عظیم اجتماع کو صرف عبادت، شرک کی تردید ... کرنے یا صرف انفرادی عمل قرار دے دینا چاہتے ہیں اور اس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے یہ اجتماع عظیم کیا گیا تھا اور اسے دائمی حیثیت دی گئی تھی۔ مسلمانوں کی نگاہ میں سارا تقدس حج یہی ہے کہ مخصوص انداز سے لباس احرام پہن لے اور مخصوص آداب کے ساتھ مناسک حج انجام دے لے۔ گویا کہ پروردگار عالم نے ہزاروں میل سے صرف اس کا طریقہ سکھلانے کے لئے بلایا تھا یا اسے اپنے گھر کے گرد چکر لگانے سے کوئی ... مسرت ہوتی ہے۔

حیرت انگیز بلکہ افسوسناک امر ہے کہ مسلمان اہل علم اور دانشور بھی اس نقطہ سے

بالکل غافل ہو گئے ہیں اور استعمار نے ان کے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ وہ دین اسلامی امر سوچتے ... نہیں پاتے ہیں اور ... عظیم مواقع کے ضائع کر دینے ہی کو توحید، عقل، اور تقدس مذہبی کا نام دے رہے ہیں!

۱۰۔ حج قیام للناس

"اللہ نے کعبہ کو جو بیت الحرام ہے لوگوں کے لئے صلاح و فلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے۔"
(مائدہ ـ ۹۷)

آیت شریفہ میں انسانی صلاح و فلاح کے وسائل کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بیت الحرام کے ساتھ قربانی کے جانور اور محترم مہینوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کے قیام میں حسب ذیل عناصر کا عظیم ترین حصہ ہے۔

● انسان صلح و جنگ کے موقع سے آشنا ہو اور ہر وقت جنگ و جدال کے لئے آمادہ نہ ہو جائے۔

● انسان میں قربانی پیش کرنے کا جذبہ ہو اور جان یا مال کی قربانی سے پریشانی نہ پیدا ہو۔

● انسان ہر اس شے کی حرمت سے آشنا ہو جسے راہ خدا میں وقف کر دیا جائے اور ... کے حوالے کے معیار سے بھی آشنا ہو۔

لیکن اس کے بعد ایک جدید عنصر بیت الحرام کو قرار دیا گیا ہے جس کا مسلمانوں کا تعلق بیت اللہ کے سلسلہ سے ہوتا ہے ... یہ ایک ایسا مرکز ہے جو عالم انسانیت کو ایک نقطہ پر جمع کر کے صلاح و فلاح کے بارے میں باہمی فکر و نظر اور اجتماعی صلاح و مشورہ کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اسی حج بیت اللہ کی بنیاد پر کعبہ کو وسیلہ صلاح و فلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کی سیاسی حیثیت سے انکار کرنا اور اسے انفرادی یا ... کا نام دے دینا حج کے قیام للناس ہونے کا کھلا ہوا انکار ہے جو قرآن مجید کے بیان کردہ فلسفہ حج کے ... ہے اور ... اسلامی مقاصد سے دور تر ہو گیا ہے۔

۱۔ حج یادگار سلف صالحین

دنیا کی وہ تمام قومیں مُردہ شمار کی جاتی ہیں جن کے پاس درخشاں ماضی موجود نہ ہو، اپنے تابناک ماضی سے رشتہ منقطع ہو۔ تابناک ماضی سے ہی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، اس میں خود شناسی اور خود مختاری کی روح بیدار کر دیتا ہے۔

حج بیت اللہ اس اعتبار سے بھی ایک خصوصی امتیاز کا حامل ہے کہ اس میں ماضی کی تابناک تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور اس کے ارکان و مناسک انسان کو ایک عظیم ترین تاریخ سے متعارف کرا دیتے ہیں۔

حج کا طواف پوری تاریخ آدمیت کا نچوڑ ہے۔

حج کی سعی ایک خاتون کے مجاہدت کی یادگار ہے جہاں ایک ماں نے خدا کی زندگی کے لئے عظیم ترین مشقت کا سامنا کیا ہے۔

حج کی قربانی تاریخ کے دو عظیم بندوں کے جذبۂ اخلاص کی یادگار ہے جہاں ضعیف باپ حکم خدا کی تعمیل میں بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا اور نوجوان فرزند "ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین" کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔

حج کے میدان عرفات و مزدلفہ بھی تاریخ انسانیت کے اہم ترین مراکز ہیں جہاں پہنچ کر انسان کا ضمیر قربانی پر آمادہ ہوتا ہے اور انسان اس راہ پر چلنے کا ایک نیا جوش پیدا کر لیتا ہے۔

خود کعبہ مقدس کی تاریخ بھی ایک ایسی درخشاں تاریخ ہے جو انسان کو اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ انسان میں توکل علی اللہ کا جذبہ ہو تو بے آب و گیاہ صحرا میں بھی زندگی گذار سکتا ہے اور انسان عظمت پروردگار سے آشنا ہو جائے تو پروردگار وادی غیر ذی زرع میں بھی پھلوں کا رزق عنایت کر سکتا ہے۔

کیا کہنا اس مقدس خاتون کا جس نے تجارتِ بیت اللہ میں قیام کی خاطر سارے ... کو ترک کر دیا اور ایک چھوٹے سے بچے کو لے کر ایک جھونپڑے سے آب و گیاہ میں بیٹھ گئی

اس کا اعتماد صرف ذات پروردگار پر تھا کہ وہ کسی مخلوق کا رزق بند نہیں کر سکتا ہے اور جسے پیدا کیا ہے اس کی روزی کا انتظام ضرور کرے گا۔

۱۲۔ حج یادگار قربانی

کیا قیامت خیز وہ لمحہ تھا جب ایک باپ نے اپنے فرزند کے گلے پر چھری پھیر دی تھا اور قدرت آواز دے رہی تھی۔ اے ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا ہم حسن عمل والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں، ہم نے اسماعیل کا فدیہ ایک ذبح کو قرار دے دیا ہے اور اس قربانی کو آخری دور کے لئے چھوڑ رہی ہے۔

ابراہیم حکم الٰہی کی تعمیل پر خوش تھے، اور اسماعیل شرف قربانی میں قدم رکھنے پر مسرور تھے۔ قدرت کو اپنے ان مخلص بندوں کا عمل اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے ارکان حج میں شامل کر کے رہتی دنیا تک کے لئے واجب اور دائمی بنا دیا اور اب کسی مسلمان کا عمل اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک راہ خدا میں ایک قربانی پیش نہ کرے۔

یہ قدرت کا امت اسلامیہ پر احسان ہے کہ اس نے اسماعیل کی قربانی کے عوض ایک ذبح ... دیا اور حج میں ولادت کی قربانی شامل ہو گئی اور ہر حج بیت اللہ ... ہے ... کہ میں فرزند کی قربانی پیش کر رہا ہوں۔

حج بیت اللہ کرنے والا جب ... کی صبح کو منیٰ کے میدان میں قدم رکھتا ہے ... نگاہ کے سامنے وہ عظیم تاریخی منظر گردش کرنے لگتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ... حج ... میں قدم رکھ رہا ہے جہاں خلیل خدا کے قدم پہنچے ... اور ... ایک جانور پیش ... کی قربانی کا معاملہ ہے۔ ... حقیقی ... ہے کہ اگر ... کی قربان کا حکم ہو جائے تو اسی طرح فرزند کے گلے پر چھری پھیر سکتا ... ابراہیم نے عمل انجام دیا تھا۔ ... آواز ... کہتا ہوا ... خلیل خدا نے میری جید ... بیٹے ... کی تھی اور جس کے ...

۱۴۔ حج برائت از شیطان

حج کے اعمال میں ایک عمل ہے رمی جمرات۔ جس کی تکرار تین دن تک مسلسل ہوتی رہتی ہے اور یہ حج کا وہ منفرد عمل ہے جس کی اس قدر تکرار ہوتی ہے ورنہ ہر عمل ایک مرتبہ انجام پا جاتا ہے اور بس۔!

طواف خانۂ کعبہ ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
نماز طواف ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
سعی ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
عرفات، مزدلفہ کا وقوف ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
قربانی ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
حلق ایک مرتبہ ہوتا ہے۔
طواف نساء اور اس کی نماز ایک مرتبہ ہوتی ہے۔
لیکن رمی جمرات کا سلسلہ تین روز تک جاری رہتا ہے۔

دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کو رمی کرنا ہوتی ہے اور ۱۱، ۱۲ کو تینوں جمرات کو رمی کرنا ہوتی ہے اور اس پورے کاروبار میں وہی اسلحہ استعمال ہوتا ہے جو روز اول ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنکری ایک ایسا اسلحہ ہے جو ہمیشہ باطل کے اہم مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

ابرہہ کو فنا کرنا ہو تو یہی اسلحہ استعمال ہوا۔ جمرات کو رمی کرنا ہوتی ہے تو یہی اسلحہ استعمال ہوتا ہے۔

سرکار دو عالمؐ کا کفار کو اندھا بنانا ہوتا ہے تو یہی اسلحہ استعمال ہوتا ہے اور پروردگار کو بھی اس چھوٹے سے ذرہ کی ادا اس قدر پسند ہے کہ اپنے محبوب کی رسالت کی گواہی بھی دلوانی ہوئی تو انہیں ذرات کو استعمال کیا گیا اور انھوں نے ہی کلمہ پڑھ کر ثابت کر دیا کہ ہم سے

اس وقت قوت بھی ہے اور قوت سنگ بھی۔ ہم رسالت کی گواہی دے بھی جانتے ہیں اور دشمن کو اندھا بنانا بھی۔

کہا جاتا ہے کہ حج کا یہ عمل بھی خلیل خدا کی ایک یادگار ہے کہ جب جناب ابراہیمؑ جناب اسماعیلؑ کو لے کر مقام ذبح کی طرف چلے تو شیطان نے تین مرحلوں پر اس قربانی کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ پہلے خود جناب ابراہیمؑ کو بہکایا اور جب حضرت نے اسے سنگسار کر دیا تو جناب ہاجرہ اور جناب اسماعیلؑ پر اپنا حربہ فریب استعمال کیا لیکن سب نے اسے دھتکار دیا اور اسلام نے اس ادا کو جزو عبادت بنا دیا۔

بظاہر چھوٹے بڑے کا فرق پتھروں کے فرق سے نہیں ہے۔ بلکہ مختلف قسم کے شیاطین کی تعبیر ہے یا مختلف قسم کی شخصیتوں کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تین طرح کی شخصیتیں مصروف کار ہیں اور شیطان نے تینوں پر حملہ کیا لہٰذا انھیں شخصیتوں کے اعتبار سے عدد اور سنگ و درجہ کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

جب جناب ابراہیمؑ پر حملہ کیا تو اس کا عنوان جمرۂ عقبہ ہو گیا اور جب جناب ہاجرہ پر حملہ ہوا تو اسے جمرۂ وسطیٰ کہہ دیا گیا اور جب جناب اسماعیلؑ کا رخ کیا تو اس کی حیثیت جمرۂ صغریٰ کی ہو گئی۔ اور اس طرح سے مسلک حج سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ عمل ایک مرتبہ نہیں انجام پایا بلکہ شیطان بار بار کوشش کرتا رہا کہ صورت حال کو الٹ دے اور جیسے جیسے معاملہ سر ذبح سے قریب تر ہوتا گیا اس کی کوششیں بھی تیز ہوتی گئیں۔ لیکن بالآخر ناکام ہو گیا اور عباد مخلصین کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

حج کا یہ عمل مسلمانوں کو اس وقت کی یاد دلا کر حسب ذیل امور کی طرف توجہ دلاتا ہے

- بندۂ خدا [illegible] سب کا فریضہ یہ ہے کہ سنگ [illegible] قسم کے اقدامات کے حامل ہوں۔
- قربانی کی راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔
- امر الٰہی کے آجانے کے بعد شیاطین کے فریب میں آ جانا شان عبدیت و اخلاص کے سراسر خلاف ہے۔

• ۔ جس طرح شیطان اپنے مقصد کے سلسلے میں مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے اور مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ بندۂ مومن اور مرد مسلمان کو بھی اسی جوش و ولولہ کا مالک ہونا چاہیئے۔

• ۔ دشمن کے مقابلہ میں اس کی کمیت پر نظر نہیں کرنی چاہیئے اور جس طرح ممکن ہو سنگ ملامت کرنا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ کنکری بھی شیاطین کو مار دینے کا سبب بن جائے۔

حج کا یہ سب سے آخری عمل انسان کو ہوشیار کرتا ہے کہ اگر شیاطین سے برائت کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا تو سارے حج کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مسلمان کو میدان منیٰ میں ظہر کے وقت تک انتظار کرنا چاہیئے اور بھرے مجمع میں شیطان کو پتھر مار کر یہ جذبہ لے کر اپنے وطن کو جانا چاہیئے کہ اس سے بہتر کوئی تحفہ حج نہیں ہے۔ [illegible] اعمال و مناسک مکہ مکرمہ میں کام آتے ہیں اور برائت شیاطین کا جذبہ پوری دنیا میں کہیں بھی کام آسکتا ہے۔

۱۴۔ حج سادگی حیات

انسان گھر کے اندر سے باہر ڈرائنگ روم تک اپنے دوست سے بھی ملاقات کرنے کے لئے آتا ہے تو اپنے لباس کو ٹھیک کر کے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد گھر سے باہر نکلنا ہو تو لباس کا مزید اہتمام کیا جاتا ہے [illegible] کی نگاہ میں اس کی عزت و عظمت کا ایک بڑا حصہ لباس سے وابستہ ہے اور لباس انسان کی شخصیت کو اعتبار بخش دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے لوگ اپنے لباس پر خاص توجہ دیتے ہیں اور ان کی دولت کا ایک بڑا حصہ لباس کی ساخت و پرداخت پر خرچ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر شخصیت کی تشکیل بہت مشکل ہوتی ہے۔

لیکن حج بیت اللہ نے اس پورے نظام حیات کو بدل کر دیا اور حکم ہوا کہ لاکھوں کے مجمع میں ایک لنگی اور چادر پہن کر نکل پڑو اور اپنے بہترین لباس کو اتار دو۔

اس طرز عمل سے [illegible] اس نظریہ کا بھی علاج ہو جائے گا کہ انسان کی عظمت و شخصیت میں لباس کا بھی کوئی دخل ہے اور انسان کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوگا کہ لباس تقویٰ سے بہتر کوئی لباس نہیں ہے۔

دوسرے [illegible] یہ خیال بھی پیدا ہوگا کہ اگر [illegible] شخصیت [illegible] کا کوئی [illegible] دوسرے تو

حج بیت اللہ شخصیت سازی کا میدان نہیں ہے بلکہ خود سپردگی کا میدان ہے جہاں داخل [illegible] بڑی سے بڑی کوئی دولت نہیں ہے۔ انسان جس قدر بھی انکسار [illegible] اپنے کو پیش کرتا ہے رب العالمین اسے اسی مقدار میں صاحب عزت و عظمت بنا دیتا ہے۔

اس عمل سے مسلمانوں میں مساوات اور یک جہتی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور سب کو خیال ہوتا ہے کہ [illegible] شخصیت کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ مقام بندگی میں سب ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کبھی دشمن کے مقابلہ میں جانا ہوگا تو شخصیت کا اظہار کرنا ہوگا۔ اس وقت تو رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری کا مرحلہ ہے۔ اس وقت کسی شخصیت سازی یا خود نمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۵۔ حج دعوت الٰہی

حج بیت اللہ انجام دینے والا انسان جب لباس احرام پہن کر بھرے مجمع میں [illegible] احساس پیدا کرتا ہے اور [illegible] نظر آتی ہے [illegible] احرام کے ساتھ لبیک کی ایک عجیب و غریب منزلت کا احساس دلاتی ہے [illegible] تمام [illegible] کر اپنے کو مجمع عام میں [illegible] دعوت کے لئے عظیم ترین [illegible] لباس بھی درحقیقت ایک [illegible] نہیں ہے بلکہ ایک عظیم [illegible] بارگاہ میں [illegible] کہ اگر دنیا کے [illegible] حاضری [illegible] تو رب العالمین کو تو بہرحال یہ حق حاصل ہے۔

[illegible] صرف یہ ہے کہ [illegible] کی اپنی حیثیت [illegible] سے [illegible] بڑھ [illegible] چاہتے ہیں [illegible] لیکن رب العالمین ان تمام امور سے [illegible] موت کی [illegible] سے بلند تر [illegible] دینا چاہتا ہے [illegible] اس لئے [illegible] لگ رہے ہیں۔

پھر سلاطین دنیا کے روابط تمام افراد سے الگ الگ ہوتے ہیں کہ بعض کو باریابی کا شرف ملتا ہے اور بعض کو نہیں۔ بعض کی حیثیت بلند تر ہوتی ہے اور بعض کی کمتر اور سب اپنے گھر سے اپنی حیثیت بنا کر آتے ہیں۔

لیکن رب العالمین کی حیثیت ان تمام امور سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے روبرو تمام مخلوقات ایک قسم کے ہیں اور سب اس کے بندے ہیں چاہے وہ سلطان السلاطین ہوں یا فقیر فقرا۔ حیثیت کے اعتبار سے اس کے مقابلہ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ اس حیثیت کے لحاظ سے اس کا ایوان عام الگ کر دیا جائے۔ سب فقرا، سب فقیر ہیں اور وہ غنی و حمید ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا ایوان عام ایک قسم کا ہونا چاہیے اور وہ بھی اتنا سادہ کہ ہر شخص اسے اختیار کر سکے اور کسی شخص کو زحمت و شکست کا احساس نہ ہو۔

لباس احرام پہن کر انسان شرمندگی اور حجاب کے بجائے ایک طرح کی عزت و عظمت کا احساس کرتا ہے کہ اب عنقریب خانۂ خدا میں حاضری کا شرف ملنے والا ہے اور میزبان کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا ہے جہاں ضیافت کا سارا سامان پہلے سے موجود ہے "مبارکاً وھدی للعالمین"۔ دنیوی اعتبار سے ہر طرح کی برکت اسی کعبہ کے اندر ہے اور دینی اعتبار سے ہدایت کا سارا انتظام اسی کعبہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ "لکل قوم ھاد" کا پہلا مصداق اسی کعبہ سے ملتا ہے اور کل ایمان کے وجود کا سراغ اسی خانۂ کعبہ سے ملتا ہے۔

۱۲۔ حج اصلاح مفہوم زینت

اسلام اپنے چاہنے والوں کو نہایت ہی آراستہ اور پیراستہ شکل میں دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ اس کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ:

- ہر مسجد کے وقت اپنی زینت کا خیال رکھو۔
- کس نے زینت خدا اور پاکیزہ رزق کو حرام کر دیا ہے۔
- ہم نے روئے زمین کی ہر شے کو اس کے لئے زینت قرار دے دیا ہے۔
- مال اور اولاد زندگانی دنیا کی زینت ہیں۔

- عورتوں کو چاہیے کہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں (مخفی رکھیں)۔

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام زینت کا حامی ہے اور وہ اپنے چاہنے والوں اور ماننے والوں کو بدترین حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود جب انسان حرم حج میں قدم رکھتا ہے تو اسے ہر قسم کی زینت سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ لباس میں سادگی آ جاتی ہے عورتوں کے زیور اتار دئے جاتے ہیں۔ ایک انگوٹھی یا چھلا بھی اگر زینت میں شمار ہو یا زینت کی نیت سے ہو تو اسے بھی برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔ تو آخر اس کا راز کیا ہے؟ نماز کے وقت زینت کا مطالبہ کیا جائے اور حج کے موقع پر زینت کو ترک کرا دیا جائے؟

کیا پروردگار کے نظام میں بھی اس طرح کی بے نظمی پائی جاتی ہے؟

نہیں ہرگز نہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ حج ایک مدرسۂ تربیت ہے جہاں انسان کو بلا کر اسے ہر طرح کی تربیت دی جاتی ہے اور اس کے بعد رخصت کر دیا جاتا ہے کہ اب اسی تربیت کے زیر سایہ زندگی گزارے اور یہ احساس رکھے کہ صرف مادی آرائش ہی کا نام زینت نہیں ہے بلکہ انسان کا ایمان و کردار بھی ایک سامان زینت ہے جس سے بہتر کوئی سامان نہیں ہے۔

عورت کے لئے حج کا یہی سبق رکھا گیا ہے کہ وہ زیور ترک کر دینے کو کمال نہ سمجھے بلکہ زیور کے مفہوم کی تبدیلی کو کمال سمجھے اور زیور حیا سے ہر لحظہ آراستہ رہے۔

مال و اولاد کو زینت حیات دنیا قرار دینے کے بعد باقیات صالحات کا تذکرہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ باقیات صالحات بھی انسان کی زندگی کی ایک زینت ہیں جن کا احساس و ادراک صرف صاحبان علم و عرفان ہی کو ہو سکتا ہے۔

ازواج پیغمبرؐ کو مطالبۂ زینت دنیا پر تنبیہ کرنا اور تقویٰ کا حکم دینا اس امر کی علامت ہے کہ تمہاری زینت سامان دنیا نہیں ہے بلکہ تمہاری زینت تقویٰ ہے اور تمہیں اسی سے ہر حال آراستہ رہنا چاہیے۔

زینت ایک بہترین مرغوب و مطلوب شے ہے جس سے کوئی صاحب ذوق سلیم انکار نہیں کر سکتا ہے لیکن اس کا مفہوم اور مصداق حالات یا افراد کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔

بعض معاشروں میں داڑھی منڈانے کا نام بھی تزئین رکھا گیا ہے جبکہ اسلام نے کثافت مادی کا عمل قرار دیا ہے۔ اور اس کی نگاہ میں داڑھی مرد کے لئے بہترین زینت ہے، اور اسی لئے "زینۃ الرجال" کا نام دیا گیا ہے۔

اس کے نقطۂ نگاہ سے زینت دنیا اور زینت مادی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ انسان کو روحانی اور معنوی اعتبار سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اس کے بعد مادی زینت بھی پیدا ہو جائے تو "نور علیٰ نور" ہے۔ لیکن معنوی زینت کو ترک کرکے صرف مادی زینت پر توجہ دینا یا کردار کی کثافت ہے جسے زینت کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۱۷۔ حج، تعیین محورِ حیات

احرام باندھنے کے بعد جب حاجی سرزمین مکہ پر قدم رکھتا ہے تو اس کا پہلا اقدام ہوتا ہے طواف خانۂ کعبہ اور مناسک حج کی ادائیگی۔ اس کے بعد جب دیار الٰہی سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے آخری عمل کا نام ہوتا ہے طواف وداع۔

اس درمیان میں وقتاً فوقتاً اسی طواف کا عمل انجام دیتا ہے۔ کبھی طواف حج کے نام سے اور کبھی طواف نساء کے نام سے۔ اور پھر مستحبات کے اعتبار سے دوران قیام مکہ ۳۶۰ طواف مستحب ہیں اور اس قدر ممکن نہ ہوں تو کم سے کم ۳۶۰ شوط یعنی ۵۲ طواف کرے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طواف خانۂ کعبہ پر اس قدر زور کیوں ہے اور مسجد الحرام کو یہ امتیاز کیوں دیا گیا ہے کہ ہر مسجد میں داخلے کے وقت دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور مسجد الحرام میں داخلے کے وقت طواف ہی کو نماز کا نام اور درجہ دے دیا جاتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ عمل مسلمان کی ذہنی تربیت کا بہترین مرقع اور عظیم ترین عمل ہے جہاں انسان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ زندگانی دنیا ایک مسلسل سفر اور گردش ہے۔ اس میں ٹھہراؤ موت اور فنا کی نشانی ہے۔ اس کی کیفیت ہی گردش ہے جسے پائی جاتی ہے کہ اس کی ساخت ہی گردی شکل کی ہے اور کرہ کے گرد انسان کتنا ہی خط مستقیم پر چلنے کی کوشش کرے

در حقیقت اس کا سفر ایک گردش ہی ہے۔ خط مستقیم پر سیر نہیں ہے اور جب ساری زندگی گردش ہی کا نام ہے تو گردش کے لئے ایک محور و مرکز کا ہونا ضروری ہے۔

خط مستقیم پر سفر اور دائرے کے گرد گردش کرنے کا بنیادی فرق یہی ہے کہ خط مستقیم میں نقطۂ ابتدا نقطۂ انتہا سے الگ ہوتا ہے، اور انسان ایک جگہ سے حرکت کرکے دوسری جگہ کا قصد کرتا ہے۔ لیکن دائرہ کی شکل اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے یہاں نقطۂ آغاز و انجام ایک ہوتا ہے اور اس اعتبار سے سیر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں سیر کی کل اہمیت اس محور سے وابستہ ہے جس کے گرد گردش کی جاتی ہے کہ جب تک محور سلامت ہے اور گردش اس کے گرد ہے سیر صحیح اور نتیجہ خیز ہے اور جب سیر اپنے محور سے ہٹ جائے گی تو اپنے صحیح معنی کے ساتھ تباہی خیز بھی ہو جائے گی۔

حج بیت اللہ مسلمان کو یہی سبق دینا چاہتا ہے کہ تیرا محور حیات خانۂ خدا ہے جب تک تیری گردش کا مرکز یہی محور رہے گا تیری ہستی محفوظ رہے گی اور حرکت نتیجہ خیز ہوگی اور جب یہ محور ہاتھ سے نکل جائے گا تو تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

۱۸۔ سعی، جستجوئے آب حیات

حج بیت اللہ کے اعمال میں ایک عمل صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا بھی ہے۔

یہ سعی اس موقع کی یادگار ہے جب جناب ہاجرہ اپنے فرزند اسماعیل کے لئے پانی تلاش کر رہی تھیں اور شدت اضطراب کے عالم میں کبھی اس پہاڑی پر جاتی تھیں اور کبھی اس پہاڑی کی طرف تلاش کرتی تھیں، آگے نکل جاتی تھیں اور کبھی پلٹ کر اپنے فرزند کی زندگی کا جائزہ لیتی تھیں۔ مالک کو یہ جدوجہد کی یاد اس قدر پسند آئی کہ اس نے ابد تک کے لئے اس عمل کو حج میں شامل کر دیا اور قیامت تک کے لئے صرف عورتوں کا نہیں بلکہ مردوں کا بھی فریضہ بنا دیا اور اس کا راز یہ تھا کہ یہ صرف ایک بچے کے لئے پانی کی تلاش نہیں تھی بلکہ ایک ہی فرد کی زندگی کے تحفظ کا انتظام تھا۔ اور پھر یہ تلاش بھی درحقیقت پانی کی تلاش نہیں تھی بلکہ آب حیات کی تلاش تھی اس لئے کہ اس وقت اسماعیل صرف پیاسے نہیں تھے بلکہ ان کی زندگی خطرہ میں تھی اور وہ موت و حیات کی کشمکش سے

گزر رہے تھے اور قدرت کا یہ اصول ہے کہ وہ ایسے کسی عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے اعمال کی بارہ سے حوصلوں کو قوت ملتی ہے اور قربانی کے جذبات کو ترویج حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح کہ اس نے لاکھوں مخالفتوں کے باوجود صفحات تاریخ سے حضرت ابوطالبؑ کے احسان کو محو نہیں ہونے دیا اور ان کے کفر کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بھی ان کے خدمات کا انکار نہیں کر سکے ہیں اور برابر اس امر کا اعتراف کر رہے ہیں کہ ابوطالبؑ نے سرکار دو عالمؐ کی زندگی کا اس وقت تحفظ کیا ہے جب عالم اسلام میں صحابیت کا تصور بھی نہیں پیدا ہوا تھا اور سرکار دو عالمؐ نے رسالت کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔

حضرت ابوطالبؑ نے سرکار دو عالمؐ کے عقد میں خطبہ پڑھ دیا تو وہ عہد مستقبل اسلام میں شامل ہو گئے اور ابوطالبؑ نے سرکار کو تجارت کے راستہ پر لگا دیا تو تاجر "حبیب اللہ" کے لقب کا حقدار ہو گیا اور پروردگار نے رزق کے ذخیرے اسی تجارت میں رکھ دیئے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ عالم اسلام کی کل دولت کا حساب کر لیا جائے تو سرکار دو عالمؐ نے مال خدیجہ سے تجارت کر کے امت اسلامیہ کے لئے جو رزق فراہم کیا تھا وہ تمام امت کے اموال کے مجموعے سے بھی زیادہ تھا۔

حج بیت اللہ بھی مسافروں کو یہ دعوت دے رہا ہے کہ اس منزل پر قدم رکھو تو اس تصور کے ساتھ آؤ کہ گویا خضر آب حیات کی تلاش میں نکلے ہیں یا ہاجرہ ایک ذمہ دار مذہب کی زندگی کے وسائل تلاش کر رہی ہیں۔ اگر تمہیں بھی مذہب کی زندگی کے اسباب کا تصور پیدا ہو اس راہ میں اپنی تمام امکانی کوشش صرف کر دو چاہے پہاڑوں اور وادیوں کا چکر ہی کیوں لگانا پڑے اور پھر دیکھو کہ قدرت کس آب حیات سے نواز کر تمہیں بقائے دوام عطا کر دیتی ہے۔

۱۹۔ حج۔ وسیلۂ استجابت دعا

حج بیت اللہ انسان کو خلوص عمل کی دعوت دینے کے ساتھ یہ اعتبار بھی دلاتا ہے کہ پروردگار کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ اور ارکان حج کے دوران کی گئی دعا کو ضرور قبول کر لیتا ہے۔

ارکان حج کے دوران اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں لیکن سب سے عظیم مثال صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ہے جہاں بظاہر ہاجرہ دوڑ رہی تھیں اور ان کے لب پر کوئی دعا نہ تھی۔ لیکن حقیقتاً ان کا وجود سراپا التماس بنا ہوا تھا اور ان کا ہر قدم ایک حرف دعا کی حیثیت رکھتا تھا جس کا مدعا صرف یہ تھا کہ چند قطرے پانی کے دستیاب ہو جائیں تاکہ ننھے بچے کی زندگی کا تحفظ کر لیں۔ لیکن قدرت نے اس غیر لفظی دعا کو اس انداز سے قبول کیا کہ ایک پورا چشمہ جاری کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور کروڑوں انسانوں کے سیراب ہونے کے بعد بھی تمام نہیں ہو رہا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی مختصر سی طلب کا اتنا مفصل جواب کیا معنی رکھتا ہے اور قدرت نے کیوں نہ آسمان سے اس قدر پانی نازل کر دیا کہ اسماعیلؑ کی زندگی کا انتظام ہو جاتا اور ہاجرہ کا قلب مطمئن ہو جاتا۔ آخر اس طرح کے سیل رواں کی کیا ضرورت تھی جس کے طلب کرنے والے ہی کو "زم۔ زم" کہنا پڑے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ دعائے ہاجرہ کا ایک معنوی پہلو بھی تھا کہ وہ صرف اسماعیلؑ کی زندگی کی خواہش مند نہیں تھیں بلکہ ایک پوری قوم کی زندگی کی طلبگار تھیں، وہ یہی خود کی زندگی ایک قوم کی زندگی ہوتی ہے جناب ہاجرہ اس نکتہ کی طرف متوجہ تھیں کہ اگر اسماعیلؑ بچ گئے تو زمین حرم کو آباد رکھنے والا مل جائے گا اور یہاں ایک قوم آباد ہو سکے گی اور اس طرح ایک پوری نسل وجود میں آ گئی۔ پروردگار عالم نے اس نسل کی ابتدا سے پہلے اس کے آب حیات کا انتظام کر دیا اور پھر یہی زمین حرم کی آبادی کی بنیاد بن گئی۔

۲۰۔ حج۔ دعوت استغفار

یوں تو میدان عرفات کے واجبات میں فقط وہاں کا وقوف اور قیام شامل ہے اور اس کے علاوہ کوئی فریضہ نہیں ہے۔ لیکن روایات میں اس مقام پر بڑی شدت سے استغفار کی بیحد تاکید کی گئی ہے بعض روایات میں یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے گناہ شب قدر میں معاف نہ ہوں تو اس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ میدان عرفات میں جا کر استغفار کرے تاکہ پروردگار اس کے

گناہوں کو معاف کرے۔

اس کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب پروردگار نے جناب آدمؑ کو کوہ صفا پر اور جناب حواؑ کو کوہ مروہ پر اتار دیا تو دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں نکل پڑے بزرگ اور کی بنا پر دونوں کا دل شرمندہ تھا اور دونوں بارگاہ احدیت میں سراپا استغفار بنے ہوئے تھے کہاں وہ جنت کی پُر بہار زندگی اور کہاں کوہ صفا و مروہ کی سنگلاخ سرزمین۔

اس استغفار کا نتیجہ یہ ہوا کہ میدان عرفات میں دونوں کی ملاقات ہو گئی اور اسی باہمی تعارف کی بنا پر اس کا نام میدان عرفات ہو گیا اور پھر دونوں نے چند قدم آگے بڑھ کر میدان مزدلفہ میں رات گزاری اور اسی بنیاد پر اسے مزدلفہ اور جمع کہا جانے لگا۔ اس کے بعد صبح سویرے اس خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہو گئے جس کی بنیاد ان کے دور میں پڑ چکی تھی اگرچہ اس کی دیواروں کے بلند کرنے کا کام جناب ابراہیمؑ اور جناب اسماعیلؑ نے انجام دیا ہے۔

میدان عرفات زہد و استغفار کا بہترین مقام ہے اور عرفات میں قیام حج کا عظیم ترین رکن ہے یہاں تک کہ بعض روایات میں "الحج عرفة" جیسا مضمون بھی وارد ہوا ہے کہ اگر انسان کو میدان عرفات میں وقوف حاصل ہو گیا تو گویا اس نے پورا حج حاصل کر لیا چاہے اس کے بعد موت ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔

ان دونوں حقائق کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حج بیت اللہ ابتدا سے آخر تک انسان کو توبہ و استغفار کی دعوت دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ بندہ پروردگار کی درگاہ سے واپس جائے تو ویسا ہی پاک و پاکیزہ بن کر جائے جیسے کہ پہلی مرتبہ ماں کی آغوش سے اس دنیا میں آیا تھا۔

امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کی دعائے عرفہ اس مسئلہ کی بہترین رہنما ہے جس میں توبہ و استغفار کے وہ انداز تعلیم کئے گئے ہیں جن کا ادراک غیر معصومین کے بس کا نہیں ہے۔

اور یہ انداز وہی اختیار کر سکتے ہیں جو بارگاہ احدیت کے آداب سے واقف ہوں اور وہاں سے آداب کی تعلیم حاصل کر کے آئے ہوں۔

۲۱۔ حج۔ حل مشکلات اقتصاد

پروردگار عالم نے جس دن اسماعیلؑ اور ہاجرہ کو ارض حرم پر قیام کرنے کا حکم دیا اور جناب ابراہیمؑ نے دونوں کو لا کر بیابان میں چھوڑ دیا اس وقت ابراہیمؑ نے صورت حال کی ترجمانی ان الفاظ میں کی تھی کہ "خدایا میں نے اپنی ذریت کو ایک وادی غیر ذی زرع میں تیرے گھر کے زیر سایہ یعنی تیرے سہارے چھوڑ دیا ہے اب یہ تیری ذمہ داری ہے کہ ان کی غذا کا انتظام کرے اور معنوی اقتدار سے لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے۔"

پروردگار خلیل کی دعا کو رد نہیں کر سکتا تھا اس نے ان دونوں کی زندگی کا تحفظ تو کر لیا لیکن ایک بنیادی مسئلہ باقی رہ گیا کہ اس علاقہ کی آبادکاری کا ذریعہ کیا ہوگا اور یہاں آباد ہونے والوں کا ذریعہ معاش کیا ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ابراہیمؑ کو حج کی آواز لگانے کا حکم دے دیا اور دنیائے عالم سے بیت کو اس ایک نقطہ پر جمع کر دیا۔

اس طرح اس علاقہ کی اجتماعی حیثیت تو ظاہر ہو گئی لیکن اقتصادی مسئلہ پھر باقی رہ گیا۔ اور اس نے عنوان وار کان حج میں قربانی کو شامل کر دیا کہ دنیا کا ایک آسان ترین ذریعہ معاش ہے کہ اس صحراؤں میں جانور چرتے رہیں اور حج کے موقع پر ان جانوروں کو فروخت کر کے سال بھر کی غذا کا انتظام کر لیں اور پھر یہ شکایت نہ رہے کہ وادی غیر ذی زرع میں آمدنی کا ذریعہ کیا ہوگا در حقیقت امر یہ ہے کہ اس قربانی سے فقط اہل مکہ کے اقتصادیات کا علاج نہیں ہوتا بلکہ آج دنیا کے بے شمار افراد ہیں جن کی معیشت فقط حج کی قربانی کے دم پر چل رہی ہے اور ایک ایک انسان کے سال بھر کے اخراجات کا انتظام ہو جاتا ہے۔ پروردگار نے سچ فرمایا ہے کہ یہ گھر بابرکت اور عالمین کے لئے ہدایت ہے۔

۲۲۔ حج۔ امتحان نفسیات

انسان کی خوبیوں یا کمزوریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسے اپنے جسم کی آرائش اور زیبائش سے بے حد دلچسپی ہوتی ہے۔ جمالیاتی احساس انسانی زندگی کا عظیم ترین ذخیرہ ہے۔ انسان

جمالیاتی احساس سے محروم ہو جائے اور اس کا شمار جمادات و نباتات یا حیوانات میں ہونے لگے گا اور وہ انسانیت سے خارج ہو جائے گا۔

دین اسلام نے جمال کو محبوب ترین شے قرار دیا ہے اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے۔

اسلام کا سارا انقلاب مظاہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے یک مشت سارے الفاظ ایجاد نہیں کئے ہیں بلکہ ایک انقلابی تحریک کی طرح الفاظ کے معانی تبدیل کئے ہیں اور ہر قالب کو ایک نئی روح عنایت کر دی ہے۔

اس کی نظر میں لفظ جمال بھی ایسا ہی لفظ ہے جو لغت عرب میں موجود تھا اور مسلسل استعمال ہو رہا تھا لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کے پاس جمال کا ایک اعلیٰ ترین مفہوم تھا جو پروردگار پر بھی منطبق ہو سکتا تھا، اور اس نے اسی مفہوم کو محبوب قرار دیا ہے کہ جس طرح پروردگار خود صاحب جمال ہے ویسے ہی اپنے بندوں کو بھی صاحب حسن و جمال دیکھنا چاہتا ہے ورنہ اس کی نظر میں صرف مادی جمال محبوب ہوتا تو یہ کام بندوں کے حوالے نہ کرتا بلکہ خود ہی حسین و جمیل افراد پیدا کر دیتا اور غیر جمیل افراد کو دنیا میں آنے ہی نہ دیتا۔

اس نے مختلف النوع افراد کو پیدا کرنے کے بعد بھی یہی اعلان کیا ہے کہ مجھے جمال پسند ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ جمال کی دو قسمیں ہیں:

ایک فطری جمال ہے جو پروردگار کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس جمال کے اعتبار سے ہر شے کو جمیل ہی بناتا ہے۔

اور ایک اختیاری جمال ہے جو انسان کے ہاتھوں میں ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کا امتحان لیا جاتا ہے کہ کون اس جمال کا لحاظ رکھتا ہے اور کون اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس نے تخلیق موت و حیات کا سبب بھی اسی حسن کو قرار دیا ہے کہ وہ حسن عمل کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔

اختیاری جمال کی دو قسمیں ہیں۔ مادی اور معنوی۔

مادی جمال کا مطلب یہ ہے کہ انسان جسم و لباس کی زیبائش کا ایسا اہتمام کرے کہ اس کی شخصیت جاذب نظر ہو جائے اور قابل نفرت نہ ہو۔

اسلام نے قدم قدم پر زینت کرنے کا حکم دیا ہے، اور نماز میں بھی زینت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے تاکہ مسلمان میں احساس جمال پیدا ہو اور وہ اپنی شخصیت کو قابل توجہ بنائے۔ اس نے لباس پر زور نہیں دیا ہے لیکن پاکیزہ لباس پر بہرحال زور دیا ہے اور خوشبو کو دنیا کی محبوب ترین شے قرار دیا ہے۔

معنوی جمال کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا ظاہر آراستہ و پیراستہ ہے اسی طرح اس کا باطن بھی طیب و طاہر اور حسین و جمیل ہو جسے قرآن کی زبان میں حسن عمل یا احسن عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں جمال ہم آہنگ نہ ہوں گے، انسانی زندگی مکمل طور پر حسین، خوشگوار اور قابل رشک نہ ہوگی۔ لیکن اگر کسی مقام پر دونوں کی ہم آہنگی ممکن نہ ہو اور کسی وجہ سے دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے یا مقام امتحان و آزمائش آ جائے تو انسان کو معنوی جمال کو مادی جمال پر مقدم کرنا پڑے گا اور معنویت کی خاطر تمام مادیات کو قربان کرنا پڑے گا۔

شریعت اسلام میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں جن میں سے صرف دو کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اسلام ہر مقام پر آرائش اور خوشبو کو بے پناہ اہمیت دیتا ہے لیکن جب انسان احرام میں قدم رکھتا ہے تو اس سے بہترین خوشنما لباس کو اتروا کر ایک لنگی اور چادر میں محبوس کر دیتا ہے تاکہ اس میں یہ احساس پیدا ہو کہ ساری آرائش اور زیبائش صرف لباس اور خوشبو سے نہیں ہے بلکہ اطاعت پروردگار ایک ایسی زینت ہے جس سے بالاتر کوئی زینت نہیں ہے اور انسان جب طاعت کا مجسمہ بن کر مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے تو اب اسے کسی قسم کی آرائش کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اسلام نے مسلمان مردہ کو وہی حیثیت دی ہے جو زندہ کو حاصل ہے۔ اس کی نظر میں مومن کا احترام موت و حیات دونوں میں ایک جیسا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مردہ کی تجہیز و تکفین و تدفین کو زندہ انسان کے جلوس احترام سے کم اہمیت نہیں دی ہے اور مردہ کو زندوں کے کاندھوں پر سر منزل مقصود تک پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ کفن کے واسطے بھی نئے کپڑے کا مطالبہ کیا ہے اور اس کے پہنانے سے پہلے غسل کا تقاضا کیا ہے۔

اور پھر حسن کے ساتھ سے کا اور کی خوشبو سے معطر بنایا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود
گر میاں جو دین شہید ہو گیا ہے تو غسل و کفن دونوں کو ساقط کر دیا ہے اور اسی خون میں
سانے کا غسل قرار دے کر خون بھرے لباس میں کفن دے دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ
اسلام انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ راہ خدا میں بہنے والا خون آب سدر و کافور سے کہیں
زیادہ پاکیزہ ہے اور خون شہادت سے رنگین لباس نئے اور صاف کفن سے کہیں زیادہ خوبصورت
اور آراستہ دکھائی دیتا ہے تاکہ نسل مسلم میں جمعیت کا نیا شعور پیدا ہو اور وہ راہ خدا میں
ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو سکے۔

حج بیت اللہ کے موقع پر سر منڈوانے کا حکم بھی انسان کے اس شعور جمالیات کا امتحان
ہے کہ انسان ظاہری جمال کے مقابلہ میں معنوی جمال کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی نگاہ میں جسم کے وجود کا اہم ترین عنصر اس کے سر کے بال
ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں جمالیات کا ۵۰ فیصد انحصار بالوں پر کیا جاتا ہے اور ساری
آرائش کا تعلق انہیں بالوں سے ہوتا ہے۔

چہرہ کا میک اپ عارضی ہوتا ہے اور لمحات میں مٹ جاتا ہے لیکن بالوں کا حسن دیر تک
باقی رہتا ہے۔ میک اپ سے حاصل ہونے والے حسن کو پہچان لیا جاتا ہے لیکن بالوں کا حسن
ایک طرح کی فطری حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور اسی بنا پر جن لوگوں کے سر پر بال نہیں ہوتے
ہیں وہ اپنی شخصیت میں ایک طرح کی کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ جب کہ شخصیت کا بالوں سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔

حج بیت اللہ کے موقع پر بیشمار افراد ایسے ملتے ہیں جو سر کے بالوں کے منڈانے سے گریز
کرنا چاہتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح ان
کا حسن و جمال ختم ہو جائے گا اور وہ سماج کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں گے۔ تو کیا پروردگار
اپنے مہمانوں کی یہی ضیافت کرنا چاہتا ہے کہ ان کی بارگاہ سے نکلیں تو سماج میں کسی کو منہ دکھانے
کے قابل نہ رہ جائیں، اور سارا حسن و جمال چھین کر انہیں ان کے وطن واپس کر دیا جائے۔
ہرگز نہیں۔

ارحم الراحمین پروردگار اور اکرم الاکرمین میزبان کے بارے میں اس طرح کا تصور بھی
نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ پھر تو اس عمل کا فلسفہ کیا ہے اور اسلام حج بیت اللہ کرنے والے
کو اس شکل میں کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ بھی مادیت اور معنویات کے ٹکراؤ میں معنویات کو مقدم
کرنے کی ایک قسم ہے اور اس کے ذریعہ پروردگار انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ اولاً
تو حسن و جمال کا واقعی معیار یہی ہے کہ شخصیت محبوب کی نظر میں قابل توجہ بن جائے۔ تو اگر
بندہ مومن سچے اور محبوب حقیقی قرار دیتا ہے تو جو شکل اسے پسند ہو گی وہی اختیار کرنا پڑے گی۔
اس کے نظریات اور اہل دنیا کی مرضی کو نگاہ میں رکھنے کے بعد محبت الٰہی کا دعویٰ ایک فریب نفس
کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ حسن جمالیات کی آزمائش کا بہترین موقع ہے جہاں سارا
امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ وہ حسن ظاہری کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا حسن طاعت اور حسن عمل
کو۔ یہی امتحان وہ ہے جہاں بشریت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور صاحبان ایمان کی
پہچان نفسانی دنیا سے الگ ہو جاتی ہے۔

حلق کے موقع کو قربانی کے بعد رکھنے کا بھی غالباً فلسفہ یہی ہے کہ پہلے مرحلہ پر جمالیات
قربانی ہوتی ہے اور دوسرے مرحلہ پر جمالیات کی قربانی دی جاتی ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود
دیا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کا گلا کاٹنے میں کس قدر فرحت محسوس کرتا ہے اور اپنے بال
کٹوانے میں کس قدر تکلیف و ملال محسوس کرتا ہے۔ یہ تصور درحقیقت ایمان کی کمزوری کی علامت
ہے اور اس طرح انسان کو محسوس کرا دیا جاتا ہے کہ وہ صرف لباس احرام پہن لینے سے بندہ مخلص
نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے جذبات احساسات، میلانات اور خواہشات ہر طرح کی قربانی درکار
ہوتی ہے اور اس کے بغیر انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا ہے۔

۲۲۔ حج۔ تعظیم شعائر اللہ

دنیا کی ہر عظیم شخصیت کے ساتھ کچھ چیزیں اس طرح وابستہ ہو جاتی ہیں کہ انہیں شخصیت کا

علامت تصور کر لیا جاتا ہے اور اس طرح وہ شے شخصیت کے طفیل ہی قابلِ احترام و [illegible] بن جاتی ہے۔ مذہب میں بھی ایسی چیزوں کا ایک سلسلہ ہے جنھیں شعائر اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں پروردگار نے اپنی ذات کے ساتھ اس طرح وابستہ کر لیا ہے اور انھیں اس کی عظمت و جلالت کی علامت بننے کا شرف حاصل ہو گیا ہے اور اس طرح ان کا احترام ضروری اور تقویٰ الٰہی کی نشانی بن گیا ہے۔

انبیاء و مرسلین، اولیاء و صالحین کی یہی حیثیت ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی حیثیت کو ذاتِ احدیت میں اس طرح فنا کر دیا ہے کہ اب ان کا کوئی مستقل وجود نہیں رہ گیا ہے۔ ان کا چہرہ وجہ اللہ بن گیا ہے اور ان کا پہلو جنب اللہ۔ ان کی زبان لسان اللہ ہو اور ان کے ہاتھ ید اللہ۔ حد یہ ہے کہ ان کا نفس بھی نفس اللہ کہے جانے کے قابل ہو گیا ہے اور اس طرح ان کی شخصیت مستقل شعائر الٰہی کی ہو گئی ہے اور ان کا احترام ہر اہلِ ایمان پر لازم ہو گیا ہے۔

عام انسانی دنیا میں بھی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں شعائر اللہ بننے کا شرف حاصل ہے جس طرح خانہ کعبہ یا قرآن مقدس۔ لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا شعائر اللہ ہونا واضح نہیں تھا پروردگار نے انھیں خود شعائر اللہ کا نام دے دیا ہے تاکہ انسان ان کی اور عظمت کی طرف متوجہ ہو جائے اور انھیں اسی طرح محترم قرار دے جس طرح دیگر شعائر کو قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔

انھیں چیزوں میں قربانی کا جانور اور صفا و مروہ کی پہاڑیاں بھی شامل ہیں کہ شعائر اللہ کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کے احترام کو علامت تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حج بیت اللہ سے بہتر تعظیم شعائر کا کوئی موقع و مظہر نہیں ہے۔ حج کے موقع پر سیرت انبیاء و اولیاء و صالحین پر بھی عمل ہوتا ہے اور کعبہ محترم کا بھی طواف کیا جاتا ہے۔ اس کے اعمال و ارکان میں صفا و مروہ کی سعی بھی ہے اور قربانی کے جانور کا ذبیحہ بھی اور اس طرح تعظیم شعائر اللہ کے چاروں مظاہر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، اور انسان تقویٰ کی اس بلند ترین منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں

کامل ہو جاتے ہیں، اور آخرت میں جنت قریب تر بنا دی جاتی ہے۔

صفا و مروہ اور مشعر قربانی کے شعائر اللہ میں شامل ہونے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تعظیم کا مفہوم وہ مفہوم نہیں ہے جو عرفِ عام میں خیال کیا جاتا ہے۔ ورنہ صفا اور مروہ اور [illegible] کو بوسہ دینا اور آنکھوں سے لگانا واجب ہوتا اور اس کی قربانی تعظیم شعائر اللہ کے خلاف ہوتی۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا ہی تعظیم شعائر اللہ ہے اور شعائر قربانی کو ذبح کر دینا ہی شعائر اللہ کی تعظیم کا نمونہ و مرقع ہے۔

اور اس طرح اسلام نے یہ واضح کر دیا ہے کہ جس طرح اس نے تمام الفاظ کو ایک نئے مفہوم سے آشنا بنایا ہے اسی طرح اس کے یہاں "تعظیم" کا بھی اپنا ایک مفہوم ہے اور وہ اسی نظام کی روشنی میں اعمال کی تعیین کرتا ہے اور انسان سے اعمال کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس نظام میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں ہے، ورنہ کوئی اپنے خود ساختہ فردی یا اجتماعی نظام کو اس کے اوپر مسلط کر سکتا ہے۔

۲۲۔ حج تربیتِ طویل المدت

یوں تو دین اسلام ایک مکمل نظام تربیت ہے۔ جس کا بنانے والا رب العالمین ہے جیسا کہ قرآن کی شان "تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ" ہے جس کے ذریعہ تمام انسانیت [illegible] مادی، معنوی، اور روحانی ہر طرح کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔

اس کے تمام اعمال و عبادات میں واجبات و محرمات کا سلسلہ ایک نظام تربیت ہی کا ہے جس میں واجبات کے ذریعہ اعمال کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور محرمات کے ذریعہ [illegible] عائد کی گئی ہے۔ لیکن عام طور سے یہ نظام دیگر عبادات میں مختصر ہوتا ہے۔

نماز کے دوران یہ کام صرف چند منٹ کا ہوتا ہے۔ روزہ میں چند گھنٹے پابند کیے جاتے ہیں اس کا سلسلہ اگرچہ ایک ماہ تک جاری رہتا ہے لیکن اس کی پابندیاں محدود ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب جنسی خواہش کا وقت آتا ہے تو رات آتے ہی جنسی تعلقات آزاد ہو جاتے ہیں۔ جب شام تک بھوک [illegible] اپنے شباب کو پہنچ جاتی ہے تو مغرب کی

اور ان کے ساتھ بری گفتگو سے پیچھے [illegible] کر دیا جاتا ہے ... اور پھر یا بعد کی بھی صرف چند چیزوں کی ہوتی ہے، شکار کرنا حرام ہے ورنہ عورت کو بوسہ دینا یا اس پر نظر کرنا حرام ہے۔

نکاح کرنا حرام ہے، ورنہ نکاح میں شرکت کرنا حرام ہے۔

خوشبو کا استعمال کرنا حرام ہے، ورنہ سرمہ کا لگانا حرام ہے۔

زینت کرنا حرام ہے اور موزے پہننا حرام ہے۔

سایہ میں چلنا حرام ہے، ورنہ سلے ہوئے کپڑے کا پہننا حرام ہے۔

جھوٹ و مباشرت حرام ہے اور قسم کھانا حرام ہے۔

بالوں کا کاٹنا حرام ہے اور سر ڈھانکنا حرام ہے۔

خون نکالنا حرام ہے اور دانت اکھاڑنا حرام ہے۔

ناخن کا کاٹنا حرام ہے، ورنہ اسلحہ اٹھانا حرام ہے۔

لیکن حج بیت اللہ کے موقع پر یہ تمام امور حرام ہیں اور ان کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے نظام تربیت میں جو حیثیت حج بیت اللہ کی ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ دور حاضر میں کیمپ لگا کر تربیت کرنے کا جو [illegible] سیکڑوں سال کے اجتماعی تجربات کے بعد دریافت ہوا ہے اسے حج بیت اللہ نے چودہ [illegible] پہلے متعارف کرا دیا تھا اور اس طرح صرف ایک مدرسہ یا کالج کے طلاب ـــ [illegible] ممالک کے افراد ـــ یا ایک صنف کے [illegible] نہیں بلکہ تمام مکاتب فکر تمام [illegible] سن و سال کے افراد کو ایک موضوع پر جمع کر کے وہ روحانی اور معنوی فضا فراہم کر دی کہ انسان تمام دنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہو کر جلوۂ ربوبیت میں گم ہو جائے اور اس کے اندر وہ احساس پیدا ہو جائے جو زندگی کے کسی دوسرے ماحول میں نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

۲۵۔ حج۔ احترام ارض حرم

حج بیت اللہ کے محرمات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بعض محرمات کا سلسلہ احرام کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ اور بعض محرمات کا تعلق ارض حرم سے ہوتا ہے جن کا سلسلہ حرم کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ احرام انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس میں اس شعور کو مکمل طور پر بیدار کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ارض حرم پر شکار کرنا حالت احرام میں بھی حرام ہے اور بعد احرام بھی جائز نہیں ہے۔ اس [illegible] علاقہ کو [illegible] امن قرار دیا ہے [illegible] جہاں انسانوں کی طرح جانور بھی محفوظ رکھے گئے ہیں بلکہ ارض حرم پر اگنے والے درختوں کا کاٹنا یا اکھاڑنا بھی جائز نہیں ہے کہ انہیں بھی ایک طرح کا تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ البتہ اگر درخت آدمی نے خود لگایا ہے یا درخت پھل وغیرہ کا ہے یا کسی کے گھر کے اندر نکل آیا ہے تو اس کا کاٹنا مالک کے واسطے جائز ہے کہ وہ ارض حرم کی پیداوار نہیں ہے ورنہ جب تک ارض حرم کی پیداوار رہے گا اسے ہاتھ لگانا اور اس کا اکھاڑنا یا کاٹنا جائز نہیں ہوگا۔

ارض حرم کی تیسری حرمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حرم سے باہر جرم کر کے حرم کے حدود میں داخل ہو جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اس سے قصاص لیا جا سکتا ہے جب تک ارض حرم سے باہر نکل جائے۔ زیادہ سے زیادہ [illegible] یہ ہے کہ اس کا دانہ پانی بند کر دیا جائے تا کہ وہ باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے اور [illegible] حرم کے اندر رہتے ہوئے اس پر حد جاری کر دی جائے یا اسے بطور قصاص قتل کر دیا جائے یہ [illegible] ہے۔

بعض علماء اعلام نے حدود حرم کے اندر پڑے ہوئے مال کے اٹھانے کو بھی حرام قرار دیا ہے لیکن [illegible] بعض حضرات کے نزدیک صرف کراہت ہے حرمت نہیں ہے۔

[illegible] ارض حرم اپنے تقدس کی بنا پر مختلف خصوصیات کی حامل ہے جن سے دنیا کے ہر مسلمان کا واقف ہونا [illegible] مسلمان حج بیت اللہ کے لئے اس سرزمین حرم پر قدم رکھتا ہے [illegible] کا سامنا ہوتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سرزمین کی حرمت دنیا کی تمام زمینوں [illegible] اور اسی طرح حج کے زمانہ میں احترام ارض حرم بھی شامل ہو جاتا ہے [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے کہ [illegible] حج مستحب کو چھوڑ [illegible] لیکن [illegible] نہیں کیا [illegible] کہ تمام عالم اسلام کو اس [illegible]

خمس

اسلامی فرائض میں ایک بہترین فریضہ ہے خمس ـــ جو مالیات اور معاشیات کی دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ اور دوسرا عام غرباء ہے لیکن اس کا نظم ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور جس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے وہ اپنی صوابدید کے مطابق مال زکوٰۃ کو راہ خیر میں صرف کر سکتا ہے اور اس کا سرکاری آمدنی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن خمس درحقیقت ایک سرکاری آمدنی ہے جس کا نصف حصہ اسلامی سرکار یعنی نبی یا امام کو دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ اپنے منصبی فرائض کو انجام دیتے ہیں اور حکومت کے بجٹ کا بندوبست کر کے تبلیغ اسلام کا نظام ترتیب دیتے ہیں۔

خمس اسلام کا وہ مظلوم فریضہ ہے جو خدا اور رسولؐ اور امامؑ کے ساتھ خدا اور رسولؐ کا حق ہونے کی بنا پر خود اولاد رسولؐ کی طرح زمانہ کے مظالم سے محفوظ نہ رہ سکا، اور ایک بڑے طبقہ نے اس کی عظمت و اہمیت اور اس کے وجوب سے انکار کر دیا اور اسے صرف میدان جنگ کے مال غنیمت سے مخصوص کر دیا۔ جب کہ سرکاری آمدنی ہونے کے اعتبار سے اس کا فائدہ ہر اس شخص کو ہو سکتا تھا جو خود ساختہ طور پر سرکار اور اسلامی حاکم بننے کا دعویدار ہو جائے ـــ لیکن غدر اور مکر سے توقف کیا کہ آل رسولؐ کی دشمنی میں ظالموں نے اپنے فائدہ کو بھی نظر انداز کر دیا اور انہیں صرف اس بات کا خیال رہا کہ چاہے ہمارا نقصان ہو جائے لیکن آل رسولؐ کی زندگی کا کوئی سہارا نہ رہنے پائے اور اس کا راز بھی یہ تھا کہ حکومت کو اپنے دیگر ذرائع پر اطمینان تھا کہ غصب کردہ مال پر سرکاری قبضہ اور اموال کے توسط سے کام پر سرکار کا بجٹ پورا کر لیا جائے گا اور اسے خمس کی کوئی ضرورت نہ ہوگی

اہلبیت اور آل رسولؐ کے پاس حق الٰہی کے علاوہ کوئی طاقت و وسیلہ نہیں ہے لہذا اگر انہیں الٰہی حق سے محروم کر دیا جائے گا تو ان کے گھروں میں خود بخود فاقے ہونے لگیں گے، اور ان کی معاشی حالت خراب ہو جائے گی جس کے بعد دعوت ذوالعشیرہ سے کھانے پینے کی عادی امت ان کے گرد جمع نہ ہو سکے گی اور یہ کسی طرح انقلاب و اقتدار قائم نہ کر سکیں گے۔

خمس کو پروردگار نے بے شمار خصوصیات عنایت فرمائے ہیں جن میں سے بعض خصوصیات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ خمس، تفسیر فلسفہ مالیات

قرآن مجید نے کسی فریضہ کے بیان میں وہ لہجہ نہیں اختیار کیا ہے جو خمس کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے "وَاعْلَمُوا" جان لو، یاد رکھو اور ہوشیار ہو جاؤ۔

یہ کلمہ قرآن مجید میں ۲۰ مقامات پر استعمال ہوا ہے اور مسئلہ خمس کے علاوہ کسی مقام پر بھی فروع دین یا کسی فریضہ کے بارے میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ ہمیشہ عقائد کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

یاد رکھو کہ خدا متقین کے ساتھ ہے۔

خدا شدید العقاب ہے۔

تم اس کی بارگاہ میں حاضر کیے جاؤ گے۔

وہ عزیز و حکیم ہے۔

وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

وہ ہر عمل کا دیکھنے والا ہے۔

وہ دلوں کے راز جاننے والا ہے۔

وہ غفور و حلیم ہے۔

وہ سمیع و علیم ہے۔

وہ غنی و حمید ہے۔

وہ غفور و رحیم ہے۔

وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

وہ تمہارا مولا ہے۔

تم اسے عاجز نہیں کر سکتے ہو۔

جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اس کے علم کے مطابق ہے۔

وہ مردہ زمین کو زندہ کرنے والا ہے۔

تمہارے درمیان رسول خدا موجود ہے۔

رسول کی ذمہ داری صرف واضح طور پر ابلاغ ہے۔

زندگانی دنیا لہو و لعب و زینت و تفاخر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے وجہ آزمائش ہے اور خدا کے پاس اجر عظیم موجود ہے۔

آیات بالا سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس لہجہ کو عقائد کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور اصولی طور پر بھی علم کا خطاب عقائد ہی کے بارے میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود خمس کے فرعی حکم اور شرعی فریضہ کے بارے میں بھی یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہے جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس اعلان میں فرعی مسئلہ کے ساتھ ایک عقائدی مسئلہ کا بھی اعلان کیا گیا ہے — اور قدرت یہ بتانا چاہتی ہے کہ خمس کا ادا کرنا تو بعد کا مسئلہ ہے پہلے مال کے بارے میں اسلام کا عقیدہ اور نظریہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے نزدیک ہر فائدہ کے صرف چار حصے مالک کے ہوتے ہیں اور ایک حصہ خدا و رسول و امام اور فقراء و مساکین کا ہوتا ہے اور یہ صرف ایک حکم اور فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک نظریہ ہے جس کے بعد مالک کی ملکیت ساقط ہو جاتی ہے اور وہ پانچویں کا غاصب کہا جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء کرام نے خمس کے وجوب میں بلوغ اور عقل کی شرط بھی نہیں رکھی ہے کہ یہ شرط عمل کے وجوب کے لئے ہوتی ہے اور آیت کریمہ نے عمل کے وجوب کے بجائے ملکیت کے دائرہ کو تنگ کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس طرح مسئلہ فرعی ہونے کے بجائے اصولی اور عملی ہونے کے بجائے علمی ہو گیا ہے۔

۲۔ خمس حکم عام

آیت خمس نے اس حکم کا اعلان "واعلموا" کے ساتھ کیا ہے جس کے لئے اگرچہ بلوغ ضروری نہیں ہے تو عقل بہرحال ضروری ہے لیکن اس کے باوجود آیت کا مضمون مالیات کے فلسفہ کی تشریح ہے لہٰذا علماء اعلام نے اسے بالغ و نابالغ، عاقل و مجنون سب سے متعلق کر دیا ہے اور اس طرح اسے وہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے جو فروع دین میں کسی مسئلہ کو حاصل نہیں ہے۔

حد یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی ایک مالی فریضہ ہے لیکن اس میں زکوٰۃ کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کو مال کا ایک حصہ نہیں قرار دیا گیا ہے کہ اس قدر حصہ تمہاری ملکیت سے خارج ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان عاقل و بالغ ہو گا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی ورنہ نابالغ یا مجنون ہونے کی صورت میں اس کی ملکیت محفوظ رہے گی اور اس پر زکوٰۃ کا فریضہ عائد نہ ہو گا۔

اس اعتبار سے خمس زکوٰۃ کے مقابلہ میں ایک مزید امتیاز کا مالک ہو گیا ہے اور اسے وہ امتیاز دے دیا گیا ہے جو کسی دوسرے فریضہ کو حاصل نہیں ہے۔

۳۔ خمس۔ ایک مالی عبادت

عام طور سے دنیا کے نظام میں عبادات کو مالیات سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جن مسائل سے عبد و معبود کا رشتہ مستحکم ہوتا ہے انہیں عبادت کہا جاتا ہے اور جن مسائل سے انسان اور انسان کے تعلقات حل کئے جاتے ہیں انہیں معاملات کا درجہ دیا جاتا ہے۔

یا دوسرے الفاظ میں عبادت کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے اور مالیات کا تعلق مادیات سے۔ عبادات تزکیہ نفس کا ذریعہ ہوتے ہیں اور مالیات تزکیہ مال کا، اور چونکہ نفس اور مال کی لائن الگ ہے لہٰذا ان دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔

لیکن خمس نے اس تفرقہ کو بھی ختم کر دیا ہے کہ وہ ایک طرف اسلامی مالیات کی تشکیل و تعیین کا سبب ہے تو دوسری طرف عبادت بھی ہے جس کے ذریعہ سے نفس کے ارتقاء کا انتظام کیا جاتا ہے اور عبد و معبود کے رشتہ کو مستحکم بنایا جاتا ہے — اور اس کا بہترین ثبوت خمس کے مصارف اول

میں خود ذات واجب کا مقام حاصل ہوتا ہے کہ جب خمس کا پہلا صاحب حق خود پروردگار ہے تو ناممکن ہے کہ انسان اس حق کا تصور کرے اور دل میں اس کا تصور نہ پیدا ہو یا اس حق کو ادا کرے اور مالک کے علاوہ کسی اور کے تصور سے ادا کرے۔ یہ تو انسان کی انتہائی جہالت اور بدبختی ہوگی کہ وہ اپنے مال کا ایک بڑا حصہ نکال کر پروردگار کی بارگاہ میں نذر کرے اور اس کا مقصد غیر خدا کی مرضی یا اس کا تقرب ہو۔

خمس کے اس عبادی پہلو سے غفلت کا راز یہ ہے کہ یہ براہ راست پروردگار کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس کے نمائندوں کو دے دیا جاتا ہے اور ان نمائندوں کی شخصیت میں گم ہو کر انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ رسول کی بیعت اللہ کی بیعت ہے اس لئے کہ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اور اس کو کوئی شے دینا خدا کو دینے کے مرادف ہے۔

۴۔ عمومیت موارد

دنیا میں عام طور پر مالیاتی نظام کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ بعض اشیاء پر ٹیکس لگایا جاتا ہے اور بعض پر نہیں لگایا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی اس کی شکل موجود ہے کہ اس نے سکوں کی بے شمار قسموں میں سے صرف سونے اور چاندی کے سکوں پر زکوٰۃ واجب کی ہے اور غلوں کی تمام اقسام میں سے صرف چار غلوں پر زکوٰۃ عائد کی ہے اور جانوروں کی ہزاروں قسموں میں سے صرف تین جانوروں پر زکوٰۃ واجب کی ہے۔ لیکن خمس کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے اور اس میں کہیں زیادہ عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس کے بعض موارد کی تعیین ضرور کر دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت ہر طرح کی آمدنی پر واجب ہے اور کسی طرح کی بھی جائز آمدنی سال بھر کے خرچ کے بعد اگر بچ جائے تو اس میں سے خمس نکالنا ہوگا

خمس کے موارد میں معدنیات، غوطہ خوری اور خزانہ وغیرہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کا خمس ہر وقت واجب ہوتا ہے وہ سال تمام کی بچت سے انحصار کوئی ... ایسا نہیں ہے جہاں خمس واجب نہ ہو اور اس کا تعلق ہر آمدنی سے ہے جس کی طرف آیت میں لفظ من شیء سے اشارہ کیا گیا ہے کہ جس شے سے بھی فائدہ حاصل ہو جائے اس

پانچواں حصہ اللہ و رسول، امام اور سادات کرام کو دینا ہے۔

۵۔ علامت ایمان

آیت خمس میں یہ نکتہ بھی بہت واضح طور پر نظر آتا ہے کہ پروردگار نے حکم خمس کے بیان کے ساتھ ہی یہ فقرہ بھی کہہ دیا ہے کہ "اگر تمہارا ایمان اللہ اور اس کی اس امداد پر ہے جو اس نے روز بدر نازل کی ہے" اور اس طرح خمس کو علامت ایمان قرار دے دیا گیا ہے کہ انسان کا اللہ پر ایمان ہوگا تو خمس ادا کرے گا اور اللہ پر ایمان نہ ہوگا تو نہیں ادا کرے گا۔ اگر نہیں ادا کرے گا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کا ایمان اللہ پر نہیں ہے اور اس طرح خمس کو ایک امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے تمام احکام میں صاحبان ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے کہ یہ حکم تقاضائے ایمان میں شامل ہے۔ اور گویا انسان کو صاحب ایمان فرض کر لیا گیا ہے، لیکن خمس کے اعلان میں ایمان کو بعد میں رکھا گیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان خمس کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر تم نے اس حق کو ادا نہیں کیا تو گویا اپنے ایمان کو اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔

۶۔ ضمانت نقصان

آیت خمس میں ایمان کے ذیل میں پروردگار نے ایمان کے ساتھ اس مدد پر ایمان کا ذکر کیا ہے جو اس نے روز بدر نازل کی ہے۔

روز بدر کی صورت حال یہ تھی کہ مسلمان صرف ۳۱۳ افراد تھے جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ تھے جن پر باری باری سواری کرتے تھے اور صرف دو گھوڑے تھے جو میدان جنگ میں کام آسکتے تھے اور ان کے مقابلہ میں کفار ۹۵۰ افراد اور سب مسلح تھے سارا ساز و سامان ان کے ساتھ تھا اور ایسے حالات میں جنگ کرنا خودکشی کے مرادف تھا اور مسلمان فطری طور پر ایسے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے بلکہ بعض افراد نے واضح لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ ہم تو قافلہ تجارت کو لوٹنے کی غرض سے آئے تھے جنگ کرنے کے ارادہ سے نہیں آئے تھے لیکن اس کے باوجود

پروردگار عالم نے جب دو کو واجب کر دیا۔ ور مسلمانوں کی تسکین قلب کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ تم اپنی کمزوری کا احساس نہ کرو ہم تمہارے لئے بغیب سے امداد کا انتظام کر سکتے ہیں اور ملائکہ کا لشکر بھیج سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو خدا ابابیل کے لشکر سے اصحاب فیل کو تباہ کر سکتا ہے وہ ملائکہ کا لشکر بھیج دے گا تو کفر کا دم کیا ہم ختم ہو جائے گا۔ یہ سن کر مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے لیکن اس کے بعد جب جنگ تمام ہو گئی اور مسلمانوں کو فتح بدر کے نتیجہ میں مال غنیمت حاصل ہو گیا تو پروردگار عالم نے خمس کے وجوب کا اعلان کر دیا اور اس اعلان میں بدر کی مدد کا حوالہ دے دیا تاکہ مرد مومن کو یہ اطمینان رہے کہ جو پروردگار افراد اور اسلحہ کی کمی کو غیبی امداد یعنی ملائکہ کے ذریعہ پورا کر سکتا ہے وہ خمس میں نکالے ہوئے مال کی کمی کو بھی پورا کرنے کا غیبی انتظام کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اور ایسے واضح تجربہ کے بعد کسی تردد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اس طرح خمس کی عظمت کا بھی اعلان ہو گیا اور مسلمانوں کی تسکین قلب کا بھی سامان ہو گیا کہ راہ خدا میں مال دینے میں کوئی تردد نہ رہ جائے۔

۷۔ علاج حب مال

محبت اور نفرت انسان کا فطری جذبہ ہے جس سے کسی شخص کو آزاد نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کا کمال محبت یا نفرت نہیں ہے۔ اس کا کمال ان موارد کی تشخیص میں ہے جہاں محبت یا نفرت کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جذبہ محبت ایسی صحیح جگہ پر استعمال ہو جائے تو بہترین جذبہ ہے، اور اسی کے [illegible] رسول رکھنے والوں کو عظیم ترین درجہ دیا گیا ہے اور یہی جذبہ دنیا کی [illegible] سے متعلق ہو جائے تو بدترین جذبہ ہے جس کے نتائج فرعون، قارون اور نمرود وشداد کی شکل میں برآمد ہوتے [illegible] انسان کا کمال یہ ہے کہ یہی محبت یا نفرت کو اسی جگہ پر رکھے جو اس کا صحیح مقام [illegible] قرآن مجید نے اسی نکتہ کی بار بار وضاحت کی ہے اور اسی کے دو طریقے بیان کئے [illegible]

● ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کو براہ راست بتا دیا ہے کہ کس شے سے محبت کرنا [illegible] اور کس سے محبت نہیں کرنا ہے۔

● دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پروردگار کے صفات کا تذکرہ کر دیا ہے کہ وہ کس سے محبت کرتا ہے اور کس سے محبت نہیں کرتا ہے تاکہ بندہ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ واقعاً کون محبت کرنے کے لائق ہے اور کون اس قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ پروردگار کا عمل بہرحال بے محل نہیں ہو سکتا ہے اور اس کے عمل سے حقائق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے جس محبت کو باعث مذمت و ہلاکت قرار دیا ہے وہ عمومی طور پر محبت دنیا ہے اور خصوصی طور پر محبت مال ہے جس کی طرف سورہ قیامہ آیت ۲۰ اور سورہ فجر آیت ۲۰ میں اشارہ کیا گیا ہے اور پھر سورہ آل عمران آیت ۹۲ میں اس کا علاج بھی بتا دیا گیا ہے کہ [illegible] انسان کس طرح نجات پا سکتا ہے اور محبت دنیا کے راستے کے تباہ کن ہلاکت سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے ہو جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ [illegible] خرچ نہ کرو۔"

گویا کہ محبت مال سے نجات حاصل کرنے کا بہترین راستہ انفاق اور وہ اس [illegible] خمس اس کی سب سے واضح مثال ہے۔ زکوۃ میں انفاق دسواں، بیسواں [illegible] حصہ ہوتا ہے۔ لیکن خمس میں پانچواں حصہ دینا ہوتا ہے جو بہرحال [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] خمس محبت مال سے نجات کا زکوۃ سے بہتر علاج ہے اور اس [illegible] منزل خیر تک [illegible] پہونچ سکتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام میں محبوب اور قابل مذمت شے محبت دنیا ہے مال نہیں ہے [illegible] خیر ہے اور خیر کو قابل مذمت نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مال [illegible] کی [illegible] دنیا کی ہر نیکی کی بنیاد ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا کوئی کار خیر انجام نہیں پا سکتا [illegible] مال محبوب کی شکل اختیار کرلے تو بدترین شے بن جاتا ہے اس لئے کہ انسان محبوب [illegible] ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ مال محبوب [illegible] قربان ہو نہ کہ محبوب مال کی راہ میں قربان ہو جائے۔

اسی لئے مولائے کائنات نے زہد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"زہد یہ نہیں ہے کہ تم کسی شے کے مالک نہ ہو۔ زہد یہ ہے کہ کوئی شے تمہاری مالک نہ بننے پائے۔"

تم مال کو ملکیت کی طرح استعمال کرو اور اسے اپنا مالک نہ بننے دو کہ وہ حلال و حرام جس راستہ پر چاہے تمہیں لے جائے اور تم ایک بے چارہ قیدی کی طرح اس کے اشاروں پر گردش کرتے رہو۔

اسی ذہنیت سے آزاد کرنے کی مہم تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے خمس کا اعلان مال غنیمت کے بارے میں کیا تاکہ مسلمان کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہمارا محبوب مال نہیں ہے بلکہ دین خدا ہے جس کی راہ میں جہاد کیا گیا ہے اور جان کی بازی لگائی گئی ہے۔ مال کے لئے جان دینا، اعلیٰ ترین کو کمترین پر قربان کرنا ہے اور یہ سراسر حماقت و جہالت ہے اور دین کے لئے قربان ہو جانا کمترین کو بلند ترین پر قربان کرنا ہے جو بہترین سعادت و شرافت ہے جس سے بالاتر کوئی سعادت و شرافت نہیں ہے۔

۸۔ تطہیر جہاد

جہاد اگرچہ خود ایک تطہیری عمل ہے جس کے ذریعہ سماج اور معاشرہ کو نجس اور ناپاک عناصر سے پاک بنایا جاتا ہے اور دلوں کے تزکیہ کا عمل انجام دیا جاتا ہے لیکن ایسے مقدس عمل کی تطہیر خود بھی ایک عظیم ترین کام ہے۔

جہاد جیسا تطہیری عمل جذبات اور خواہشات یا ملک گیری اور ہوس اقتدار سے آلودہ ہو جائے تو اس کے ذریعہ معاشرہ کی تطہیر کا عمل ہرگز انجام نہیں پا سکتا ہے۔

اسلام نے جہاد کی تطہیر اور تقدس کے پیش نظر اس کا اختیار معصوم کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ خطاکار افراد اس خطرناک حربہ کو بے محل استعمال نہ کرنے پائیں اور معاشرہ مزید کسی فساد کا شکار نہ ہونے پائے۔

جہاد کی تطہیر نہ ہونے اور اس کے معصوم ہاتھوں سے نکل جانے کا نتیجہ یہ ہوا

کہ تاریخ اسلام بے شمار بے گناہ افراد کے خون سے رنگین ہے اور خلفاء اسلام سے لے کر بنی امیہ و بنی عباس کے سلاطین تک سب نے اس مقدس وسیلہ کو ناجائز طور پر استعمال کیا ہے۔ مالک بن نویرہ سے لے کر بغداد کے قتل عام تک ہر مقام پر اس فریضہ کی تطہیر کے نہ ہونے کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

اسلام نے اس فریضہ کی تقدیس کا پہلا انتظام یہ کیا کہ جیسے ہی اسلام میں پہلا جہاد ہوا اور مسلمانوں کے ہاتھ میں مال غنیمت آیا قرآن مجید نے خمس کے فریضہ کا اعلان کر دیا تاکہ مسلمان کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ ہم نے محنت کی ہے۔ جان کو خطرہ میں ڈالا ہے لہذا سارا مال غنیمت ہمیں ملنا چاہیئے اور سب مجاہدین پر تقسیم ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ یہ احساس پیدا ہو کہ ہم سے زیادہ حقدار وہ غریب و مسکین افراد ہیں جو جہاد کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں اور اپنی زندگی کا آذوقہ فراہم کرنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ یا وہ رہنمائے مذہب ہے جس کی ہدایات پر یہ عمل انجام پایا ہے اور جس کی برکت سے یہ فتح ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اس کے بعد یہ احساس بھی پیدا ہو جائے کہ جہاد دین کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے مال غنیمت کے لئے نہیں ہوتا ہے کہ دنیا کی غارت گری اور اسلام کے جہاد کی حد فاصل یہی ہے کہ غارت گری لوٹ مار کے لئے ہوتی ہے اور جہاد میں جان و مال کو قربان کیا جاتا ہے۔ ان لوٹنے کا مقصد نہیں بنایا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال کا تذکرہ کیا ہے اور جہاد بالمال کو جہاد بالنفس پر مقدم رکھا ہے (انفال ۷۲، توبہ ۲۰، توبہ ۸۸، توبہ ۴۱، صف ۱۱) تاکہ انسان کو یہ اندازہ ہو جائے کہ جہاد میں مال صرف کرنے کی چیز ہے، اسے جہاد کا مقصد اور مدعا نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر مال غنیمت میں خمس کا فریضہ نہ ہوتا تو جہاد کی تطہیر کا عمل بہت مشکل ہو جاتا۔ اس لئے کہ جہاد میں آنے والے ہمیشہ دو طرح کے افراد تھے۔ بعض طالب دنیا تھے اور بعض طالب آخرت۔

اور دوسری قسم کو پہلی قسم سے الگ کرنے کا ایک آسان ترین وسیلہ یہی مسئلہ خمس تھا۔

[illegible]

اور اس میں غارت گری اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ فقہائے اسلام جب فریضۂ خمس کی مخصوصیت کی بات کرتے ہیں تو آیت خمس کے ظاہر کا سہارا لے کر تمام موارد خمس کا انکار کر دیتے ہیں اور صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ اسلام میں خمس صرف مال غنیمت میں ہے اور مال غنیمت کے علاوہ کسی شے میں خمس واجب نہیں ہے۔ لیکن جب عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں تو سرکار دو عالمؐ کے بعد مجاہدات کی ایک فہرست تیار کر دیتے ہیں۔ ایران فتح ہو گیا، روم فتح ہو گیا، فلاں علاقہ فتح ہو گیا۔ لیکن کسی علاقہ سے خمس کی کوئی خبر نہیں آتی ہے کہ وہاں کے مال غنیمت میں اس قدر خمس نکالا گیا ہے اور فلاں فلاں افراد پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگوں کو زندہ رکھا گیا ہے کہ وہ ذریعہ آمدنی تھیں اور خمس کو ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ اقربائے پیغمبر کا حق تھا اور ان کا حق ضائع کرنے سے بڑا کوئی اسلامی عمل نہیں ہو سکتا۔

۹۔ قدردانی خدمات

انسانی زندگی میں جس قدر اہمیت احسان شناسی کی ہے اس سے زیادہ اہمیت خدمات کی قدردانی کی ہے۔ احسان شناسی صرف اس مقام پر ضروری ہوتی ہے جہاں خدمات کا تعلق انسان کی ذات سے ہو لیکن قدردانی وہاں بھی ضروری ہوتی ہے جہاں بظاہر انسان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے لیکن خدمت کی اہمیت کے پیش نظر ان کا اعتراف کرنا ہوتا ہے اور اسی کی قدردانی تصور کی جاتی ہے۔

نبی اور امام انسانی وجود کے بے محسن بھی ہیں اور ان کے خدمات قابل قدر بھی ہیں۔ احسان کے اعتبار سے ان کا اتنا ہی احسان کافی ہے کہ ان کا وجود کائنات کے لیے سبب ہے اور ان کی بقا انسانیت کے لیے وجہ بقا ہے۔ وہ نہ ہوتے تو پروردگار عالم مکان کی خلقت نہ کرتا اور ان کا سلسلہ ختم ہو گیا ہوتا تو زمین اہل زمین کو لے کر دھنس جاتی۔

ان کے خدمات ہدایت بشر کے سلسلہ میں لاتعداد و لاتحصیٰ ہیں جن کا ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ ان کے خدمات کا اعتراف کرے اور یہ محسوس کرے کہ ہمارے وجود اور ہمارے ایمان

ان کا بے پناہ احسان ہے جس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فریضۂ انسانی ہے۔

خمس درحقیقت اسی جذبہ کی ترجمانی ہے کہ انسان اپنے مال کا ایک حصہ نبیؐ اور امامؑ کے حوالے کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم نے ان کے احسانات کا عملی شکریہ ادا کیا ہے اور ان کے خدمات کی واقعی قدردانی کی ہے ورنہ زبانی جمع خرچ تو ہر انسان کر سکتا ہے لیکن اس کی عملی زندگی میں کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

۱۰۔ احساس عظمت آل رسولؐ

خمس کا نصف حصہ نبیؐ اور امامؑ کو دیا جاتا ہے تو دوسرا نصف حصہ اولاد رسولؐ کے فقراء کے لئے ہے جو درحقیقت احسان شناسی ہی کی ایک قسم ہے جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جب ہمارے دین و مذہب کے لئے اولاد رسولؐ نے نسل در نسل قربانی دی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ان کی بقا اور ان کی زندگی کے لیے ہر ممکن انتظام کریں اور اسی طرح نسل رسولؐ کی عظمت کا بھی ایک احساس پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار نے رسول اکرمؐ کے احترام میں ان کے واسطے انسانوں کے ہاتھوں کا میل جیسی زکوٰۃ کو حرام کر دیا ہے اور اب ان کی زندگی کا واحد سہارا خمس ہے جو ان کی معاشی زندگی کا رکن اعظم ہے اور ان کی نسلی شرافت کا اعلان بھی ہے۔

خمس کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ یہ اسلام کے بنیادی نظریات کے خلاف ہے اور اسلام نسلی اختلافات کا قائل نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ خمس کا نصف حصہ ایک مخصوص نسل اور سب کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔ درحقیقت اس نسل کی تاریخ سے غفلت ہے۔

اس نسل کو پروردگار نے جو امتیازات عطا کئے ہیں۔

پہلا امتیاز یہ ہے کہ یہ سرکار دو عالمؐ کی نسل ہے جنہوں نے اسلام و شریعت کی ہدایت کے لئے ہر طرح کی قربانی دی ہے اور اس طرح ان کا حق ہے کہ قیامت تک ان کے خدمات کا احترام برقرار رکھا جائے اور اس کا عملی اور واقعی طریقہ یہی ہے کہ ان کی اولاد کا احترام کیا جائے اور اس احترام کو ان کے احترام کا تسلسل قرار دیا جائے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سلسلے نے دین کی راہ میں مصائب کا سامنا کیا ہے جس کی مثال تاریخ انسانیت میں کہیں نہیں ہے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے حکام نے اس کا نام و نشان تک مٹا دینے کی قسم کھا رکھی تھی اور واقعۂ فدک سے لے کر آخری دور تک ہمیشہ انہیں بھوکا مارنے کی مہم چلتی رہی۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ صاحبانِ ایمان کے مال میں ایک حصہ ان کی حیات کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ ان کا تسلسل برقرار رہے اور آئندہ بھی لوگوں میں مسلسل قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا رہے۔

۱۱۔ احساس دردِ انسانی

خمس کا نصف حصہ اگرچہ آلِ رسولؐ کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن یہ ان کا اصلی ٹیکس نہیں ہے کہ صرف آلِ رسولؐ ہونے کی بنا پر انہیں دے دیا جائے اور اسی طرح اولادِ رسولؐ بغیر محنت و مشقت کے امت کا مال کھاتی رہے۔ بلکہ یہ اولادِ رسولؐ کے فقراء و مساکین اور ایتام و مسافرین غربت زدہ کا حق ہے جو انہیں ان کی غربت و پریشان حالی کی بنا پر دیا جاتا ہے اور اس کی حیثیت بالکل زکوٰۃ جیسی ہے کہ جس طرح زکوٰۃ فقراء و مساکین اور مسافرانِ غربت زدہ کے لئے ہے اسی طرح خمس بھی آلِ رسولؐ کے غرباء و مساکین کے لئے ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حق عام طور سے غیر سادات کے لئے ہوتا ہے اور خمس کا حق سادات کرام کے لئے ہے اور اس کے ذریعہ غربت و افلاس کے درد کا احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ انسان دولت پا کر غریبوں کا درد فراموش نہ کر دے بلکہ یہ خیال رکھے کہ یہ دنیا گردش کی دنیا ہے اور برابر گردش کر رہی ہے اور کرہ جب گردش کرتا رہتا ہے تو تھوڑی دیر میں نیچے کا حصہ اوپر ہو جاتا ہے اور اوپر کا حصہ نیچے چلا جاتا ہے۔ جو انسان آج غربت کی زندگی گذار رہا ہے وہ کل امیر بھی ہو سکتا ہے اور جو آج دادِ عیش دے رہا ہے وہ کل غربت زدہ بھی ہو سکتا ہے۔ جب تک حالات سازگار ہیں، دولت کا سہارا ہے اور ہاتھ میں چل رہا ہے۔ غریبوں کے درد کا خیال رکھے تاکہ کل خدانخواستہ زمانے کی بساط پلٹ جائے تو دوسرے لوگ اس کے درد کا بھی احساس کر سکیں اور سماج میں یہ عادت برقرار رہے کہ ہر صاحبِ حیثیت غریب و مسکین کا خیال رکھے گا اور اس کی طرف سے غافل نہ ہونے پائے گا۔

یہ ایک اخلاقی نکتہ تھا جس کی طرف ہر فرد کو متوجہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ صرف اخلاق انسان کو عمل پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا اور دنیا میں اخلاق کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا اس لئے اسلام نے فریضہ کا سہارا لیا اور خمس کو واجب بنا کر اس کا ایک حصہ ایتام و مساکین کے ساتھ مخصوص کر کے انسان میں اس اخلاقی جذبہ کو بیدار کر دیا اور اسے شرافت کے راستے پر لگا دیا۔

۱۲۔ نجات از جہنم

خمس کا ایک حصہ فقراء و مساکین و مسافرانِ غربت زدہ کے لئے ہونے کے علاوہ ایتام کے لئے بھی ہے جن کے مال کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد ہدایات پائی جاتی ہیں:

- مالِ یتیم کے قریب بھی نہ جاؤ اور اسے بہترین احسن طریقہ سے ہاتھ لگاؤ۔
- یتیموں کے بارے میں اصلاح ہی خیر ہے۔
- یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام لو۔
- جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھا جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور ان کا انجام بھی جہنم ہے۔ (نساء ۱۰)

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مالِ یتیم پر ناجائز تصرف انسان کو جہنم تک پہنچا سکتا ہے، اور اس کا کھانا دنیا میں بھی آگ کھانے کے مرادف ہے جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ خمس انسان کو آتشِ جہنم سے نجات دلانے کا بہترین ذریعہ ہے ورنہ انسان مالِ یتیم کھا کر کسی وقت بھی جہنم میں جا سکتا ہے۔

پھر خمس میں سہمِ یتیم کی دوہری تاکید پائی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ مال آلِ رسولؐ کے عام یتیموں کو دیا جاتا ہے اور اس کی ادائیگی سے انسان آتشِ جہنم سے نجات حاصل کرتا ہے ۔ اور دوسری طرف اسی کا ایک حصہ امامؑ کے لئے ہے جو اولادِ پیغمبرؐ ہونے کے اعتبار سے پیغمبرؐ کے بعد ایتام کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یتیم کہا جاتا ہے، اور ائمہ طاہرینؑ تو پیغمبرؐ کے بعد ہی یتیم ہو گئے اور ان کے سر سے ان کے باپ کا سایہ اسی دن اٹھ گیا جس دن پیغمبرؐ نے انتقال فرمایا کہ یہ سب واقعاً اولادِ پیغمبرؐ ہیں جیسا کہ خود امام باقرؑ نے فرمایا کہ آیت میں یتیم سے مراد

ہم اہلبیتؑ ہیں جن کے سر سے ان کے حقیقی اور معنوی باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے، اور ہم واقعاً یتیم ہو چکے ہیں۔

۱۳۔ اعترافِ ملکیتِ حقیقی

خمس کے موارد میں بعض ایسے مقامات بھی شامل ہیں جن کا کوئی تعلق دستِ بشر کی طاقت یا صنعت سے نہیں ہے جیسے معدنیات یا خزانۂ زیرِ زمین یا موجوداتِ دریا و سمندر۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان موارد پر خمس کا فلسفہ کیا ہے اور ان سے کس کی ملکیت تصور کیا جائے؟ اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ ان مقامات پر ملکیتِ حقیقی اس خالق و مالک کی ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کی خلقت یا صنعت میں کسی طرح کی انسانی طاقت یا محنت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان نے صرف انہیں برآمد یا حاصل کر لیا ہے۔

مالک کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ سارا مال حاصل کر کے دے دیتا کہ دوسرا کوئی اس کے عمل میں شریک نہیں ہے۔ لیکن اس نے چار حصے دینے کے بعد ایک حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیا تاکہ واضح کر دے کہ یہ احساس رہے کہ ان مقامات کا بھی کوئی مالکِ حقیقی ہے جو ان معدنیات کے برآمد کرنے والے کو مالکِ حقیقی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ احساسِ ادائے حق

دنیا میں ہر انسان حق لینے کے لئے تیار رہتا ہے لیکن حق دینے میں ہمیشہ تکلف سے کام لیتا ہے۔

اسلام نے حق و فرض میں ایک عادلانہ رابطہ قائم کر دیا ہے کہ جس شخص کو کوئی حق دیا جائے اس کے ذمہ کوئی فرض بھی رکھ دیا جائے اور جس شخص کے ذمہ کوئی فرض رکھا جائے اسے کوئی حق بھی دے دیا جائے۔

لیکن انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر اس عدالت کو قائم نہیں رکھ سکا ہے اور فرض میں کوتاہی کے بعد بھی حق طلبی کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے مذہب نے خمس و زکوٰۃ کا احساس اور

پر بھی حق کا مطالبہ کر دیا جائے اور حق کی ادائیگی کو بھی فرض کی شکل دے دی جائے تاکہ حق اور فرض میں ارتباط قائم رہے اور انسان کے اندر حق کے ادا کرنے کا فطری جذبہ پیدا ہو جائے کہ یہی انسانیت کی معراج اور کردارِ بشر کا عظیم ترین کمال ہے۔

۱۵۔ حقِ مشترک

اسلام نے حقوق کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ حق اللہ، حق العباد۔

بعض حقوق کا تعلق ذاتِ پروردگار سے ہے اور اس میں بندوں کا کوئی دخل نہیں ہے جیسے نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ۔

اور بعض حقوق کا تعلق بندوں سے ہے جن میں پروردگار بھی مداخلت نہیں کرنا چاہتا ہے اور انہیں بندوں ہی کے حوالے رکھنا چاہتا ہے جس طرح کہ غصب وغیرہ کے بارے میں کہہ دیا ہے کہ جب تک مظلوم معاف نہ کرے گا پروردگار بھی معاف نہ کرے گا یا ماں باپ اور اولاد کے حقوق ہیں یا زوجہ اور شوہر کے حقوق ہیں کہ ان سب کا شمار حق العباد میں ہوتا ہے کہ جو ان حقوق کو پروردگار نے طے کیا ہے لیکن ان کے معاملہ کو بندوں کے حوالے کر دیا ہے کہ بندے ان حقوق کو معاف کریں گے تو ان کا مواخذہ ختم ہو جائے گا ورنہ مواخذہ بہرحال باقی رہے گا۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فہرست بہت طویل ہے۔ اور یہ علماء نے اپنے اپنے مقام پر ان تمام موارد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو حقوق کی دونوں قسمیں قرار دئے ہیں لیکن ان سب کے درمیان خمس کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ بیک وقت حق اللہ بھی ہے اور حق العباد بھی۔ اس کے بارے میں آیت نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ تمہارے فوائد کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قرابتدار، یتیموں اور فقراء و مساکین وغیرہ کے لئے ہے جس کا واضح ترین مفہوم یہ ہے کہ یہ حق ایک حق مشترک ہے جس کا ایک حصہ اللہ سے متعلق ہے اور ایک حصہ بندگانِ خدا سے اور اس کا لازمی اثر یہ ہے کہ ہر حق میں صاحبِ حق کے معاف کر دینے کے بعد دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رہ جاتا ہے۔

لیکن خمس ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اگر مستحقینِ خمس اپنے حق کو معاف بھی کر دیں تو

حق بہرحال باقی رہ جاتا ہے ورنہ اگر پروردگار معاف بھی کردے تو صاحبانِ حق کا حق بہرحال باقی رہ جاتا ہے۔ پھر صاحبانِ حق بھی تمام قسم کے افراد ہیں۔ ان میں نبی بھی شامل ہے اور امام بھی۔ اور ان دونوں کے بعد غریب، نادار، مسکین بھی۔ ظاہر ہے کہ نبی اور امام کو کریم فرض کرکے اطمینان بھی کرلیا جائے تو نادار لوگوں کا حق کون معاف کرے گا اور انہیں کس طرح راضی کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۔ اہمیت محنت

خمس اور زکوٰۃ کی مقدار پر نظر کرنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ خمس کی مقدار اس قدر زیادہ کیوں ہے۔ جب کہ اس کا مصرف صرف ایک قسم کے افراد کی تربیت یا ایک ذمہ دار منصب کے فرائض کی ادائیگی ہے اور اس کے برخلاف زکوٰۃ کی مقدار بہت کم ہے جب کہ اس کے مصارف آٹھ قسم کے ہیں اور اس سے تمام امور دینی و دنیوی انجام پانے والے ہیں۔

لیکن اس کا جواب بہت واضح ہے۔

اول تو اس لئے کہ خمس کے مصارف کم نہیں ہیں۔ زکوٰۃ میں جن آٹھ مصارف کا ذکر کیا گیا ہے خمس کے سہم امام میں یہ سارے مصارف شامل ہیں اور اس کے علاوہ مذہب کے تمام ضروریات کو اسی سہم امام کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے اور یہ امام کا ذاتی مال نہیں ہے کہ اس کا حساب کسی ایک انسان کی آمدنی اور خرچ پر کیا جائے۔ دنیا کے سربراہ مملکت آمدنی کے اعتبار سے بے پناہ اموال کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان پر بے پناہ ذمہ داریاں نہیں ہوتی ہیں۔ سہم امام کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے یہ ایک منصب کی آمدنی ہے جس کی ذمہ داریاں مذہب کے تمام افراد، جماعتیں، امت اور حکومت سب سے زیادہ ہے اور اس اعتبار سے اسے کثیر نہیں شمار کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خمس اور زکوٰۃ کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ خمس کے موارد عام طور سے محنت سے آزاد ہیں اور زکوٰۃ کے موارد سب محنت و مشقت والے ہیں۔

مثال کے طور پر خمس میں مال غنیمت مال مفت ہوتا ہے اور مسلمان کا جہاد مال غنیمت کے لئے نہیں ہوتا ہے۔

خزانہ اچانک حاصل ہوجاتا ہے۔

غوطہ زنی کے بعد سامان اتفاق سے مل جاتا ہے۔

معدنیات کی تشکیل میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

سالانہ آمدنی میں بھی بچت پر خمس واجب ہوتا ہے جو اخراجات کے بعد آمدنی کا فاضل حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مقامات پر مالیات کی مقدار بھی زیادہ (۱/۵) رکھی گئی ہے۔

لیکن زکوٰۃ کے موارد اس سے بالکل مختلف ہیں۔

وہ سونے چاندی کے سکّے گھسائے جاتے ہیں۔

درخت کے پھل یا کھیت کا غلہ اگایا جاتا ہے۔

جانوروں کی پرورش اور پرداخت کی جاتی ہے اور یہ سارے کام محنت و مشقت کے ہیں لہٰذا یہاں ٹیکس کی مقدار بھی کم رکھی گئی ہے۔

اور اس مقدار کا فلسفہ بھی یہ ہے کہ انسان کسی دور میں کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے محنت تو صرف سبب نہیں ہے اس سے بالاتر ایک رحمت پروردگار بھی ہے جو سبب حقیقی کا درجہ رکھتی ہے۔ رحمت پروردگار نہ ہو تو کسان بیج کو سڑا سکتا ہے غلہ اگا نہیں سکتا ہے۔

جانور پالنے والا گھاس کے سہارے صحرا میں جانور چھوڑ سکتا ہے گھاس پیدا نہیں کرسکتا ہے۔

محنت مشقت کرنے والا سونے چاندی کے سکے گھس سکتا ہے سونے چاندی کے معادن ایجاد نہیں کرسکتا ہے۔

اور چونکہ ہر محنت کے ساتھ ایک رحمت پروردگار بھی دخل رکھتی ہے لہٰذا یہاں بار میں جس طرح محنت کرنے والے کا حصہ رکھا گیا ہے اسی طرح اپنی رحمت کو شامل حال کرنے والے کا بھی حصہ ہے جو اس کے محتاج بندوں پر صرف کردیا جاتا ہے یا اس کی راہ میں ہونے والے کسی بھی کار خیر پر صرف ہوجاتا ہے۔

محنت و مشقت کی اسی مادی حیثیت کی بنا پر زکوٰۃ کی مقدار خمس سے کمتر ۱/۴۰ کردی گئی ہے کہ انسان کو محنت کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو کہ اسلام انسان کی محنت و مشقت کے پیش نظر ہی محصولات اور ٹیکس کم کردیتا ہے اور اس طرح انسان کو محنت و مشقت کے پیسہ کمانے اور اخلاقی درجہ اور بلند ہونے کی دعوت دیتا ہے کہ ان محنتوں کے بغیر انسانی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور یہ

اور انسانی سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۷۔ وسیلۂ تطہیر مال

خمس جس طرح انسان کے نفس کو حُبِ مال سے پاک و پاکیزہ بناتا ہے اسی طرح اس کے مال کو بھی پاک و پاکیزہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ان تطہیروں کی دو قسمیں ہیں:

تطہیر معنوی اور تطہیر مادی۔

تطہیر معنوی تمام موارد خمس میں پائی جاتی ہے کہ مال انسان اس وقت تک طیب و طاہر کہے جانے کے قابل نہیں ہوتا ہے جب تک اس کا خمس ادا نہ کر دیا جائے۔

اب یہ کثافت کیا ہے جو غیر مخمس مال میں پائی جاتی ہے اور وہ طہارت کیا ہے جو خمس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا سمجھنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے اور اس کا واقعی ادراک مالک حقیقی کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے جسے پروردگار عالم نے اسرار کائنات کا علم عطا کیا ہے اور جو رب العالمین کے تمام احکام کے اسرار و مصالح سے باخبر ہیں۔

طہارت مادی کا تعلق اس مورد پر ہوتا ہے جہاں مال حرام اور مال حلال مخلوط ہو جاتا ہے کہ ایک شخص ایسا کاروبار کرتا ہے جس کے بعض اجزاء حلال ہیں اور بعض حرام اور اسے حرام کی مقدار معلوم نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ یہ مال حرام کس جہت سے حاصل ہوا ہے کہ اسے واپس کر کے گلو خلاصی حاصل کر لی جائے تو ایسے مقامات پر اسلام نے خمس کو وسیلۂ تطہیر قرار دیا ہے کہ انسان اس مال کا خمس نکال دے تو باقی مال خود بخود پاک ہو جائے گا۔

یہ صلاحیت دیگر احکام شریعت میں نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح خمس کا حق عبد و معبود دونوں کے درمیان مشترک ہے اسی طرح اس کی تطہیر بھی دونوں جہتوں کی حامل ہے کہ اس کی ادائیگی سے انسان کا نفس بھی حُبِ مال سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کا مال بھی اختلاط حلال و حرام کی کثافت سے بالکل باہر نکل آتا ہے اور انسان کو یہ عبرت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ حرام کاروبار میں معصیت اور عذاب الٰہی کے علاوہ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ انسان کو آمدنی کا پانچواں حصہ نکال دینا پڑتا ہے چاہے مال حرام کی مقدار اس سے کم ہی کیوں نہ رہی

ہو اور اس طرح جس مال کی لالچ میں حرام و حلال کو ایک کر دیا تھا وہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا اور انسان "خسر الدنیا والآخرۃ" کا مصداق ہو گیا۔

۱۸۔ احتیاطِ تصرفات

خمس انسان کو جن اخلاقی مسائل کی دعوت دیتا ہے ان میں سے ایک تصرفات کی احتیاط بھی ہے۔

خمس کے بارے میں تین قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں:

۱۔ انسان سال کے اندر جس قدر بھی مال اپنے جائز ضروریات میں صرف کرتا ہے اس مال کا خمس واجب نہیں ہوتا ہے اور خمس کا تعلق صرف باقیماندہ مال سے ہوتا ہے۔

۲۔ اگر انسان نے اپنی ضرورت یا اوقات سے زیادہ خرچ کر دیا تو یہ خرچ مستثنیٰ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس خرچ کا بھی خمس ادا کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اسراف ایک بلائے دو جان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ اگر کسی انسان نے اپنی ضرورت سے کم بھی خرچ کیا اور یہ سوچا کہ سال تمام پر بقدر ضرورت مال مستثنیٰ کر کے باقی کا خمس نکال دے گا اور اس طرح صرف ہونے والے مال اور ضرورت کے مال کا فرق مزید بچ جائے گا تو یہ اس کا خیال خام ہے اور اس صورت میں بھی صرف شدہ مال ہی مستثنیٰ ہوگا، ضرورت نہیں رکھی جائے گی اور اس بخل اور کنجوسی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس مسئلہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خمس انسان کو صرف کرنے کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہے۔

وہ ایک طرف انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ مال کو جائز ضروریات میں صرف کیا جائے اور دوسری طرف سے الفت اس کو بتا دیا جائے کہ شریعت کو اس صرف پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور بلاوجہ انسان کو معمولی خرچ اور کنجوسی سے روکتا بھی ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے خود اس معمولی خرچ میں مال خرچ بھی ہو گیا ہے اور پھر بھی اس کا خمس ادا کرنا پڑتا ہے اور اگر ایک طرف انسان کنجوسی میں مال کے استعمال سے محروم بھی رہا ہے اور پھر بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے

جس کی بنا پر کنجوسی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہی حال حرام تصرفات کا بھی ہے کہ یہیں بھی اسلام نے خرچ تسلیم نہیں کیا ہے اور نہ ہی خمس واجب کر دیا ہے جس کا نتیجہ ظاہری نقصان بھی ہے اور واقعی عذاب آخرت بھی۔ کہ خمس نکال دینا تصرفات کی حرمت کے گناہ سے آزاد نہیں کر سکتا ہے۔

۱۹۔ فرض و قرض

اسلام کے واجبات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اعمالی واجبات (۲) اموالی واجبات

اعمالی واجبات میں نماز، روزہ وغیرہ شامل ہیں جن میں اعمال انجام دئے جاتے ہیں لیکن اموال کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

اموالی واجبات میں اعمال کے علاوہ مال کا بھی دخل ہوتا ہے جیسے حج بیت اللہ، خمس، زکوٰۃ وغیرہ۔

اعمالی واجبات کو فرض کا نام دیا جاتا ہے لیکن مالی واجبات کو فرض کے علاوہ قرض بھی کہا جاتا ہے جس کا بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ اعمالی واجبات انسان کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور مرنے والے سے کوئی تعلق نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ایک فرض قضا ہے جو بعض حالات میں فرزند اکبر پر عائد ہوتا ہے ورنہ مرنے والے کی ذات یا اس کے اموال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اموالی واجبات قرض کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا تعلق مرنے کے بعد بھی مرنے والے سے باقی رہتا ہے، وہ اس کے اموال مرنے والے کے اموال سے ادا کی جاتی ہے اور اس کا کوئی تعلق وارث کی ذات سے نہیں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر انسان نے کوئی ترکہ چھوڑا ہے تو پہلے مالی قرض یعنی حج، خمس اور زکوٰۃ کا قرض ادا کیا جائے گا۔ اس کے بعد مال کو ورثہ کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

ان فرائض کی ادائیگی کے بغیر ورثہ کو ترکہ میں ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے، اور اعمالی فرائض کی ذمہ داری فرزند اکبر یا کسی دوسرے وارث پر نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی مرنے والے کی عبا

حج انجام دے سکتے ہیں۔

۲۰۔ تاکید عظمت امامت

خمس کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اگر دور غیبت امام میں کوئی جہاد کیا گیا ہے یا حضور امام میں اذن امام کے بغیر کوئی جہاد کیا گیا ہے تو سارا مال غنیمت صرف امام کے لئے ہوگا اور سپاہیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا جب کہ اذن امام سے ہونے والے جہاد میں خمس نکالنے کے بعد باقی مال مجاہدوں میں تقسیم ہو جاتا ہے چاہے وہ جہاد کفار کے حملہ کے نتیجہ میں ہو یا مسلمانوں کی طرف سے حالات کو دیکھ کر پہل کی گئی ہو یا مسلمانوں کے اقتدار کی وسعت کے پیش نظر جنگ کا آغاز کیا گیا ہو۔

اس مسئلہ سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ خمس کا مسئلہ صرف اسی صورت میں ہے جب جہاد اذن امام کے ساتھ شروع کیا جائے ورنہ سارا مال بحق سرکار امام ضبط کر لیا جائیگا اور سپاہیوں کو ہاتھ لگانے کا بھی کوئی حق نہ ہوگا اور اسی تفریق سے دین اسلام نے مسلمانوں کو امام کی عظمت سے آشنا بنانا چاہا ہے کہ اذن امام کے بغیر نہ جہاد جہاد کہے جانے کے قابل ہے اور نہ غنیمت غنیمت کہے جانے کے لائق ہے۔

امام عالم انسانیت کی ایک فرد ہوتا ہے لیکن یہ فرد اس قدر عظیم ہوتا ہے کہ سارا عالم انسانیت مصرف ہوتا ہے اور وہ ایک انسان ایک ظرف ہوتا ہے۔ اس کے تصرفات میں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن باقی سب کے تصرفات اس کی اجازت کے بغیر بالکل بے معنی اور مہمل ہیں۔

۲۱۔ ضمانت بقائے دین

اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خمس میں پروردگار کا حصہ دار ہونا اس امر کی علامت ہے کہ یہ کسی شخص کا شخصی مال نہیں ہے ورنہ پروردگار کو نہ لباس کی ضرورت ہے اور نہ غذا و مکان کی۔ اس کی نگاہ میں صرف ایک مسئلہ ہے کہ اس کا دین باقی رہے اور عالم انسانیت کی ہدایت و تبلیغ کا بندوبست ہوتا رہے اور اسی ضرورت کے تحت اس نے اپنا حصہ قرار دیا ہے

تاکہ اس کا دین کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہ ہو اور اس دین کے پاس اپنا ذاتی بجٹ ہو جس سے اپنی بقا کا انتظام کرتا رہے، اور اس کا نشاط عمل متاثر نہ ہونے پائے۔

خمس در حقیقت بقائے دین کی اسی ضمانت کا نام ہے جس کے سہارے دین کا کاروبار ہر دور میں چلتا رہتا ہے ورنہ دین خدا کسی کے چندہ کا محتاج ہوتا ہے اور نہ اداروں کا۔ دینی مدارس چندہ وغیرہ کا دشمن خمس سے غفلت کی وجہ پیدا ہوا ہے ورنہ عالم اسلام روز اول سے خمس کی عظمت اور اہمیت سے آشنا رہتا تو دین خدا کسی سرمایہ دار یا دولت مند کی خیرات کا محتاج نہ ہوتا اور وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے فریضہ کو ادا کرتا رہتا۔

۲۲۔ ضمانت کارہائے علمی

جس طرح خمس کا حق اللہ ربِ حق کو بقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے اسی طرح حق نبیؐ و امامؑ اس امر کی علامت ہے کہ خمس تمام علمی اور تبلیغی کاموں کے لئے بہترین ضمانت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب نبیؐ اور امامؑ کو تمام مذہبی امور کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہے اور مذہبی امور میں سب سے اہم کام تبلیغ مذہب کا ہے اور تبلیغ مذہب کے لئے مواعظ و اجتماعات سے لے کر نشر و اشاعت تک تمام ضروری امور شامل ہیں تو نبیؐ اور امامؑ یہ سارے کام کس طرح انجام دیں گے جب کہ نبوت اور امامت کے عہدہ کے لئے دولت و ثروت کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ کفار و مشرکین کے اس مطالبہ کو شدت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے کہ قرآن کو مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا ہے اور قدرت نے صاف کہہ دیا ہے کہ رحمت الٰہی کا تقسیم کرنا بندوں کا کام نہیں ہے۔ پروردگار بہتر جانتا ہے کہ اپنے پیغام کو کہاں رکھے گا اور اپنے عہدہ کے لئے کس کا انتخاب کرے گا۔

خمس کا حق نبیؐ و امامؑ در حقیقت اسی سوال کا جواب ہے کہ قدرت نے انہیں ذمہ داریاں سپرد کی ہیں تو ان کے واسطے سرمایہ کا بھی انتظام کیا ہے اور اسی طرح خمس کے سہارے تمام علمی اور عملی کام انجام پا سکتے ہیں جس کا مشاہدہ دور حاضر میں آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ مراجع کرام کے ہاتھوں سے خمس کا اختیار سلب کر لیا جائے تو ایک رسالہ علمیہ کی اشاعت بھی مشکل ہو جائے۔

تبلیغی امور کی انجام دہی تو بعد کا مسئلہ ہے۔

آج ایک مرجع تقلید کے بجٹ میں صرف مسائل اور استفتاءات کے جوابات پر لاکھوں روپے صرف ہوتے ہیں تو اگر حق امام کا یہ سرمایہ نہ ہوتا تو قوم ناواقف حضرات جہالت کی موت مر جاتے اور انہیں مسائل شرعیہ کا علم بھی نہ ہو سکتا۔

خمس ملت جعفریہ کا وہ ذخیرہ ہے جس سے مذہب کے تمام علمی اور عملی کام انجام پا رہے ہیں اور دیگر مذاہب اس ذخیرہ سے محرومی کی بنا پر حکومتوں کا سہارا لے رہے ہیں اور اس طرح علماء اعلام کے حاکم شرع ہونے کے باوجود حکام کے غلام نظر آ رہے ہیں۔

۲۳۔ خزانہ حکومت اسلامی

اسلامی بیت المال کی تشکیل میں زکوٰۃ اور خمس دو اہم عناصر ہیں۔ لیکن دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ عوامی سرمایہ ہے۔ اس کے مستحقین اور مصارف طے ہیں اور اسلامی حکومت کو انہیں مصارف میں صرف کرنا ہے۔ حکومت کا کوئی کام ان مصارف سے باہر نکل جائے تو مال زکوٰۃ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے اور یہ مستحقین کے حقوق کا غصب شمار کیا جائے گا۔

لیکن خمس خالص سرکاری سرمایہ ہے جسے امام وقت کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اسلامی حکومت کی ہر ضرورت میں صرف کر سکتا ہے۔ اس کے اوپر زکوٰۃ کے آٹھ مصارف کی حد بندی نہیں ہے اور وہ ان حدود سے باہر بھی جا سکتا ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ حاکم منصبی اور سرکاری امور ہی میں خرچ کرے گا اور ذاتی ضروریات میں اس وقت تک صرف نہیں کر سکتا ہے جب تک اس کا تعلق سرکاری اور منصبی معاملات سے نہ ہو ورنہ اس طرح مذہبی اموال کی بربادی کا ایک نیا راستہ نکل آئے گا اور ہر شخص سرکار ہونے کا مدعی بن کر اپنے محل تعمیر کرے، شہر دیا کرے گا اور مذہب فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔

۲۴۔ عظمت مقام نیابت

خمس کا واقعی حق پروردگار کے بعد نبیؐ اور امامؑ کے لئے ہے لیکن غیبت امامؑ میں اسے

مجتہد جامع الشرائط یعنی نائب امام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جسے امامؑ نے نام سے بغیر صفات کے اعتبار سے نائب قرار دے دیا ہے اور یہی وہ انداز ہے جو روز اول سے قرآن مجید نے اختیار کیا ہے کہ وہ پہلے اوصاف و کمالات کا ذکر کرتا ہے اور اس کے بعد وقت آنے پر شخصیت کی تعیین کر دیتا ہے۔

دور آدمؑ سے ہر دور میں سرکار دو عالمؐ کے اوصاف کا تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد جب جناب عیسیٰؑ کا دور آیا تو انھوں نے نام کا اشارہ دینا شروع کر دیا اور لفظ "احمد" کا تذکرہ کر دیا۔ اس کے بعد جب سرکارؐ پیدا ہو گئے تو قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا "محمد رسول اللہ"۔

یہی طریقہ سرکار دو عالمؐ کی زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ پہلے صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے بعد شخصیت کی تعیین کر دی گئی ہے۔ دعوت ذوالعشیرہ میں پہلے کام اور صفات کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا گیا کہ یہ میرا وصی، وزیر، خلیفہ اور جانشین ہے۔ تاکہ انسانیت اس اسلوب سے مانوس ہو جائے اور وقت آنے پر کوئی حیرت و استعجاب نہ پیدا ہو۔

امام عصرؑ نے دور غیبت صغریٰ میں افراد کا تعین کر کے ان کی صفات کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ نیابت کے لئے اس قسم کے پاک طینت افراد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جب غیبت کبریٰ کا آغاز ہوا تو عمومی صفات کا اعلان کر دیا گیا تاکہ انھیں صفات کی روشنی میں ہر دور میں نام و شخصیت کی تعیین ہوتی رہے اور کسی طرح کا فتنہ و فساد نہ پیدا ہونے پائے اس امانت کے بھی دو پہلو تھے۔ ایک دین کی حفاظت اور دوسرے، مولا امامؑ میں تصرف جن کے ذریعہ حفاظت دین کا فریضہ انجام دیا جائے گا۔

دین کی حفاظت بھی نائب امامؑ کی حیثیت کے اعلان کے لئے ایک اہم شئی ہے لیکن اس کا اصول فرائض سے ہے اور فرائض میں ہر شخص کو حسب حیثیت شریک کیا جا سکتا ہے لیکن مولا امامؑ میں تصرف حقوق کا مسئلہ ہے اور حقوق کے بارے میں یہ بات عام کا شرف حاصل نہ رہا ہو وہ مرتبہ ہے جس کی کسی طرح تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گویا امام اس کے ہر تصرف سے راضی ہے اور اس کے تصرف کو اپنا تصرف تصور کرتا ہے جس طرح کہ پروردگار نے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار دیا ہے۔

اور اس طرح رسول اکرمؐ کی بے پناہ عظمت کا اعلان ہو گیا ہے۔

۲۵۔ تحریک اعلمیت

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی دور میں ان صفات کے حامل متعدد افراد پیدا ہو جائیں جنھیں امامؑ نے نیابت عام کے لئے ضروری قرار دیا ہے تو اس وقت نیابت کے فرائض کون انجام دے گا؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ کام تمام افراد کے حوالے کر دیا جائے گا تو یہ کام کی بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اہل علم کے درمیان فکری اختلافات اہلیت کا خاصہ ہے، اور اس طرح ہر شخص نظام کو اپنے افکار کے مطابق چلانا چاہے گا اور نظام بکھر کر رہ جائے گا۔

ایسے مواقع پر عقل کا قطعی فیصلہ ہے کہ یہ کام سب سے بہتر فرد کے حوالے کر دیا جائے اور اسی کی فکر و نظر کو معتبر قرار دے دیا جائے تاکہ نظام زندگی برقرار رہے اور قانون اسلام منتشر نہ ہونے پائے۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بہت سے تمام کام مجتہد اعلم کے حوالے ہوں گے اور باقی افراد اس کے زیر سایہ کام کریں گے۔

اب اگر کسی شخص کو نیابت امامؑ کا شرف حاصل کرنا ہے تو اسے علمی میدان میں مجاہدات کرنا پڑیں گے تاکہ اعلمیت کا درجہ حاصل کر کے نیابت امامؑ کا شرف حاصل کر سکے اور اس طرح یہ تحریک اعلمیت بھی ہے جو اعلمیت کی تعیین بھی کرتی ہے، اور لوگوں میں اعلم پیدا کرنے اور تلاش کرنے کا ذوق بھی پیدا کرتی ہے جس کے بعد غیبت کے بقائے عدم اعلمیت کی بھی ضمانت مل جاتی ہے اور جس کا عظیم ترین تاریخی کارنامہ ہے جس سے بالاتر کوئی کارنامہ نہیں ہو سکتا ہے۔

رب کریم اس سلسلہ کو برقرار رکھے اور یہ امت اسلامیہ کو مجتہدین کرام اور اعلم وقت کے علم و برکات سے استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا رہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

جہاد

جہاد کے معنی ہیں کسی کے تحفظ میں اپنی پوری طاقت کو صرف کر دینا۔

یہ جہاد عام طور سے دین کے تحفظ کی راہ میں ہوتا ہے اور اسی لئے جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

اس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور یہ قسمیں درحقیقت ان طاقتوں کے اعتبار سے ہوتی ہیں جنہیں دین کے تحفظ کی راہ میں صرف کیا جاتا ہے۔

جہاد تلوار کے ذریعہ ہوتا ہے تو اسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے اور زبان کے ... ہے تو اسے جہاد باللسان کہا جاتا ہے۔

قلم کے جہاد کا نام جہاد بالقلم ہے اور نفس کے جہاد کا نام جہاد بالنفس۔

جہاد کی ایک تقسیم دشمن کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے کہ یہ جہاد اگر کسی کھلے ... مقابلہ میں ہے تو اسے جہاد اصغر کہا جاتا ہے اور اگر چھپے ہوئے دشمن کے مقابلہ ... مقابلہ تو کیا احساس بھی مشکل ہے تو اسے جہاد مع النفس کہا جاتا ہے اور یہی ... جہاد کی سب سے بڑی اور مشکل ترین قسم ہے جسے جہاد اکبر کا نام دیا گیا ہے۔

جہاد ... اور ... کے اعتبار سے بھی مختلف قسموں کا ہوتا ہے۔

کبھی یہ جہاد ابتدائی طور پر دعوت اسلام یا توسیع مملکت اسلامی کے ... اور کبھی اس سے ... میں دشمن کے حملوں یا اس کے ... کا جواب دیا جاتا ہے ... ان تمام قسموں کے الگ الگ احکام اور شرائط ہیں جن کا تذکرہ فقہ کی کتابوں ... ور جہاد کے امتیازات کے ذیل میں ان خصوصیات کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔

سرِ دست جہاد کے ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو کسی کتاب یا رسالہ میں مذکور نہیں ہیں لیکن قرآن مجید کے مختلف آیات و معصومینؑ کے متعدد ارشادات اور فقہ کے گوناگوں احکام و تعلیمات سے ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عظیم ترین میدان عمل

اسلام ایک دین عمل ہے جو کسی طرح کی بھی بے عملی یا بدعملی کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اس کا ماننے والا سراپا عمل رہے اور زندگی کا کوئی ایک موڑ بھی عمل ... نہ کرے۔

اس نے عبادات اور معاملات، واجبات اور مستحبات کی اتنی طویل فہرست مرتب کر دی ہے جس کے بعد انسان کا ایک لمحہ بھی بے عملی کا شکار نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی نظر میں بھی جہاد سے بالاتر کوئی میدان عمل نہیں ہے جیسا کہ سرکار دو عالمؐ نے شہادت کے فضائل کے ذیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ "ہر عمل سے بالاتر کوئی عمل ہے لیکن ... شہادت سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے" اور ظاہر ہے کہ یہ شہادت کا میدان میدان جہاد کے علاوہ کوئی دوسرا میدان نہیں ہے ... میدان جہاد سے دور رہے گا تو اس کے مقدر میں شہادت نہیں ہے۔ شہادت کے لئے ... میدان عمل میں قدم رکھنا بہرحال ضروری ہے چاہے وہ میدان عمل خانہ خدا ... کیوں ... اسی لئے کہ اسلام نے میدان جہاد کا کوئی مختصر فریم مرتب نہیں کیا ہے۔ اس کی نظر میں جب ... مقابلہ ہو جائے اور دین کے تحفظ کے لئے قربانیوں کو قربان کر دیا جائے اسی کا نام جہاد ہے اور اسی لئے مسجد کے مرکزی مقام کو محراب کہا جاتا ہے جہاں انسان اور شیطان ... معرکہ جاری رہتا ہے۔ کبھی شیطان اپنی اصلی شکل میں "یوسوس فی صدور الناس" کا کام دیتا ہے اور کبھی انسانی شکل میں حرکت کر کے مسجدوں کو ویران بنانے کا اہتمام ... ہے ... بندہ خدا دونوں محاذوں پر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور ... ان کے ... پر اثر انداز ہوتا ہے اور دشمن کا عمل آبادی مساجد کو روک پاتا ہے اور وہ اپنے ...

اسلام میں شہداء محراب کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ میدانِ جہاد صرف بدر و احد و خیبر و خندق کا معرکہ کارزار نہیں ہے بلکہ اس میں مسجد کوفہ کی محراب بھی شامل ہے جہاں زخمی ہونے والا اس جنگ میں اپنی کامیابی کا خود اعلان کرتا ہے "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَة"

۲۔ وسیلہ بقائے دین

اسلام کے جملہ عبادات تہذیب اخلاق، تزکیۂ نفس اور بندگی و عبودیت کا وسیلہ و ذریعہ ہیں لیکن جہاد اصل دین کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔

نماز روزہ کے ترک کر دینے سے انسان کی شانِ عبدیت، اشرفِ نفس اور طلبِ انسانیت مجروح ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی اثر دین کی بقا پر نہیں پڑتا ہے اور دین اپنے مقام پر محفوظ رہتا ہے اس لئے کہ ان موارد پر شیطان کا حملہ دینداری پر ہوتا ہے، دین پر نہیں۔ لہٰذا اگر انسان نے مقابلہ کر لیا اور مقابلہ میں کامیابی حاصل کر لی تو دینداری بھی محفوظ رہ جائے گی ورنہ دین تو بہرحال محفوظ رہے گا۔

لیکن میدانِ جہاد میں دشمن کا حملہ اصل دین پر ہوتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا، رسول اور دین کو فنا کر دیا جائے تاکہ دین بھی فنا ہو جائے اور اس کا کوئی زندہ رکھنے والا نہ رہ جائے لہٰذا ایسے مقام پر اگر انسان میدان سے فرار کر جائے تو گویا کہ اسے دین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس نے میدان خالی چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یہاں جان کی قربانی کو بھی واجب بنا دیا ہے جب کہ دیگر مقامات پر تقیہ کا حکم دیا ہے اور اسے ایک فریضہ کی شکل دے دی ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی مقام پر آپ کی نماز سے آپ کے لئے خطرہ ہے تو آپ اس وقت نماز ترک کر دیں اور اپنی جان بچا لیں۔

اگر روزہ سے آپ کی صحت خطرہ میں ہے تو آپ روزہ کو ترک کر دیں اور صحت کا تحفظ کریں۔

اگر حج بیت اللہ کے سفر میں زندگی خطرہ میں دکھائی دیتی ہے تو آپ حج کو ترک

کر دیں اور زندگی کا تحفظ کریں۔

لیکن میدان جہاد میں جان کا خطرہ یقینی بھی ہے تو قربانی پیش کریں۔ اس لئے کہ یہاں مسئلہ آپ کے عمل اور آپ کی عبادت کا نہیں ہے بلکہ یہاں مسئلہ اصل اسلام کے عمل اور اس کی عبادت کا ہے لہٰذا اس مقام پر کسی قسم کا تقیہ اور بچاؤ جائز نہیں ہے۔ یہاں ہر طرح کی قربانی ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے

۳۔ حوصلہ قربانی

انسانی دنیا کا کوئی عظیم کام اس وقت تک انجام نہیں دیا جا سکتا ہے جب تک اس میں جذبۂ قربانی نہ ہو۔ جذبۂ قربانی انسانی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

جذبۂ قربانی مال کی منزل میں کام کرے تو کارِ خیر کے پروجیکٹ معرضِ عمل میں آ جاتے ہیں اور یہی جذبہ وقت اور محنت کی منزل میں کام کرے تو بڑے سے بڑا مرحلہ بھی آسان ہو جاتا ہے اور جب یہ حوصلہ قربانی ہی انسانی زندگی کا عظیم ترین سرمایہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ جذبہ میدان جہاد سے زیادہ کسی منزل پر نمایاں نہیں ہوتا ہے اور اس کی تربیت کا اس سے بہتر کوئی میدان نہیں ہے۔ زندگی کے ہر کام میں کسی ایک شعبہ کی قربانی کی تربیت ہوتی ہے۔

نماز میں وقت اور بعض عبادات میں دیگر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

روزہ میں بھوک پیاس کی قربانی دینا ہوتی ہے۔

حج میں سرمایہ اور جسمانی توانائی کو قربان کرنا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ و خمس میں مال قربان کیا جاتا ہے۔

لیکن میدان جہاد میں اپنا وجود داؤ پر لگا دیا جاتا ہے اور انسان دین کی راہ میں زندگی جیسے عظیم ترین سرمایہ کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو جہاد کی عظمت کا عظیم ترین شاہکار ہے۔

۴۔ قومی سرمایہ کی فراہمی

اگرچہ جہاد دین و شعائر دین کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اور اس کا کوئی تعلق مال و دولت سے نہیں

ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نے طالبِ دنیا کے جہاد کی مذمت بھی کی ہے اور ان کے ثواب کی ضمانت کو اپنے دامن میں قیامت تک کے لئے محفوظ بھی کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دشمن کو سزا دینے کے لئے اور اس کے حوصلوں کو پست بنانے کے لئے مالِ غنیمت کا مسئلہ ضروری تھا۔ ورنہ کفار ہر جنگ کی شکست کے بعد دوسری جنگ کا ارادہ کر لیتے اور اسلام کو کبھی ان کے حملوں سے نجات مشکل تھی۔

اسلام نے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے دشمن کے اموال کی ضبطی کا اعلان کر دیا اور سے مالِ غنیمت قرار دے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا یا اسلامی بیت المال میں شامل کر دیا، کہ مسلمان لشکر کے دفاع کے لئے سرمایہ کے مالک ہو جائیں اور دشمن کو دوبارہ حملہ کرنے کے لئے از سرِ نو تیاری کرنا پڑے اور اس طرح جہاد اسلامی اقتصاد کا ایک در بن گیا ہے اور اس کے محصولات قومی سرمایہ میں شامل ہو گئے ہیں کہ مالِ غنیمت کسی ایک آدمی کی انفرادی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کے چار حصے مجاہدین راہِ خدا کے لئے ہیں اور ایک حصہ سرکاری بیت المال کے لئے ہے جو عام قومی اور مذہبی ضروریات پر صرف کیا جائے گا اور اس طرح جہاد قومی سرمایہ کی فراہمی کا ایک بہترین وسیلہ ہو جائے گا۔

۵۔ مظہرِ سیاستِ اسلام

عام طور سے جنگ و صلح کو سیاسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے حیاتِ پیغمبر کو بشریت اور رسالت کے دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے تمام عبادات کو رسالت سے متعلق کر دیا ہے اور تمام سیاسیات کو بشریت سے تاکہ عبادات میں اطاعتِ پیغمبر واجب رہے اور سیاسیات میں انسان آزاد ہو جائے اور جو موقف چاہے اختیار کرے اور اس طرح جہاد سیاسیات کا ایک شعبہ ہو گیا ہے۔

یہ تقسیم بنیادی اعتبار سے صحیح ہو یا نہ ہو۔ جہاد اسلامی سیاست کا بہترین مظہر ضرور ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ دشمن جیسے میدانِ جنگ میں قدم رکھتا ہے تو پہلی طاقت کا دو ڈھول بجاتا ہے۔ اس کے مظاہرِ طاقت

کے مظاہرے مجبور ہوتا ہے تو صلح و آشتی کی گفتگو شروع کرتا ہے جیسا کہ اسلام کی تاریخ میں نمایاں طور سے دیکھا گیا ہے کہ ابتداء میں قافلۂ تجارت کے صحیح و سالم نکل جانے کے بعد بھی اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لئے میدانِ بدر میں پڑاؤ ڈال دیا گیا اور اس کے بعد بدر، احد اور خندق میں طاقت کا مظاہرہ کیا گیا لیکن جب کل کفر کا بھی خاتمہ ہو گیا تو حدیبیہ کی منزل میں صلح کے لئے تیار ہو گئے اور تلخ کڑوی تعریفات کو بھی تسلیم کر لیا۔

اسلام کا نظامِ سیاست اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ پہلے انسان کو فکر و نظر اور صلح و آشتی کا پیغام دیتا ہے اور اس راہ میں پتھروں کے تیروں، عورتوں کے کانٹوں اور زہر آلود کے حملوں کو بھی برداشت کرتا ہے لیکن اس کے بعد جب دشمن کا غرور کم نہیں ہوتا ہے اور اس کا دماغ ناقابلِ علاج حد تک خراب ہو جاتا ہے تو میدان میں قدم جما دیتا ہے اور ۳۱۳ نہتے سپاہیوں کے ساتھ بھی ۱۰۰۰ افراد کے مسلح لشکر کا صفایا کر دیتا ہے اور کفر کو ... کی نابودی سے ... کر عورتوں اور بچوں کی اسیری کی ذلت آمیز سزا دینے میں کوئی تکلف نہیں کرتا ہے۔

۶۔ اسلامی اخلاق

عام طور سے جنگ کے میدان کو اخلاقی میدان سے الگ ایک میدان تصور کیا جاتا ہے جہاں ہر طرح کی دھوکہ بازی، غارت گری، حیلہ سازی اور تباہ کاری جائز ہو جاتی ہے اور کسی طرح کا کوئی اخلاقی قانون قابلِ عمل نہیں رہ جاتا ہے۔

لیکن اسلام نے اس منزل پر بھی ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے جہاد کو اپنے اخلاقیات کا بہترین مظہر بنا دیا ہے۔

مثال کے طور پر جہاد کے حسبِ ذیل قوانین پر نگاہ کی جائے:

۱۔ جہاد کے آغاز کے لئے امام معصوم یا اس کے نائب خاص کی ضرورت ہے۔

۲۔ نابینا، زمین گیر، بیمار، عاجز اور فقیر افراد پر جہاد واجب نہیں ہے۔

۳۔ ماں باپ میدان سے روک دیں اور جہاد واجب عینی نہ ہو تو ماں باپ کی اطاعت ضروری ہے۔

۴۔ محترم مہینوں میں جہاد حرام ہے۔
۵۔ پہلے اسلام کے محاسن کی دعوت دی جائے۔
۶۔ درختوں کا کاٹنا، دشمن پر آگ برسانا مکروہ ہے بلکہ پانی کا رخ موڑ دینا یا زہریلی گیس وغیرہ کا استعمال کرنا بھی مکروہ ہے۔
۷۔ عورتوں اور بچوں کو سپر بنا لیا جائے تو ان پر بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے جب تک کہ کوئی مجبوری درپیش آجائے۔
۸۔ بوڑھوں اور نابالغ بچوں کو قتل نہ کیا جائے اور عورتوں پر بھی حملہ نہ کیا جائے۔
۹۔ دشمن پناہ مانگے تو پناہ دے دی جائے اور جنگ روک دی جائے۔
۱۰۔ جنگ کے خاتمہ پر جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا ہے انھیں کسی ناپاک غرض یا بے دردی سے قتل نہ کیا جائے۔

ان مسائل سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے جہاد کو بھی اخلاقی تعلیم کا بہترین مدرسہ اور اپنے اخلاقیات کا بہترین مظہر اور نمونہ قرار دیا ہے جس کے بعد اسلام کا جہاد دنیا کے جنگ و جدل سے بالکل مختلف ہو گیا ہے اور دونوں میں کوئی نسبت نہیں رہ گئی ہے۔

۷۔ اشتغال قویٰ

اسلام کا منشا یہ ہے کہ انسان کی ساری طاقتیں راہ خدا میں صرف ہوں اور اس کی ایک نظر بھی پروردگار کے خلاف نہ اٹھے۔ وہ طاقت کے راہ خدا کے خلاف استعمال کو خیانت تصور کرتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ رسول اکرمؐ کی امت سراپا عبادت بن جائے۔ اس نے اپنے عبادت کے ذریعہ انسان کی طاقتوں کو راہ خدا میں صرف کرنے کی راہ دکھائی ہے۔

قامت نماز میں پیروں کو قیام پر آمادہ کیا ہے۔
کمر کو رکوع میں جھکا دیا ہے۔
زبان کو ذکر میں مصروف کر دیا ہے۔

اعضاء سجدہ کو سجدہ میں لگا دیا ہے۔
نظر کی جگہیں معین کر دی ہیں۔
ہاتھ رکھنے یا اٹھانے کے مواقع مقرر کر دئے ہیں اور اس طرح انسان کو سراپا عبادت بنا دیا ہے۔ لیکن یہ عمل لمحاتی ہے اور اس میں صرف وجودی طاقت کو مصروف کیا گیا ہے۔

جہاد کا فلسفہ اس سے زیادہ دقیق تر ہے۔ جہاد نے اپنے تمام مراحل کے ذریعہ تحریر، تقریر، تفکیر، تفسیر، تعبیر، تکبیر، تخیر تمام صلاحیتوں کو راہ خدا میں مصروف کر دیا ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے عظیم ترین سرمایہ حیات کو مصروف کار بنا دیا ہے اور اس طرح جہاد تمام طاقتوں کے راہ خدا میں صرف کرنے کا نام ہو گیا ہے اور یہاں کسی قوت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

۸۔ تطہیر معاشرہ

دنیا کے سامنے عام اطبا کا متفقہ قانون علاج یہ ہے کہ جب تک بدن میں علاج کی صلاحیت رہتی ہے مرض کا علاج کیا جاتا ہے اور ہر حصہ بدن کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مرض ناقابل علاج ہو جاتا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مرض دیگر تمام اعضاء کی طرف بھی سرایت کر جائے گا تو فاسد عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے تاکہ دیگر اعضاء متاثر نہ ہونے پائیں اور زندگی تباہ نہ ہو، فاسد عضو سب کو برباد نہ کر ڈالے۔

اسلامی نظام میں اس کاٹ چھانٹ کو آپریشن سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ آپریشن کبھی انفرادی ہوتا ہے جب بیماری کسی ایک انسان کے اعضاء میں ہو اور کبھی آپریشن اجتماعی ہو جاتا ہے جب معاشرہ کے متعدد افراد فاسد ہو جاتے ہیں اور کوئی اصلاحی تحریک ان پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے، تبلیغ کا عمل بیکار ہو جاتا ہے، دعوت حق بے اثر ہو جاتی ہے اور یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ سماج کے دیگر سادہ افراد بھی اس بیماری کی لپیٹ میں آ جائیں گے اور فساد پورے معاشرہ میں پھیل جائے گا۔

اسلامی اصطلاح میں اجتماعی آپریشن ہی کو جہاد کہا جاتا ہے۔ جہاں انتہائی ماہر و معصوم طبیب کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ کوئی ایک چھوٹا سا عضو بھی ضرورت سے زیادہ نہ کٹنے پائے اور

کوئی ایک قطرۂ خون بھی ناحق نہ بہنے پائے۔ سماج فاسد عناصر سے پاک ہو جائے اور فاسد عناصر کو کم کرنے میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ انھیں بھی شکایت کرنے یا الزام لگانے کا موقع نہ مل سکے اور حتی الامکان خود ان سے بھی ان کے فاسد ہونے کا ثبوت یا عملی اقرار لے لیا جائے، اور اس کا بہترین راستہ یہ ہو کہ انھیں جنگ میں پہل کرنے کا موقع دے دیا جائے تا کہ ان کی طرف سے ان کی زیادتی، ظلم، تجاوز اور مفسدہ پروری کا اعتراف ہو جائے اور وہ کسی وقت بھی دین خدا کو متہم نہ کر سکیں۔

حیرت کی بات ہے کہ طبیب ہر وقت یہ عمل انجام دے کر جسم کو بربادی سے بچا لیتا ہے تو اسے خوش اخلاق اور شریف و کریم کہا جاتا ہے، اور اسلام یہی عمل انجام دے کر پورے معاشرہ کو تباہی سے بچا لیتا ہے تو اس پر ملک گیری اور توسیع پسندی کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔

درحقیقت یہ الزام جہاد سے ناواقفیت اور حکمت اسلام سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ اور دنیائے اصلاح میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

۹۔ افضل الاعمال

طلحہ بن شیبہ اور عباس اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ دونوں میں زیادہ بہتر شخصیت کس کی ہے۔

طلحہ نے کہا کہ میرا فضل یہ ہے کہ میرے پاس خانۂ کعبہ کی کنجیاں ہیں اور میں حرم خدا کا کلید بردار ہوں۔

عباس نے کہا کہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں اور اس طرح پروردگار کے مہمانوں کی ضیافت کا شرف مجھے حاصل ہے۔

اتنے میں حضرت علیؑ کا گزر ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا شرف تم دونوں سے زیادہ ہے کہ میں نے سب سے پہلے ایمان کا اعلان کیا ہے، اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے۔

مسئلہ مشکل تھا لہذا طے پایا کہ فیصلہ سرکار دو عالم کریں گے۔ تینوں افراد سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آپ نے فیصلہ وحی الٰہی کے حوالے کر دیا اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ:

"کیا تم لوگوں نے خانۂ کعبہ کی زیارت اور حاجیوں کی سقایت کو اس شخص کے اعمال کے برابر قرار دے دیا ہے جس نے خدا اور آخرت پر ایمان اختیار کیا ہے اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے۔ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے ہیں اور خدا ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔"

آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ جہاد راہ خدا کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ اس کے مقابلہ میں عمارت و سقایت کا نام لینا بھی ظلم ہے اور ایسا ظلم ہے جس کے بعد ہدایت کی توقع بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خانۂ خدا کی عمارت اور حجاج بیت اللہ کی مہمان نوازی ایک عظیم شرف ہے۔ لیکن جہاد کے مقابلہ میں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد پروردگار کی نگاہ میں افضل الاعمال ہے اور اس سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے۔

نماز کو جہاد کے مقابلہ میں خیر العمل اسی لئے کہا گیا ہے کہ جہاد عمل ہے اور نماز مقصد عمل۔ نماز جہاد کے لئے قائم نہیں کی جاتی ہے لیکن جہاد نماز کے قیام کے لئے انجام پاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ راہ خدا میں جہاد بہت بڑا عمل ہے لیکن تمام اعمال میں بہترین عمل نماز ہے اور جہاد کے اغراض و مقاصد میں بہترین عمل نماز ہے جس کی اہمیت کے پیش نظر مولائے کائنات نے صفین میں جہاد روک دیا تھا اور امام حسینؑ نے کربلا میں برستے تیروں میں صفیں قائم کر دی تھیں۔

۱۰۔ امید رحمت

سورۂ مبارکہ بقرہ آیت ۲۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال انجام دیئے اور راہ خدا میں جہاد بھی کیا درحقیقت یہی لوگ رحمت خدا کی امید رکھتے ہیں اور خدا غفور و رحیم ہے۔"

آیت سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ رحمت الٰہی کی امیدواری میں، تنہا ایمان

اور عمل صالح کی ہیں اور آخری مرحلہ جہاد راہ خدا کا ہے جو خود بھی ایمان کی ایک علامت اور عمل صالح کی ایک شکل ہے۔ لیکن اسے ایک مستقل حیثیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر ایمان کو کمال حاصل ہوتا ہے اور نہ عمل صالح کو۔

بھلا اس ایمان کی کیا حقیقت ہے جس میں انسان جان کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو اور وہ عمل صالح کیا ہے جس کے سامنے دین تباہ ہو رہا ہو اور اس میں تحفظ کا جذبہ نہ پیدا ہو۔

جہاد درحقیقت انہیں دونوں محاسن کا مجموعہ ہے جس میں سر میدان یہ اعلان ہوتا ہے کہ ایمان سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہے اور جب خطرہ میں پڑ جائے تو قربانی سے بالاتر کوئی عمل نہیں ہے۔

۱۱۔ وسیلۂ جنت

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے جب کہ ابھی پروردگار نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو دیکھا ہے اور نہ صابرین کو۔" (آل عمران - ۱۴۲)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جنت میں داخلہ کا بنیادی سبب جہاد اور صبر ہے اور صبر کا عظیم ترین مصداق جہاد ہے جہاں ہر طرح کی قربانی پر صبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور کسی طرح کی بے چینی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔

روایات میں اسی حقیقت کے پیش نظر جنت کو تلواروں کے زیر سایہ قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو متوجہ کر دیا گیا ہے کہ اگر وقتی نعمتوں سے محرومی بھی ہو گئی تو ابدی نعمتیں انتظار کر رہی ہیں اور انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی ہے۔

میدان کربلا میں اسی قرآنی حقیقت کا اظہار بار بار ہوتا رہا۔

شب عاشور امام حسینؑ نے اپنے رفیقوں سے فرمایا کہ نظر اٹھا کر دیکھو یہ جنت میں تمہاری منزلیں ہیں جہاں مسلسل تمہارا انتظار ہو رہا ہے اور یہ جنت تمہیں جیسے شفیق افراد کے لئے آراستہ کی گئی ہے۔

اور عصر عاشور فضائے کربلا میں یہ قرآنی آواز گونج رہی تھی:

"اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ تو ہم سے راضی ہے اور ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ ہمارے بندوں میں شامل ہو جا اور ہماری جنت میں داخل ہو جا۔"

اور یہ سارا کلام میدان جہاد میں انجام پا رہا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ باب جنت تک جانے کا قریب ترین راستہ میدان جہاد سے گزرتا ہے اور صراط شمشیر سے گزر جانے والے کو داخلہ جنت سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ہے۔

۱۲۔ امتحان محبت

"جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا۔ ہجرت کی اور راہ خدا میں اپنے مال اور نفس سے جہاد کیا اور رسول کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہی آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"
(انفال - ۷۲)

آیت کریمہ میں ایمان اور ہجرت کے ساتھ راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کو بھی محبت قرار دیا گیا ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان پہلا مسلمان ہو یا آخری۔ پیغمبر کے ساتھ ہجرت کرے یا تنہا، اس کے ایمان و ہجرت کو اس وقت تک بنیاد محبت نہیں بنایا جا سکتا ہے جب تک راہ خدا میں جان اور مال سے جہاد نہ کرے۔ جہاد سے بالاتر کوئی امتحان محبت نہیں ہے جہاں محبوب کی راہ میں ساری کائنات حیات قربان کر دی جاتی ہے اور انسان جلوۂ محبوب کے اشتیاق میں اپنے وجود سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

انگلیاں کاٹ لینا محبوب مجازی کے جلوہ کا اثر ہے اور گلا کٹا دینا محبوب حقیقی کے جمال لازوال کا اثر ہے۔

مصر کی عورتوں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد راہ خدا میں قربانی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اور جب انسان محبوب حقیقی کی راہ میں قربانی کے لئے نکل آتا ہے تو پروردگار اس کا پہلا انعام یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح خالق کی محبت اور مخلوق دونوں تک قائم ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ علامت ایمان حقیقی

"جن لوگوں نے ایمان اور ہجرت کا راستہ اختیار کیا اور راہ خدا میں جہاد کیا۔ پھر جنہوں نے پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ حقیقتاً یہی لوگ واقعی صاحبان ایمان ہیں کہ جن کے لئے مغفرت بھی ہے اور پاکیزہ رزق بھی"۔ (انفال۔ ۷۴)

آیت کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان حقیقی کا راستہ میدان جہاد سے ہو کر گذرتا ہے۔ اور انسان جب تک اس میدان میں قدم نہیں رکھتا ہے اس کا ایمان کامل نہیں ہوتا ہے۔

مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب نے میدان احد میں اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جب اکثر صحابہ کے فرار کر جانے کے بعد رسول اکرمؐ نے سوال کیا کہ یا علی! تم نے فرار کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔؟

عرض کی کہ کیا میں ایمان کے بعد کافر ہو جاؤں؟

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ میدان جہاد میں ثبات قدم بظاہر ایک عمل ہے لیکن واقعاً اس کا ایمان سے گہرا رشتہ ہے اور جب تک انسان کا ایمان سلامت رہتا ہے وہ دوجہاد میں قربانی سے دریغ نہیں کر سکتا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں کئی طرح کے جہاد کا ذکر کیا گیا ہے اور سب کو ایمان حقیقی کے شرائط میں شامل کر دیا گیا ہے۔

راہ خدا میں ہجرت کرنا اور اپنے گھر بار کو چھوڑ دینا یہ بھی ایک جہاد ہے اور مہاجرین کو پناہ دے کر دشمن کے حملوں کا ہدف بن جانا یہ بھی ایک جہاد ہے۔

لیکن اس کے باوجود جہاد کا الگ سے تذکرہ کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت اور نصرت جیسے جہاد سے الگ میدان جنگ کا جہاد ہے جس سے ایمان کو کمال درجہ حاصل ہوتا ہے اور انسان ایمان حقیقی کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ ضروری امتحان

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہیں اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا جب کہ ابھی خدا نے تم میں سے مجاہدین اور ان لوگوں کو نہیں دیکھا ہے جو خدا، رسول اور صاحبان ایمان کو چھوڑ کر کسی سے خفیہ دوستی نہیں کرتے ہیں"۔ (توبہ۔ ۱۶)

آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان کو منزل امتحان سے گذرنا ہے اور امتحان کے بغیر کسی کا ایمان قابل قبول نہیں ہے۔

سورہ عنکبوت میں اصل امتحان کی ضرورت کا اعلان ہوا ہے کہ ہم نے تم سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور تمہارا بھی امتحان لیں گے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں دعوائے ایمان کے اعتبار سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟"

اور سورہ بقرہ آیت ۱۵۵ میں ان سوالات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے ذریعہ امتحان لیا جائے گا۔ "ہم یقیناً تمہارا امتحان مختصر خوف بھوک اور جان، مال اور اولاد کی کمی کے ذریعہ لیں گے اور پھر ان صابرین کے لئے بشارت ہے جو مصیبت پڑنے پر یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے لئے پروردگار کی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اس کے بعد صرف یہ سوال باقی رہ گیا تھا کہ یہ امتحان کہاں ہوگا اور اس کا منظر کہاں ہے؟

سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا کہ یہ امتحان کا عظیم مرکز میدان جہاد ہے جہاں خوف کا عالم بھی ہوتا ہے اور بھوک بھی، جان و مال کا اتلاف بھی ہوتا ہے اور اولاد کی قربانی بھی۔ مرد مومن کا حوصلہ ہر قربانی کے بعد یہی ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں بھی اسی کی بارگاہ میں پلٹ کر جانا ہے۔ اور یہی ایمان اطمینان کی وہ منزل ہے جس کے بعد انسان اس امر کا حقدار ہو جاتا ہے کہ اس پر رحمت پروردگار کا نزول ہو اور وہ ہدایت یافتہ افراد میں شمار کیا جائے۔

۱۵۔ وجہ مغفرت

"اس کے بعد تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لئے جنہوں نے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بعد

ہجرت کی ہے اور پھر جہاد بھی کیا ہے اور صبر سے کام لیا ہے بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔" (نحل - ۱۱۰)

آیت کریمہ کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ جہاد، صبر و ہجرت وہ مراحل ہیں جن سے گذرنے کے بعد انسان مغفرت الٰہی کا حقدار بن جاتا ہے اور اس کی بخشش میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ان اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے ہجرت نہیں کی تھی اور فتنوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب ان کو ہوش آیا تو اپنی تقصیر پر توبہ کی اور ہجرت کا راستہ اختیار کر لیا۔ لیکن اگر صرف ہجرت ہوتی تو شاید ان کا گناہ قابل معافی نہ ہوتا۔ انھوں نے ہجرت کے بعد راہ خدا میں جہاد بھی کیا جو دلیل خلوص کامل تھا اور اسی اخلاص کی بنا پر پروردگار نے ان کے گناہ کو معاف کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ بڑے سے بڑا گناہ بھی جہاد کے طفیل میں معاف کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا تعلق حق العباد سے نہ ہو یا وہ بندے بھی معاف کر دیں جن کے حق میں ظلم ہوا ہے جس کی بہترین مثال کربلا کے میدان میں حضرت حر بن یزید ریاحی کے کردار میں پائی جاتی ہے کہ ان کی غلطی دو اجزاء سے مرکب تھی۔

۱۔ امام حسینؑ کا راستہ روکا تھا جو مسئلہ حق العباد سے متعلق تھا۔

۲۔ امر و حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی تھی جو مسئلہ حق اللہ کا تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ پروردگار اس وقت تک اپنے حقوق کو بھی معاف نہیں کرتا ہے جب تک انسان حق العباد کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو جائے۔ انھوں نے مصلے پر بیٹھ کر توبہ و استغفار کرنے کے بجائے امام حسینؑ کی بارگاہ میں حاضری دی اور ان سے معافی کے طلبگار ہوئے۔

امام حسینؑ بندۂ خدا بھی تھے اور نمائندۂ پروردگار بھی۔ لہذا انھوں نے فرمایا کہ حر سر کو اٹھاؤ تمہاری خطا کو میں نے بھی معاف کر دیا ہے اور میرے پروردگار نے بھی۔ اور اس طرح حر نے وہ راستہ اختیار کیا جہاں ایک ہی منزل پر دونوں مسائل حل ہو گئے اور مغفرت کا مکمل انتظام ہو گیا لیکن حر نے چاہا کہ اس اعلان معافی سے اگلی نسلوں کو غلط فہمی نہ ہو جائے کہ اس طرح بڑے سے بڑے جرم کے بعد بھی زبانی معذرت مغفرت کا ذریعہ بن سکتی ہے لہٰذا فوراً میدان جہاد کا اذن طلب کیا اور راہ خدا میں جہاد کر کے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کی عملی تفسیر کر دی کہ فتنوں میں

مبتلا ہونے والے بھی اگر جہاد کا راستہ اختیار کر لیں تو ان کے واسطے مغفرت بھی ہے اور مہربانی بھی اور پروردگار کے خزانے میں کسی شے کی کوئی کمی نہیں ہے۔

۱۶۔ دلیل صداقت

"وہ صاحبان ایمان جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور پھر کبھی شک نہیں کیا اور راہ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔"

(حجرات - ۱۵)

آیت کریمہ میں صداقت ایمان کے لئے جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایمان باللہ و رسول اور عدم شک لوازم ایمان میں شامل ہیں اور یہی ہر صاحب ایمان کا دعویٰ ہوتا ہے اور وہ قطعی شرط جس سے ایمان کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے وہ راہ خدا میں جہاد ہی ہے جس کے بغیر دعوائے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی بھی انسان صادق الایمان بننا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرے اور کسی طرح کی قربانی سے دریغ نہ کرے ورنہ قربانی کے بغیر کوئی دعوائے ایمان قابل قبول نہیں ہے اور پروردگار اس دعویٰ کو مسترد کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی شخص صرف دعوائے ایمان کر کے پیغمبر اسلام پر اس کا احسان جتلائے کہ ہمارے اسلام سے آپ کی محفل کی رونق ہے۔

قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اس دعویٰ کی تکذیب کر دی ہے کہ جو لوگ اپنے اسلام کا احسان جتاتے ہیں یہ تو خدا کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی هدایت دی ہے اور یہ تمہاری کمزوری ہے کہ تم ایمان کے بجائے صرف اسلام ہی پر رک گئے۔ ورنہ عقیدۂ ایمان تمہارے دلوں کے اندر اتر سکا اور ایمان دل کے اندر اتر گیا ہوتا تو اس طرح کے دعوے نہ کرتے اور راہ خدا میں جہاد سے دامن کش نہ ہوتے۔

۱۷۔ کراہت جہاد علامت نفاق

قرآن مجید نے جس طرح جہاد کو ایمان اور صداقت ایمان کی علامت

کراہت جہاد کو نفاق کی نشانی قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں جہاد سے کنارہ کشی کرنے والے زبانی دعوائے ایمان و اخلاص نہیں بلکہ وہ فی الحقیقت منافق ہیں۔ اگرچہ انھوں نے عملی کمزوری کا اظہار کیا ہے لیکن یہ عملی کمزوری اعتقادی کمزوری کی نشانی ہے کہ جہاد فرض ہو جانے کے باوجود اصول اعتقاد کی نقاب کشائی کے لئے کافی ہے۔

چنانچہ سورۂ مبارکہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"جو لوگ جنگ تبوک میں نہیں گئے، وہ رسول اللہ کے پیچھے بیٹھے رہ جانے پر خوش ہیں اور انھیں اپنے جان و مال سے راہِ خدا میں جہاد کرنا ناگوار معلوم ہوتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ گرمی میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔ اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ آتشِ جہنم اس سے کہیں زیادہ گرم ہے اگر یہ لوگ کچھ سمجھنے والے ہیں۔"

آیت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جہاد کی ناگواری کی سزا آتشِ جہنم ہے اور اس سے بچانے کا واحد ذریعہ نفس و مال کی آنچ ہے۔ جو لوگ اس آنچ کو سہہ لیتے ہیں وہ اس آگ سے نجات حاصل کر لیتے ہیں، اور جو اس آنچ کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں انھیں وہ آگ پھر جہاں برداشت کرنا پڑے گی۔

۱۸۔ لایخافون لومۃ لائم

انسان کی سب کی بڑی نفسیاتی کمزوری یہ ہے کہ وہ کثیر اوقات ملامت کرنے والوں کی ملامت اور طعنہ دینے والوں کے طعن و طنز سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ واضح حقائق سے بھی انکار کر دیتا ہے اور ان کے پیچھے نفس حق کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے حالانکہ معمولی بات ہے کہ جو انسان نفسیاتی طور پر اس قدر کمزور ہو وہ دنیا میں کوئی عظیم کارنامہ نہیں دے سکتا ہے اور نہ کسی بڑے طوفان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ طوفانوں سے ٹکرانے سے پہلے طعن و طنز کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اس میدان میں قدم

تجربات اس بات کے گواہ ہیں کہ بڑے سے بڑے دوست کو بھی اگر دوست کے [illegible] طعنہ [illegible] لگا کر [illegible] غلام نظر آتے ہیں تو اس سے دوست کا ساتھ چھوڑ [illegible]

دشمنوں کا ساتھ دینا گوارا کرنے لگتا ہے۔ یہی حال کارِ خیر کا ہے کہ جہاں کسی نے کارِ خیر کو کارِ حماقت سے تعبیر کیا انسان نے کارِ خیر کو ترک کر دیا۔

قرآن مجید نے اسی کمزوری سے نجات پانے کا یہ نسخہ بیان کیا ہے کہ انسان راہِ خدا میں جہاد کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس کے بعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اثر نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جو شخص جان و مال کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے اس کے مقابلہ میں طعن و طنز کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

سورۂ مائدہ آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عنقریب خدا ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جو اس کی محبوب اور اس سے محبت کرنے والی ہوگی۔ مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے مقابلہ میں صاحبِ عزت ہوگی۔ راہِ خدا میں جہاد کرنے والی ہوگی، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوگی۔ یہ فضلِ خدا ہے جسے وہ جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے کہ وہ صاحبِ وسعت بھی ہے اور علیم و دانا بھی ہے۔"

۱۹۔ ماموریت نبوت

اصطلاح شریعت میں نبی اس انسان کو کہا جاتا ہے جو پروردگار کی طرف سے براہ راست علم حاصل کرتا ہے اور پھر ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ پھر اسی نبی کو اگر پیغام رسانی کی ذمہ داری بھی سپرد کر دی جائے تو اسے لفظ رسول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن رسول ہونے کے بعد بھی اس کا کام صرف "ابلاغ المبین" اور واضح پیغام رسانی ہی ہوتا ہے اور وہ امت کے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔ قوم اگر گمراہ ہو جائے تو نبی اور رسول جواب دہ نہیں ہے اور امت اگر راہِ راست پر نہ آئے تو نبی کا فرض نہیں ہے کہ اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈال دے جیسا کہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاد پیغمبر کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور پروردگار نے سورۂ تحریم آیت ۹ میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ

"پیغمبر، کفار اور منافقین سے جہاد [illegible]

یہ بد ترین کام ہے۔"

جس سے واضح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ رسول کو صرف "ابلاغ المبین" تک محدود کر دیا گیا تو دین حد ناقابل عمل قرار دے دیا جائے گا اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے کہ انھیں جہاد نہیں کرنا ہے لہذا طاقت کے زور سے ان کے مشن کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ پروردگار نے فرما دیا کہ اگر دشمن طاقت کا اظہار کرنا چاہے تو آپ اس منزل پر بھی خاموش نہ رہیں اور ہر طرح کے جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ حد یہ ہے کہ آپ کے فرائض میں منافقین سے جہاد کرنا بھی شامل ہے جو آپ حالات کی نزاکت کی بنا پر انجام دے سکیں گے تو کسی ایسے شخص کو اپنا نائب مقرر کرنا ہوگا جو تاویل قرآن پر جہاد کر سکے اور دین کو کفار کی طرح منافقین کے حملوں سے بھی بچا سکے۔

۲۰۔ عظیم ترین وسیلۂ فلاح

سورۂ مائدہ آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس تک پہونچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شاید اسی طرح کامیابی حاصل کر سکو۔"

اس آیت میں صاحبان ایمان کو کامیابی کے لئے تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ اختیار کرنا۔ وسیلہ تلاش کرنا اور راہ خدا میں جہاد کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور واجب ہیں اور ان میں کسی ایک کا بھی فیصلہ کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تقویٰ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان تمام برائیوں سے پرہیز کرے اور تمام منکرات سے اجتناب کرے۔

وسیلہ تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو فراموش کر دے اور انھیں واسطہ قرار دے جن میں بارگاہ الٰہی تک پہونچانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جہاد بہرحال جہاد ہے۔

لیکن آیت کریمہ نے ترتیب وسائل میں جہاد کو سب سے آخر میں رکھا ہے جس کا مطلب

یہ ہے کہ انسان وسیلہ کے پالینے کے بعد مطمئن نہ ہو جائے کہ اب تو کامیابی زیر قدم آگئی ہے اور جنت نگاہوں کے سامنے ہے لہذا کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں یہ جہاد اب بھی لازم ہے اور جہاد کے بغیر منزل کامیابی تک پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ گویا یہیں کامیابی کا آخری وسیلہ ہے اور اسی پر فلاح کا دارومدار ہے۔

کربلا کے میدان میں جناب حُر کا کردار اس آیت مبارکہ کی بہترین تفسیر ہے کہ پہلے مرحلہ تقویٰ پر قدم رکھتے ہی یزیدی لشکر کی قیادت و ریاست سے کنارہ کشی کی۔ اس کے بعد امام حسینؑ کے خیمہ کی طرف تلاش وسیلہ میں نکل پڑے اور جب امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے تو فوراً اذن جہاد طلب کر لیا تاکہ انسان کو یہ خیال نہ پیدا ہو کہ امام حسینؑ کے مل جانے کے بعد جہاد کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے بلکہ اسے یہ احساس پیدا ہو کہ جہاد اسی وقت جہاد ہوتا ہے جب امام حسینؑ کے قدموں میں آنے کے بعد ہو ورنہ امامؑ سے الگ ہونے کے بعد جنگ کو غارت گری اور لوٹ مار کہا جا سکتا ہے جہاد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے شہادت نہیں ہوتا ہے۔

شہادت کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت ہے اور "فی سبیل اللہ" کا تعین امام وقت کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ جس کے راستہ کو قرآن مجید نے صراط مستقیم قرار دیا ہے اور جس پر حقیقی منعموں کا ذکر کر دیا ہے اور اسے ہر طرح کے غضب اور گمراہی سے بچایا ہے۔

۲۱۔ جہاد اور دولت

قرآن مجید نے سورہ مبارکہ توبہ آیت ۸۶ میں منافقین کے ایک نئے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

"جب کوئی سورہ نازل ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان کے صاحبان حیثیت آپ سے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں انھیں بیٹھنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔"

جس کا مطلب یہ ہے کہ منافق کے سامنے جب شہادت اور دولت میں مقابلہ ہوتا ہے تو ہمیشہ دولت کو مقدم رکھتا ہے اور شہادت سے کنارہ کشی کرتا ہے اور مومن کے برخلاف

صاحبان ایمان ہمیشہ راہ خدا میں جہاد کے لئے تیار رہتے ہیں اور انہیں مال و دولت کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے۔"

گویا آیت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جہاد راہ خدا دولت کا ایک امتحان ہے، دولت کا وجود محبت الٰہی یا ایمان کی علامت نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا امتحان الٰہی ہے جس کے ذریعہ اخلاص اور نفاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور صاحبان ایمان و اخلاص کو الگ کیا جاتا ہے۔

۲۲۔ عظیم ترین محبوب

سورۂ مبارکۂ توبہ کی آیت ۲۴ میں اعلان ہوتا ہے کہ:

"پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، برادران، ازواج، عشیرہ و قبیلہ اور وہ اموال جنہیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارہ کی طرف سے فکر مند رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں پسند کرتے ہو تمہاری نگاہوں میں اللہ، اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہاں تک کہ امر الٰہی آجائے اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔"

آیت کریمہ میں جہاں تک اللہ اور رسول کے مذکورہ امور سے زیادہ محبوب ہونے کا تعلق ہے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔

دنیا کی کون سی نعمت یا دولت ہے جسے خدا اور رسول سے بالاتر قرار دیا جا سکتا ہو کہ اس کے محبوب تر ہونے کا تصور کیا جا سکے۔ باپ دادا، اولاد، برادران، عشیرہ و قبیلہ سب پروردگار کی مخلوقات ہیں اور اموال و تجارت و مکانات سب اسی کے عطایا ہیں اور وہ کوئی شے رسول سے الگ کر کے عطا کرتا ہے اور نہ اس نے کسی شے کو اس سے بے نیاز بنا کے پیدا کیا ہے۔ اس نے اپنے حبیب کو صاحب لولاک بنا کر تمام کائنات کو اس کا طفیلی یا صدقہ بنا دیا ہے۔ وہ جب اس کے سامنے کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن خدا اور رسول کے ساتھ جہاد راہ خدا کا تذکرہ حیرت انگیز ضرور ہے۔

گویا نگاہ پروردگار میں جو محبوبیت خود اسے یا اس کے رسول کو حاصل ہے وہی محبوبیت

اس کی راہ میں جہاد کو حاصل ہے اور کسی انسان نے کسی بھی شے کو اگر جہاد سے زیادہ محبوب تر قرار دے دیا تو اسے امر الٰہی کا انتظار کرنا چاہیے اور ہلاکت و تباہی و بربادی کے لئے آمادہ رہنا چاہیے۔ جہاد راہ خدا کو ترک کر دینے کے بعد کسی شے سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے لہٰذا کسی شے کو اس سے زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہیے۔

۲۳۔ بنیاد فضیلت

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کائنات کی بنیاد فرق و امتیاز اور برتری پر نہیں ہے بلکہ یہ کائنات سراپا امتیاز اور برتری ہے اور پروردگار نے ہر شے کو ایک مخصوص امتیاز کا حامل بنایا ہے جو دوسری اشیاء کو حاصل نہیں ہے۔ انسان کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں اور یہ صفت انبیاء و مرسلین کے سلسلہ سے خاندانوں پروردگار نے رکھی ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ انسانی دنیا میں فضیلت کا معیار کیا ہے؟

قرآن مجید نے تین معیاروں کی طرف اشارہ کیا ہے: ایمان، علم اور تقویٰ۔ لیکن ان تینوں کے پیدا ہو جانے کے بعد بھی انسان صرف مومن، متقی اور جاہل سے بہتر ہو جاتا ہے بلکہ ایک میدان بہرحال باقی رہ جاتا ہے جو صاحبان ایمان کے درمیان برتری کا تعین کرتا ہے اور ان میں سے ایک کو دوسرے سے افضل قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"معذور افراد کے علاوہ گھر میں بیٹھ رہنے والے صاحبان ایمان ہرگز ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے ہیں جو راہ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر امتیاز عنایت کیا ہے اور سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔" (نساء ۔ ۹۵)

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جہاد سے بالاتر کوئی بنیاد فضیلت نہیں ہے اور صاحبان ایمان کے درمیان فضیلت کا فیصلہ جہاد ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

۲۴۔ مقصد امتحان و اختبار

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ یہ دنیا دار امتحان ہے

ذریعے سے ہر شخص کو آزمایا جائے گا۔ پہلے والوں کا امتحان ہو چکا ہے اور بعد والوں کا امتحان باقی ہے۔ مختلف مسائل حیات و مشاکل زندگی ہیں جن کے ذریعہ ان کو آزمایا جائے گا اور اس کا امتحان لیا جائے گا۔

امتحان سے انبیاء و مرسلین کو مستثنیٰ نہیں رکھا گیا ہے۔ اور انہیں شدید امتحان میں ڈال دیا گیا ہے تو دیگر افراد کا کیا تذکرہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام امتحانات کی غرض و غایت اور ان کا مقصد و مطلوب کیا ہے؟

بعض آیات میں صداقت ایمان کا نام دیا گیا ہے کہ امتحان کے ذریعہ دعوائے ایمان کے سچے اور جھوٹے افراد کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صادق الایمان افراد کون ہیں جنہیں دوسرے افراد سے الگ کرنے کے لئے تمام زندگی کو سراپا امتحان بنا دیا گیا ہے؟

اس حقیقت کا اعلان سورۂ محمد آیت ۳۱ میں ہوا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم یقیناً تمہارا امتحان لیں گے تاکہ یہ دیکھیں کہ تم میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون لوگ ہیں اور اسی طرح تمہارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں"

جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جہاد اور صبر دو بلند ترین مراتب ہیں جن کے لئے ساری زندگی کو سراپا امتحان بنا دیا گیا ہے اور پروردگار یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ہمارے بندوں میں مجاہدین کتنے ہیں کہ یہی ہمارے محبوب ہیں اور انہیں کے ذریعہ ہمارے دین کا قیام اور بقا ہے۔ اس کے علاوہ تمام افراد ہمارے دستر خوان کرم کے زلہ ربا ہیں اور کچھ نہیں ہیں۔

۲۵۔ ترک جہاد سرمایۂ حسرت

بعض افراد کا یہ خیال ہے کہ جہاد راہ خدا میں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہے۔ انسان مختصر سی زندگی کو بھی گنوا دیتا ہے اور اسے گردن کٹا دینے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے اس کے برخلاف جو لوگ جہاد میں شرکت نہیں کرتے ہیں ان کی زندگی بھی محفوظ رہتی ہے اور ان کے مال و اسباب کو بھی کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے سب کچھ نگاہ کے سامنے رہتا ہے اور عیش و آرام کی زندگی گذر رہی ہے

یہی بات ہر دور کے منافقین کہا کرتے ہیں اور مجاہدین راہ خدا کو کہتے رہتے ہیں اور جب کوئی میدان جہاد میں کام آ گیا تو اس کے گھر والوں کو یہ کہہ کر تعزیت پیش کرتے ہیں کہ اگر ہماری بات

مان لیتے اور ہمارے ساتھ گھر میں بیٹھے رہتے تو یہ انجام نہ ہوتا اور اس طرح گھر کی بربادی نہ ہوتی۔ جو درحقیقت تعزیت نہیں طعنہ زنی اور ملامت ہے۔

لیکن قرآن مجید نے اس منحوس صورت حال کے مقابلہ میں ایک نئے مستقبل کی نشاندہی کی ہے کہ یہ ساری مکاری چند روزہ ہے وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ جب یہ پیچھے رہ جانے والے گنوار آپ سے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور اولاد نے ہمیں مصروف کر لیا تھا لہٰذا آپ ہمارے حق میں استغفار کر دیں۔ یہ اپنی زبان سے وہ کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا تمہیں نقصان پہونچانا چاہے یا فائدہ ہی پہونچانا چاہے تو کون ہے جو اس کے مقابلہ میں تمہارے امور کا اختیار رکھتا ہے؟ ..... اصل میں تمہارا خیال یہ تھا کہ رسول اور صاحبان ایمان اپنے گھر والوں تک پلٹ کر نہیں آ سکتے ہیں اور اس بات کو تمہارے دلوں میں خوب سجا دیا گیا تھا اور تم نے بدگمانی سے کام لیا تھا اور تم ہلاک ہو جانے والی قوم ہو" (فتح ۱۱ ۔ ۱۲)

آیت کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اولاً تو راہ خدا میں جہاد نہ کرنے والے پروردگار کی نگاہ میں مہذب، دانشور، روشن خیال اور صاحب تہذیب و ثقافت نہیں ہیں بلکہ اعراب اور گنوار کہے جانے کے قابل ہیں کہ جس شخص کے پاس چند روزہ متاع اور دائمی نعمتوں میں فرق کرنے کی صلاحیت نہ ہو اسے دانشور نہیں کہا جا سکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جہاد سے کنارہ کشی عاقبت کا راستہ نہیں ہے بلکہ سرمایۂ حسرت و ندامت ہے جس کے بعد انسان صرف طلب مغفرت ہی کرتا رہتا ہے۔ انسان اس حسرت و ندامت سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرے اور ایسا مستقبل حاصل کرے جس کے بارے میں قرآن مجید نے اعلان کیا ہے۔

"جو لوگ راہ خدا میں قتل ہوئے ہیں انہیں ہرگز مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور پروردگار کی بارگاہ میں رزق حاصل کر رہے ہیں۔ خدا کی طرف سے ملنے والے فضل و کرم سے خوش ہیں اور جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہو سکے ہیں ان کے بارے میں بھی یہ خوشخبری رکھتے ہیں کہ ان کے واسطے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ حزن۔ وہ اپنے پروردگار کی نعمت، اس کے فضل اور اس کے وعدہ سے خوش ہیں کہ وہ صاحبان ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے"

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

آیات و روایات کی زبان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) اسلام کے عظیم ترین واجبات میں شمار ہوتے ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں بھی شدید تاکید کی گئی ہے اور رسول اکرمؐ نے بھی اخبار غیب کے طور پر فرمایا تھا کہ اس وقت تمہارا کیا عالم ہوگا جب تمہاری عورتیں فاسد اور جوان فاسق ہو جائیں گے اور تم نہ نیکیوں کا حکم دوگے اور نہ برائیوں سے منع کروگے۔؟

لوگوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ کیا ایسا بھی ہونے والا ہے۔؟

فرمایا اس وقت کیا ہوگا جب تم برائیوں کا حکم دوگے اور نیکیوں سے منع کروگے۔؟

عرض کی کیا یہ بھی ہو سکتا ہے۔؟

فرمایا اس وقت کیا ہوگا کہ جب تمہاری نگاہ میں نیکیاں برائی بن جائیں گی اور برائیاں نیکیاں۔؟

روایت مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں عورتوں کے فساد اور نوجوانوں کے فسق کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظر انداز ہو جانے پر ہے اور اسی کے اسباب میں خود آپ و انکار کا فقدان بھی شامل ہے اور بدعملی و بدکرداری بھی۔

امام محمد باقرؑ نے امر و نہی کے فضائل اس انداز سے بیان فرمائے ہیں کہ "انھیں سے تمام فرائض کا قیام ہوتا ہے۔ راستے محفوظ ہوتے ہیں۔ روزی حلال ہوتی ہے۔ مظالم کی روک تھام ہوتی ہے۔ زمینیں آباد ہوتی ہیں، مظلوم کو انصاف ملتا ہے اور دنیا میں اس وقت تک خیر برقرار رہے گا جب تک امر و نہی کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ نیکیوں پر ایک دوسرے کی مدد کرتے

رہیں گے۔ ورنہ یہ برکتیں ختم ہو جائیں گی۔ لوگ ایک دوسرے کے سردار ہو جائیں گے اور زمین و آسمان میں کوئی کسی کا مددگار نہ رہ جائے گا۔"

امر و نہی اظہار بیزاری و ناراضگی کی حد تک واجب عینی ہے اور ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ اس کے بعد اگر طاقت کا استعمال کرنا پڑے تو صرف ان لوگوں کا فریضہ ہوگا جن کے پاس طاقت ہو اور جو جرائم کی روک تھام کر سکتے ہوں۔

واجبات اور محرمات کی منزل میں امر و نہی واجب ہے اور مستحبات و مکروہات کی منزل میں مستحب۔ لیکن یہ عمل باعث اجر و ثواب بہرحال ہے اور اس عمل میں دہرا ثواب ہے، نصیحت قبول کر لینے والے کو الگ ثواب ملتا ہے اور نصیحت کرنے والے کو الگ۔

شرائط

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مسئلہ انتہائی اہم ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے خطرناک بھی ہے لہٰذا شریعت نے اس کے لئے شرائط کی تعیین کر دی ہے تاکہ ہر کس و ناکس یہ کاروبار نہ شروع کر دے اور فساد کی روک تھام کسی نئے فساد کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

اس سلسلہ میں علماء کرام نے پانچ طرح کے شرائط کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ انسان معروف اور منکر کو پہچانتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ شوق تبلیغ میں منکرات کی ترویج شروع کر دے اور نیکیوں پر پابندی عائد کر دے کہ اس طرح سے شر نیکی کی صورت میں سامنے آ جائے گا۔

۲۔ امر و نہی میں تاثیر کا امکان پایا جاتا ہو۔ ورنہ اگر یہ طے ہو جائے کہ کسی طرح کا اثر ہونے والا نہیں ہے اور صرف وقت ضائع کرنا ہے تو کوئی فریضہ نہیں ہے۔ یہ کوئی انفرادی فریضہ نہیں ہے اجتماعی ہے اور اجتماعی فریضہ میں تاثیر کے امکانات ہوتے ہیں تو ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے وقتی طور پر انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور خوشگوار مستقبل کا انتظار کیا جاتا ہے۔

۳۔ بدعمل انسان اپنی برائیوں پر اصرار بھی رکھتا ہو ورنہ اگر اس نے توبہ کا ارادہ کر لیا یا حالات نے واضح کر دیا کہ وہ راستہ پر آنے کے لئے تیار ہے تو امر و نہی کی ضرورت نہیں ہے

کر سکتی ہے۔ اصلاح نہیں کر سکتی ہے۔

۴۔ معروف اور منکر گرچہ مسائل کے حق میں ثابت بھی ہوں ورنہ اگر کسی مجبوری کی بنا پر شریعت نے ان سے احکام کو اٹھا لیا ہے تو اب امر و نہی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جیسے حیض میں عورت کو تارک صلوٰۃ قرار دے کر نماز کی تبلیغ کرنا یا علی بن یقطین جیسے افراد کو صحیح وضو کرنے پر تنبیہ کرنا امر و نہی کی ادائیگی نہیں ہے۔ یہی جہالت اور ناواقفیت کا اعلان ہے۔

۵۔ امر و نہی کی وجہ سے کوئی ضرر یا خوف سے زیادہ بڑے فساد کا اندیشہ نہ ہو ورنہ اگر جان مال یا آبرو خطرہ میں پڑ جائے اور یہ نقصان قابل برداشت نہ ہو تو جان و مال و آبرو کا تحفظ زیادہ ضروری ہے اور امر و نہی کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھا جائے گا تاکہ وقت آنے پر اس فریضہ پر عمل کیا جا سکے۔

واضح رہے کہ یہ امر و نہی کسی ایک فرد یا جماعت کا فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ شرائط کے فراہم ہو جانے پر عوام الناس پر بھی واجب ہے اور شرائط کے مہیا نہ ہونے کی صورت میں علماء کرام پر بھی واجب نہیں ہے۔

انسان کو ہمیشہ ان دونوں کے درمیان سے ایک راستہ نکالنا پڑے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جوشیلی طبیعت حدود سے آگے بڑھنے پر مجبور کر دے یا بزدلی فرائض کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

مراتب عمل

امر و نہی واجب ہونے کے بعد بھی مختلف درجات و مراتب کے حامل ہیں اور بعض درجات بہرحال واجب ہیں اور بعض کے لئے حالات اور مقامات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ مثال کے طور پر نفرت کا اظہار بہرحال واجب ہے جس میں کسی طرح کی رعایت نہیں ہے۔ اس کے بعد زبان سے روکنے ٹوکنے یا تنبیہ کرنے اور مرمت کرنے کا مسئلہ حالات سے وابستہ ہے۔ حالات سازگار ہوں تو یہ بھی واجب ہے ورنہ یہ مرتبہ ساقط ہو جائے گا اور قلبی نفرت کا وجوب بہرحال برقرار رہے گا۔

رہ گیا زخمی کر دینا یا قتل کر دینا تو اس کا جواز کسی شخص کو حاصل نہیں ہے اور امر و نہی کا مقصد

انسان کو فنا کر دینا ہے ورنہ یہ کام پروردگار پہلے ہی کر سکتا تھا اس کے لئے امر و نہی کے واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی یا دوسرے الفاظ میں اس کے مامور حضرت ملک الموت ہیں۔ حضرات مبلغین اور مصلحین نہیں ہیں۔

بعض مثالیں

یوں تو معروف و منکر کی تفصیلی فہرست بہت طویل ہے اور قانونی طور پر تمام واجبات معروف کی فہرست میں شامل ہیں اور تمام محرمات منکرات میں داخل ہیں۔ لیکن ذیل میں بعض مثالوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے کہ ان امور کی طرف عام طور سے لوگ متوجہ نہیں ہیں اور ان کے معروف یا منکر ہونے سے غافل ہیں [illegible] کرنے کے بعد بھی اپنے کو مستقل دیندار اور صاحب تقویٰ تصور کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر معروف اور نیک امور میں حسب ذیل اشیاء بھی شامل ہیں:

۱۔ پروردگار سے وابستگی

جس کے بارے میں قرآن حکیم میں اعلان ہوا ہے کہ "جو خدا سے وابستہ ہو جائے اسے صراط مستقیم کی ہدایت مل گئی ہے" — اور حدیث مبارک میں ارشاد ہوا ہے کہ پروردگار نے جناب داؤد کی طرف وحی کی کہ جو شخص بھی بندوں کو چھوڑ کر مجھ سے وابستہ ہو جاتا ہے اسے زمین و آسمان مل کر بھی گرفتار کرنا چاہیں تو میں اس کے نکلنے کے لئے راستہ بنا دیتا ہوں۔

۲۔ خدا پر بھروسہ

کہ وہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے کے لئے کافی ہے اور وہ کافی ہو گا تو پھر کون کافی ہو گا۔ امام محمد باقر نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بے نیازی اور عزت ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے اور جہاں توکل کو دیکھ لیتی ہے وہیں قیام پذیر ہو جاتی ہے۔"

۳۔ پروردگار سے حسن ظن

امیر المؤمنین نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص پروردگار کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے کہ وہ میرے امور کی تکمیل کر دے گا، پروردگار اس کے حسن ظن کو ضائع نہیں ہونے دیتا ہے اور اس کے

امور کو مکمل کر دیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بندہ اس کے بارے میں بہترین خیال رکھے اور وہ اس حسن ظن کو سوء ظن میں تبدیل کر دے جب کہ وہ کریم بھی ہے اور اپنے بندوں پر مہربان بھی ہے۔"

۴۔ مصیبتوں پر صبر

جس کے بارے میں اعلان ہوا ہے کہ "پروردگار صابرین کو بے حساب عنایت کرتا ہے۔"

اور رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ "صبر کرو کہ صبر میں خیر کثیر ہے اور امداد الٰہی ہمیشہ صبر کے ساتھ ہے۔ میں نے ہر پریشانی کے بعد راحت اور ہر تنگی کے ساتھ سہولت اور آسانی دیکھی ہے۔"

امیرالمومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ "صبر کے ساتھ کامیابی یقینی ہے چاہے دیر میں کیوں نہ ہو۔"

"صبر کی دو قسمیں ہیں۔ مصیبتوں پر صبر جو امر حسین و جمیل ہے۔ اور معصیت کے مقابلہ میں صبر جو اس سے بالاتر منزل کا حامل ہے۔"

۵۔ عفت اور پاکدامنی

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے کہ "شرمگاہ اور شکم کی پاکیزگی سے بالاتر کوئی عبادت نہیں ہے۔"

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "ہمارا شیعہ وہی ہے جس کا شکم اور اس کی شرمگاہ پاکیزہ ہو اور وہ راہ خدا میں جہاد کرے، پروردگار کے لئے عمل کرے، اس کے ثواب کا امیدوار رہے اور اس کے عقاب سے ڈرتا رہے۔ ایسے افراد نظر آ جائیں تو انہیں جعفر بن محمدؑ کا شیعہ قرار دے دینا۔"

۶۔ حلم و بردباری

رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "پروردگار نے جہالت میں عزت، اور حلم و بردباری میں ذلت نہیں رکھی ہے۔"

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ "حلیم انسان کا سب سے پہلا اجر یہ ہے کہ لوگ جاہل کے مقابلہ میں اس کے مددگار ہو جاتے ہیں۔"

امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ "انسان جب تک حلیم اور بردبار نہ ہو جائے عابد نہیں ہو سکتا ہے۔"

۷۔ تواضع

رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ "پروردگار تواضع کرنے والے کو بلندی اور متکبر کو پستی

عنایت کرتا ہے۔ جو معیشت میں میانہ روی سے کام لیتا ہے اسے روزی دیتا ہے اور جو اسراف کرتا ہے اسے محروم کر دیتا ہے۔ وہ موت کو یاد کرنے والے کو دوست رکھتا ہے۔"

۸۔ لوگوں کے ساتھ انصاف

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "بہترین عمل اپنے نفس کے مقابلہ میں انصاف کرنا اور ہر حال میں برادر ایمانی سے ہمدردی کرنا ہے۔"

۹۔ اپنے عیب پر نظر رکھنا

رسول اکرمؐ نے فرمایا "جسے خدا کا خوف لوگوں کے خوف سے بے نیاز کر دے اور جو اپنے عیوب کو دیکھ کر لوگوں کے عیوب سے غافل ہو جائے اس کے لئے طوبیٰ ہے۔"

"سب سے جلدی ثواب نیکی کا ملتا ہے اور سب سے جلد عذاب ظلم پر ہوتا ہے۔ انسان کے عیب کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ لوگوں کی برائیوں پر نظر رکھے اور اپنی برائی سے غافل ہو جائے لوگوں کی اس بات پر ملامت کرے جسے خود ترک نہیں کر سکتا ہے اور اپنے ہم نشین کو بلا وجہ اذیت دے۔"

۱۰۔ اصلاح نفس

امیرالمومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے "جو اپنے باطن کی اصلاح کرے پروردگار اس کے ظاہر کو ٹھیک بنا دیتا ہے اور جو اپنے دین کے لئے عمل کرتا ہے خدا اس کی دنیا کا انتظام کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے اور خدا کے درمیان معاملات کو صحیح رکھتا ہے خدا اس کے اور لوگوں کے معاملات کو خود صحیح کر دیتا ہے۔"

دنیا کی طرف سے بے اعتنائی

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے خدا اس کے دل میں حکمت ثبت کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر حکمت کو جاری کر دیتا ہے اور اسے تمام عیوب دنیا کے امراض اور علاج سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور وہ دنیا سے صحیح و سالم دار السلام کا رخ کرتا ہے۔"

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کی کہ آپ کی بارگاہ میں حاضری کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے لہٰذا کوئی مستقل نسخہ بتا دیجئے؟

فرمایا "میں تمہیں تقویٰ پروردگار اور محنت کی نصیحت کرتا ہوں۔ خبردار اپنے سے

بالاتر آدمی کو دیکھ کر لالچ نہ کرنا اور پروردگار کی اس نصیحت پر نگاہ رکھنا کہ اگر کی آنکھیں جما
پر نگاہ نہ رکھو اور ماں کے، اولاد و اموال تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دیں۔"
دیکھو رسول اکرمؐ نے کس طرح زندگی گزاری ہے کہ آپ کی غذا جو، آپ کا حلوہ کھجور
اور آپ کا ایندھن شاخ خرما تھی۔ جب مال یا اولاد یا اپنی ذات کے سلسلے میں کسی مصیبت سے
دوچار ہو تو رسول اکرمؐ کی مصیبت کو یاد کرو کہ کائنات میں کسی شخص پر آپ جیسی مصیبتیں نازل
نہیں ہوئی ہیں۔"

منکرات

منکرات کی فہرست بھی محرمات جیسی ہے لیکن بعض امور کی طرف خصوصیت کے ساتھ
توجہ ضروری ہے کہ لوگ ان سے غافل رہتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں دین و ایمان تباہ و برباد
ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

● ـ غضب اور غصہ

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "غصہ ایمان کو اسی طرح تباہ کر دیتا ہے جس طرح شہد کو سرکہ۔"
امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ "غصہ ہر برائی اور شر کی کنجی ہے۔"
امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ "غصہ اس وقت تک نہیں رکتا ہے جب تک آدمی کو جہنم میں
داخل نہ کر دے۔ لہٰذا جب کسی کو غصہ آئے تو اگر کھڑا ہے تو فوراً بیٹھ جائے تاکہ شیطان کا رجس
دور ہو جائے۔ اور اگر کسی قرابت دار پر غصہ آئے تو اس سے قریب تر ہو جائے کہ اس طرح
خود بخود سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"

● ـ حسد (کسی کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلنا کہ اس کے حالات ایسے کیوں ہیں)

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "حسد ایمان کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس
طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"
رسول اکرمؐ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا کہ تمھارے اندر سابق امتوں کا مرض
پھیل گیا ہے، اور وہ حسد ہے جو بالوں کو صاف نہیں کرتا ہے ایمان کو صاف کر دیتا ہے۔ اس سے بچنے

کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور برادر ایمانی پر طعن نہ کرے۔

● ـ ظلم

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو شخص بھی ظلم کرے گا اس کا نتیجہ اس کی ذات یا اپنے مال یا اپنی
اولاد میں ضرور دیکھے گا۔"
جس نے ظلم کیا وہ خیر نہیں پا سکتا ہے۔ مظلوم ظالم کے دین سے اس سے زیادہ لے لیتا ہے
جتنا ظالم مظلوم کی دنیا سے غصب کرتا ہے۔

● ـ انسان کا خطرناک ہونا

رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ "قیامت کے دن بدترین انسان وہ ہوگا جس کا احترام اس کے
شر کے خوف سے ہوتا ہے۔"
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جس کی زبان سے لوگ ڈرتے ہوں اس کا انجام جہنم ہے۔"
"بدترین انسان وہ ہے جس کی زبان سے لوگ خوف زدہ رہتے ہوں۔"
الحمد للہ اولاً و آخراً والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

خصوصیات و امتیازات

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی دیگر فرائض کی طرح بیشمار خصوصیات اور امتیازات پائے جاتے ہیں اور اسلام کا ہر فریضہ اپنے مقام پر ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہوتا ہے جس کی علت و اہمیت اور حکمت و مصلحت کو صرف پروردگار جانتا ہے جس نے ان تمام احکام اور فرائض کو بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کے لئے معین کیا ہے۔ لیکن سردست آیات اور روایات سے متعدد کی بنیاد پر چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ سنت الٰہیہ

اسلام کے جملہ فرائض میں کوئی فریضہ ایسا نہیں ہے جس میں پروردگار اپنے بندوں کا شریک عمل ہو۔ وہ نماز ادا کرتا ہے اور نہ روزہ۔ نہ زکوٰۃ دیتا ہے، اور نہ خمس۔ نہ حج کرتا ہے اور نہ جہاد۔ لیکن امر و نہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں پروردگار بھی اپنے بندوں کا شریک ہے اور اس نے امر و نہی کو پہلے سنت الٰہیہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فریضۂ بندگی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

● اے ابلیس، تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا جبکہ میں نے تجھے امر کیا تھا۔ (اعراف۔ ۱۲)

● آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے عدل و انصاف کا امر کیا ہے۔ (اعراف۔ ۲۹)

● پروردگار نے امر کیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (یوسف۔ ۴۰)

● اللہ عدل، احسان، اور قرابتداروں کے حقوق کے بارے میں امر کرتا ہے اور برائی، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے نہی کرتا ہے۔ (نحل۔ ۹۰)

● پروردگار تمہیں امر کرتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو اور جب فیصلہ

کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ (نساء۔ ۵۸)

● اے بنی اسرائیل! پروردگار ایک گائے ذبح کرنے کا امر کر رہا ہے۔ (بقرہ۔ ۶۷)

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امر و نہی فریضۂ بندگی ہونے سے پہلے سنت الٰہیہ ہے، اور پروردگار نے اس عمل کی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنے اعمال و افعال میں شامل کر لیا ہے جبکہ اس کا کوئی عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ سیرت انبیاء

● اسماعیلؑ اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا امر کیا کرتے تھے اور اللہ کے پسندیدہ بندے تھے۔ (مریم۔ ۵۵)

● وہ لوگ اس نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کا تذکرہ توریت و انجیل میں ہے اور وہ لوگوں کو نیکیوں کا امر کرتا ہے اور برائیوں سے نہی کرتا ہے۔ (اعراف۔ ۱۵۷)

مذکورہ آیات کے علاوہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انبیاء کا طریقہ ہے اور صلحاء کا اصول زندگی ہے۔ یہ وہ عظیم فریضہ ہے جس سے دیگر فرائض قائم ہو جاتے ہیں اور راستے محفوظ ہوتے ہیں ..." (وسائل الشیعہ ۱۱/۳۹۵)

۳۔ سیرت اولیاء

"مومنین و مومنات آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء و احباب ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔" (توبہ۔ ۷۱)

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ امر و نہی نفرت کا سبب نہیں ہیں بلکہ محبت کی علامت ہیں۔ شریف انسان ہمیشہ نصیحت کرنے والے کا شکرگزار رہتا ہے اور اسے یہ احساس رہتا ہے کہ اس نے نصیحت نہ کی ہوتی تو ہم تاحیات گمراہی کے راستہ پر گامزن رہتا اور کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

۴۔ سیرت حکماء

جناب لقمان جن کے مرد حکیم ہونے کا تذکرہ خود قرآن مجید [illegible]

اور خصوصیت کی بنا پر ان کے مواعظ و نصائح کو اپنے دامن میں محفوظ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو دس باتوں کی نصیحت فرمائی ہے جن کا تعلق عقائد سے بھی ہے اور اعمال سے بھی ہے اور جن میں کفران نعمت کی تباہی کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور شکر نعمت کی نصیحت اور تاکید کا بھی۔ انھیں نصیحتوں کے درمیان ایک معاشرتی نصیحت بھی ہے کہ "بیٹا، نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو اور اس راہ میں جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو کہ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے" (لقمان ۔۔)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امر و نہی صرف [illegible] میں شامل ہے جسے وہ وصیت کے ذریعہ [illegible] میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح کہ [illegible] حکمت مولائے کائناتؑ نے اپنے فرزند محمد حنفیہ سے فرمایا تھا کہ بیٹا نیکیوں کا حکم دو اور اس کے اہل بنو کہ امر و نہی ہی سے پروردگار کی بارگاہ میں امور کی تکمیل ہوتی ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱/۳۹۶)

۵۔ شرف انسانیت

دنیا میں ہر انسان کے اندر ایک برتری کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اسی برتری کے جذبہ کی تکمیل کے لیے انسان کبھی [illegible] حاصل کرتا ہے اور کبھی ذات کے ذریعہ اس جذبہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو تواضع و انکساری کا حکم دیا ہے اور مذہب کے معاملات میں بھی تواضع و انکساری کو [illegible] کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انسان کے جذبۂ برتری کی تسکین کے لیے امر بالمعروف کو فرائض میں شامل کر دیا ہے اور انسان کو متوجہ کر دیا ہے کہ اگر امر کرنے ہی کا شوق ہے تو نیکیوں کا امر کرو اور امر کرنے سے پہلے خود عمل کرو اور سمجھو کہ اسلام نے تم کو [illegible] نہیں ہو سکتے ہو کہ تمھیں علی [illegible] امر کرنے کا حق دیا ہے اسے تمہارے فرائض میں شامل کر دیا ہے۔ یہ آمریت سلطنت و حکومت کی آمریت نہیں ہے بلکہ عبادت و بندگی کے حدود کے اندر آمریت ہے جس کی حیثیت گنہگاروں اور خطاکاروں کے اعتبار سے آمریت کی ہے لیکن [illegible] اعتبار سے ماموریت کی ہے۔

۶۔ معاشرتی عمل

امر و نہی کے علاوہ تمام فرائض ایک قسم کی انفرادی اور شخصی حیثیت رکھتے ہیں جن سے ہر انسان ذاتی کمال حاصل کرتا ہے۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد سب اپنے نفس کی طہارت اور [illegible] کے ذریعہ انسان تقرب کی معراج حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ فائدہ اسی ذات تک محدود رہتا ہے، اور اس کا معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے جب کہ امر و نہی اجتماعی فرائض میں ہیں اور ان کی ادائیگی سے انسان اپنے نفس کی اصلاح سے زیادہ معاشرہ کی اصلاح پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کا فائدہ چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ امر و نہی انسان کو ہر قسم کی انانیت اور مفاد پرستی سے بلند کر کے اس منزل تک پہنچا دیتا ہے جہاں انسان اپنے فائدہ سے غافل ہو کر سماج کے فائدہ کے بارے میں سوچتا ہے اور بعض اوقات اس راہ میں اپنا نقصان بھی برداشت کر لیتا ہے جیسا کہ جناب لقمان نے اپنی وصیت میں اشارہ کیا تھا اور اسے بلند ہمت افراد کا کام قرار دیا تھا۔

۷۔ خیر نجویٰ

انسانی زندگی میں خفیہ گفتگو اور سرگوشی ایک بڑی اہمیت رہتی ہے لیکن عام طور سے اس کے منفی پہلو مثبت پہلوؤں سے زیادہ ہوتے ہیں، اور کبھی اس صورت حال سے غلط فہمی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی [illegible] گفتگو کو [illegible] بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اس [illegible] بھی چھپایا جاتا ہے [illegible] شخصیت [illegible] جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اصحاب پیغمبرؐ [illegible] کہ پیغمبرؐ سے سرگوشی کو [illegible] اور [illegible] روایات [illegible] واضح ہو جائے کہ ان لوگوں کا اس عمل کا اخلاص اور پیغمبرؐ کا احترام نہیں ہے اور کسی بھی قیمت پر نجویٰ کے لئے تیار [illegible] ظاہر ہو سکے۔

اسلام نے افلاس کے جنس نظر نجویٰ اور سرگوشی کو حرام تو نہیں قرار دیا لیکن اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کے پیش نظر یہ واضح اعلان کر دیا ہے کہ

"ان لوگوں کی اکثر رازکی باتوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر وہ شخص جو صدقہ یا کار خیر یا اصلاح کا حکم دے۔" (نساء۔۱۱۴)

گویا اس کار خیر اور اصلاح کے امر کے ذریعہ نجویٰ اور خفیہ گفتگو کو بھی باخیر بنایا جا سکتا ہے۔

۸۔ خیر امت

اسلام میں فقط خفیہ گفتگو اور نجویٰ ہی کے لئے باعث خیر نہیں ہے بلکہ اس سے پوری امت کے خیر کا تعین ہوتا ہے کہ جس کے بغیر کسی امت کو خیر امت نہیں کہا جا سکتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اعلان ہوتا ہے کہ،

"مسلمانو! تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران۔۱۱۰)

گویا خیر امت ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے جس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ یہ ایک اجتماعی قانون ہے جس کا فرد سے تعلق نہیں ہے۔ اس کے مطابق اس بات کا امکان ہے کہ آیت میں بیان کردہ [illegible] ورنہ اگر کوئی شخص یا جماعت امر و نہی کو چھوڑ کر بیٹھ جائے یا خود برائیوں میں مبتلا ہو جائے یا برائیوں کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دے تو اسے ہرگز خیر امت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ بد ترین امت کہے جانے کے قابل ہے جس کا اندازہ دور جدید کے معاشرے جیسے کردار والوں کا ہے۔

۹۔ مقصد حکومت اسلامی

سورۂ مبارکہ حج میں ارشاد ہوتا ہے کہ،

"پروردگار کی طرف سے ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے جن پر

جنگ کی جا رہی ہے، اور وہ ان کی نصرت پر قادر بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے دیار سے نکال دیا گیا ہے اور ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے ... اللہ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی مدد کرے گا وہ قوی بھی ہے اور عزیز بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں زمین میں اقتدار دیا گیا تو انہوں نے نماز قائم کی۔ زکوٰۃ ادا کی، نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے منع کیا اور انجام کار بہرحال پروردگار کے ہاتھوں میں ہے۔"

(حج ۳۹۔۴۰۔۴۱)

آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے جن لوگوں کو مظلوم قرار دیا ہے اور جن کی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ ایسے افراد نہیں ہیں کہ فتح حاصل کرنے کے بعد اقتدار کے نشے میں ڈوب جائیں۔ بلکہ وہ افراد ہیں جنہیں اقتدار مل جائے تو فرض بندگی ادا کرنے کے لئے نماز قائم کریں گے غربا کی زندگی کے لئے زکوٰۃ ادا کریں گے اور سماج کی اصلاح و تطہیر کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں گے کہ ان امور سے غفلت برتنے والے کو اسلامی دنیا میں اقتدار سنبھالنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسلامی حکومت کا کوئی مقصد اس کے علاوہ نہیں ہے جیسا کہ امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلتے وقت حضرت محمد بن حنفیہ کے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ میں خود نمائی، غرور اور فساد کی بنیاد پر [illegible] نہیں نکل رہا ہوں۔ میرا مقصد صرف امت کی اصلاح چاہنا ہے اور میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دوں، برائیوں سے روکوں اور اس راہ میں اپنے جد بزرگوار اور اپنے پدر محترم کا اتباع کروں۔ اس کے بعد کوئی میری بات کو قبول کرے گا تو اس کا فائدہ ہوگا کہ حق اس بات کا حقدار ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور اگر کوئی رد کر دے گا تو میرا فریضہ بہرحال ادا ہو جائے گا۔"

۱۰۔ وظیفۂ رسالت

سورۂ مبارکہ اعراف میں آیت ۸۲ سے ۸۶ تک پیغمبر اکرمؐ اور ان کے معنوی ...

[illegible]

کے مطابق کس طرح جواب دیا کرتے تھے۔ لیکن آخر میں پیغمبرؐ کے سامنے ایک سہ نکاتی نظام رکھ دیا گیا جس کے مطابق ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے۔ وہ پیغمبرؐ کے بعد جو بھی اس راہ میں قدم رکھے گا اسے انہیں ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔

● پہلا نکتہ یہ ہے کہ اس راہ میں بحث و مباحثہ کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد عفو کا راستہ اختیار کرے اور جھگڑنے کو دعوت نہ دے۔

● دوسرا نکتہ یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم برابر دیتا رہے اور اس سے غافل نہ ہو اس لئے کہ بحث کا راستہ بند ہو سکتا ہے ہدایت کا راستہ بند نہیں ہو سکتا ہے۔

● تیسرا نکتہ یہ ہے کہ جاہلوں سے کنارہ کش رہے کہ جہالت سے فتنہ و فساد کے علاوہ کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسالت کے دائرے وظائف میں امر بالمعروف ناقابل ترک وظیفہ اور فریضہ ہے۔

۱۔ سبب خودسازی

پروردگار عالم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دینے کے بعد مختلف مقامات پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر دوسروں کو امر و نہی باعث اجر و ثواب اور سبب فلاح و نجات ہے تو اپنے کردار کی طرف سے غفلت بھی بدترین جرم اور ناقابل معافی ہے جسے کسی قیمت پر معاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

● کیا تم لوگ دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے نفس کو بھولے ہوئے ہو تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے۔ (بقرہ - ۴۴)

● ایمان والو کیوں وہ بات کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے ہو۔ پروردگار کے نزدیک یہ بات انتہائی غضب کی ہے کہ تم لوگوں سے کہو اور خود عمل نہ کرو۔ (صف - ۲، ۳)

— مولائے کائناتؑ کا ارشاد گرامی ہے۔ میں ایسے شخص کو اس بات سے بلند ... چاہتا ہوں کہ لوگوں کو کسی بات سے منع کروں اور خود عمل نہ کروں، یا انہیں کسی بات کا حکم دوں

اور ان سے پہلے اسے بجا لاؤں۔ (غرر الحکم)

— دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں "خبردار! ان لوگوں میں نہ ہو جانا جو بغیر عمل کے آخرت کے امیدوار ہیں کہ لوگوں کو امر و نہی کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے ہیں۔"

(وسائل الشیعہ ۱/ ۴۲)

— امام زین العابدینؑ کا ارشاد ہے کہ "منافق دوسروں کو روکتا ہے اور خود نہیں رکتا ہے۔ دوسروں کو حکم دیتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا ہے۔ (وسائل الشیعہ ۱/ ۴۹۹)

— نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ "خدا ان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں پر لعنت کرتا ہے جو خود معروف پر عمل نہیں کرتے ہیں اور منکرات سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔"

— غرر الحکم میں مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے کہ جس شخص میں تین صفتیں پیدا ہو جائیں اس کی دنیا و آخرت سلامت رہے گی۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور خود بھی عمل کرے۔ برائیوں سے روکے اور خود بھی رکا رہے۔ پروردگار کے مقرر کردہ حدود کی محافظت کرے۔

ان تمام آیات و روایات کو امر بالمعروف کے وجوب سے ملا کر دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امر بالمعروف خودسازی کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ پروردگار نے دوسروں کو حکم دینے کو واجب کر دیا ہے اور معروف پر عمل نہ کرنے والے امر و نہی کو باعث عذاب قرار دے دیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ انسان اسی حوالے سے واجب کردہ معروفات پر خود بھی فریضہ پر عمل کرے۔

۲۔ نجات از عذاب

سورۂ مبارکہ اعراف میں گذشتہ امتوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک جماعت نے یہ بھی کہا کہ اس قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا اس پر عذاب شدید نازل کرنے والا ہے۔ تو جماعت نے جواب دیا کہ ہم اس طرح

پروردگار کی بارگاہ میں اپنا عذر پیش کرنا چاہتے ہیں اور شاید یہ لوگ راہ راست پر آ جائیں۔ اس کے بعد جب ان لوگوں نے خدائی نصیحت کو نظر انداز کر دیا تو ہم نے برائیوں سے روکنے والوں کو نجات دے دی اور باقی سب کو سخت عذاب میں مبتلا کر دیا کہ یہ لوگ فاسق تھے۔" (اعراف ۶۴ - ۶۵)

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ تین قسم کے تھے:
بعض لوگ عمل کرتے تھے اور حکم دیتے تھے۔ ان لوگوں کو نجات مل گئی۔
بعض لوگ خود عمل کرتے تھے لیکن حکم نہ دیتے تھے۔ انہیں مسخ کر دیا گیا۔
اور بعض لوگ نہ عمل کرتے تھے اور نہ امر و نہی کرتے تھے۔ ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ (بحار ۱۰۰/۷۶)

آیت اور روایت دونوں سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ دور قدیم میں جب عذاب نازل ہوتا تھا تو اس میں صرف بدکار ہی مبتلا نہ ہوتے تھے بلکہ جن لوگوں نے اس صورت حال پر خاموشی اختیار کر لی تھی اور فریضۂ امر و نہی کو ادا نہیں کیا تھا وہ بھی مبتلائے عذاب ہو جاتے تھے اور انہیں بھی کوئی نجات دلانے والا نہ ہوتا تھا۔

۱۲۔ وجہ لعنت

سورۂ مبارکۂ مائدہ میں گذشتہ ادوار کے اہل علم اور مقدسین کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: "آخر اللہ والے اور اہل علم انہیں ان کے جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ یقیناً یہ بہت برا کر رہے ہیں۔" (آیت ۶۳)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "بنی اسرائیل کے کفار پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم دونوں کی زبان سے لعنت کی گئی ہے کہ یہ لوگ معصیت کار اور ظالم تھے۔ کسی برائی سے باز نہیں آتے تھے اور بدترین کام کیا کرتے تھے۔" (مائدہ ۷۹)

بحار میں مولائے کائناتؑ کا یہ ارشادِ گرامی پایا جاتا ہے کہ

"تم سے پہلے والے اس لئے ہلاک ہو گئے کہ وہ گناہ کیا کرتے تھے اور انہیں علماء

اور مقدسین منع نہیں کرتے تھے جس کے نتیجہ میں معصیت میں آگے بڑھتے چلے گئے اور آخر میں عذاب نازل ہو گیا۔" (بحار ۱/۷۸)

نہج البلاغہ میں بھی مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد پایا جاتا ہے کہ

"پروردگار نے گذشتہ امتوں پر اس وقت تک لعنت نہیں کی جب تک انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے بعد احمقوں پر ان کی معصیتوں کی بنا پر لعنت کی اور عقلاء پر ان کے منع نہ کرنے کی بنا پر۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۹۲)

وسائل الشیعہ میں امام حسینؑ کا یہ ارشادِ گرامی پایا جاتا ہے کہ

"ایہا الناس! پروردگار نے جس طرح گذشتہ علماء کا تذکرہ کیا ہے اس سے عبرت حاصل کرو اور یاد رکھو کہ ان کی یہ مذمت صرف اس لئے کی گئی ہے کہ وہ اپنے حکام کی برائیوں کو دیکھتے تھے اور انہیں منع نہیں کرتے تھے اور اس کا سبب ان سے ملنے والے منافع اور ان کی طرف سے ڈر اور خوف تھا حالانکہ پروردگار نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ لوگوں سے نہ ڈرو اور میری پرواہ کرو۔" (وسائل الشیعہ ۱۱/۴۰۳)

مذکورہ ارشادات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امر و نہی کے سلسلہ میں کوتاہی کرنا انسان کو ملعون اور محروم قرار دے دیتا ہے اور خدائی لعنت کے بعد نہ کوئی علم کام آتا ہے اور نہ تقدس۔ علم اور تقدس جیسی ہر شے کی قدر و قیمت خدائی احکام کی پابندی سے وابستہ ہے اور اس سے الگ ہو جانے کے بعد کسی شے کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

۴۔ نجات از نفاق

صاحبانِ ایمان کی زندگی کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ ان کے عقیدہ میں اخلاص پایا جاتا ہے اور وہ نفاق سے یکسر الگ رہتے ہیں اور نفاق سے بدتر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے اور جب یقین میں شک پیدا ہو جاتا ہے تو ایمان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔

نفاق دنیا میں باعث ذلت و رسوائی اور آخرت میں درک اسفل کا سبب ہو جاتا ہے اور نفاق کے بعد کسی شرف کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون صاحبِ ایمان منافقین میں کس طرح ہو جاتا ہے اور ایمان و منافقت کی دنیا کا نقطۂ فاصل کہاں ہے؟

سورۂ مبارکۂ توبہ میں اس سوال کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ: منافق مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں جو برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکیوں سے منع کرتے ہیں۔

(توبہ - ۶۷)

● - امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ برائیوں کا حکم دینے والے اور نیکیوں سے روکنے والے کے لئے ویل ہے۔ (وسائل ۱۱/ ۳۹۸)

● - قبیلۂ خثعم کا ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ دنیا کا بدترین عمل کون سا ہے؟ - فرمایا شرک با خدا

عرض کی اس کے بعد؟

فرمایا قرابت داروں سے قطع تعلق۔

عرض کی اس کے بعد؟

فرمایا برائیوں کا حکم دینا اور نیکیوں سے منع کرنا۔ امام جعفر صادقؑ (تہذیب [illegible])

● - مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں کہ "میں خدا کی بارگاہ میں اس گروہ سے فریاد کرتا ہوں جو جاہل زندہ رہتے ہیں اور گمراہ مرجاتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں [illegible] سے بہتر کوئی شے نہیں ہوتی ہے"

۱۵۔ بنیادِ خلافت فی الارض

روئے زمین پر پروردگار کی خلافت کی دو قسمیں ہیں،

خلافتِ خاصہ اور خلافتِ عامہ۔

خلافتِ خاصہ ان افراد کے لئے ہے جنہیں کوئی مخصوص عہدہ رسالت، امامت، ولایت وغیرہ عطا کیا گیا ہے اور اس کا مصرف روئے زمین پر دینِ خدا کا قیام اور مکمل احکامِ الٰہیہ کی تبلیغ و ترسیل ہے۔

لیکن خلافتِ عامہ کا دائرہ اس سے وسیع تر ہے جس کی طرف مختلف آیاتِ قرآنی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ پروردگار نے نوعِ بشر کو مجموعی طور پر خلیفہ قرار دیا ہے کہ وہ مالک کے بجائے خلافت کا طرزِ عمل اختیار کریں اور ہمیشہ یہ احساس رہے کہ مالکِ حقیقی پروردگار ہے اور اس نے ہمیں صرف تصرف کرنے کا حق دیا ہے لہٰذا اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس خلافت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ "جو شخص بھی نیکیوں کا حکم دے اور برائی سے روکے وہ روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔" (مستدرک ۲/۳۵۸)

یعنی یہ شخص درحقیقت مقصدِ الٰہی کی تکمیل کر رہا ہے اور وہ کام انجام دے رہا ہے جسے خود پروردگار نے بھی حکم دے کر انجام دیا ہے۔ اس حدیثِ مبارک میں ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ سرکارِ دوعالمؐ اس طرح خلیفۃ اللہ کی شناخت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی انسان اگر خلافتِ الٰہیہ کا دعویدار ہے تو اس کے کردار میں امر و نہی کا جائزہ لینا چاہیے جب تک یہ صورت حال نہ پیدا ہو جائے اسے خلافتِ الٰہیہ کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے۔

آپ نے واضح الفاظ میں اشارہ فرما دیا ہے کہ خلیفۃ اللہ ناحق قتل سے روکتا ہے، اپنے مخالفین کا بھی قتل نہیں کرتا ہے۔

خلیفۃ اللہ لوگوں کو غصب سے منع کرتا ہے وہ خود غاصب نہیں ہوتا ہے۔

خلیفۃ اللہ لوگوں کو مردم آزاری سے منع کرتا ہے۔ وہ خود لوگوں کے گھر نہیں جلاتا ہے اور کسی کا پہلو شکستہ نہیں کرتا ہے اور نہ کسی کے بچہ کو شکمِ مادر میں قتل کرتا ہے۔

خلیفۃ اللہ بیت المال کا تحفظ کرتا ہے اور لوگوں کو خیانت سے روکتا ہے۔

وہ سارے مال کو اپنے گھر والوں اور خاندان والوں پر تقسیم نہیں کرتا ہے۔

یہی صورت حال کہیں بھی پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ انسان خود ساختہ حاکم ہے خلیفۃ اللہ نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سرکارؐ نے امر و نہی کے ذریعہ خلیفہ سازی کا کام انجام نہیں دیا ہے بلکہ امر و نہی کو خلافت کی شناخت کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ دعوائے خلافت

کی تصدیق یا تکذیب کا راستہ ہموار کیا ہے۔ جس کی طرف فرزند رسولؐ صادق آل محمد حضرت امام حسینؑ نے اپنے قیام کی وضاحت کرتے ہوئے خطبہ فرمایا تھا کہ "منکرات کا رواج ہو رہا ہے اور نیکیوں کو پامال کیا جا رہا ہے ایسے موقع پر سکوت وجہ لعنت بن جاتا ہے۔"

یہ کام ساری دنیا کر سکتی ہے حقیقتاً اللہ نہیں کر سکتا ہے۔

اور پھر اپنے قیام کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے بنیادی سبب امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی کو قرار دیا تھا جس کا مطلب اپنے آباء و اجداد کی سیرت کو قرار دیا تھا اور اس طرح واضح کر دیا تھا کہ خلافت الٰہیہ میرے بزرگوں کا حصہ ہے اور امر و نہی کا واقعی حق بھی انہیں حضرات کو حاصل تھا۔

۱۶۔ شان مجاہدین

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجاہدین کا کام میدان جنگ میں تلوار چلانا ہے اور اس کے نتیجہ میں دشمن کو قتل کر دینا ہے یا خود شہید ہو جانا ہے اس کے علاوہ مجاہدین کے عمل کا کوئی مصرف نہیں ہے۔

حالانکہ اسلام کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی نظر میں جہاد صرف طاقت کے مظاہرہ یا ملک و مال کے حصول کے لئے نہیں چلایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مصرف بھی دین خدا کا تحفظ اور احکام الٰہیہ کا قیام ہوتا ہے لہذا مجاہد اس امر کو انجام دے سکتا ہے تو اس کا نام مجاہد ہوگا ورنہ تلوار چلانے کے بعد دشمن کو تہ تیغ کر دیا اور اس کے بعد زندگی کے دو دن دنیا کی غارت کر دیا یا حقوق کی ادائیگی سے ... قائم کرنے کے حکم الٰہی کو نظر انداز کر دیا تو ایسے شخص کو مجاہد راہ خدا یا سپاہی لشکر نہیں کہا جا سکتا ہے۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے ان لوگوں سے جان و مال کا سودا کر لیا ہے جنہیں جنت دی ہے وہ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں جو دشمن کو قتل بھی کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی صفات حسب ذیل ہیں:

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد پروردگار کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، نیکیوں کا حکم دینے والے، برائیوں سے روکنے والے اور

حدود الٰہیہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پیغمبرؐ آپ ان صاحبان ایمان کو بشارت دے دیں۔"

آیت کریمہ کا واضح اعلان ہے کہ مجاہدین راہ خدا صرف جنگی کمالات کے مالک نہیں ہوتے ہیں بلکہ انہیں معاشرہ کی اصلاح کی فکر بھی ہوتی ہے اور وہ حدود الٰہیہ کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ اور اسلام ان کمالات سے عاری ہو جائے تو اسے سپاہی کہا جا سکتا ہے لیکن مجاہد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ راہ خدا میں ... کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور جو شخص حدود الٰہیہ کا تحفظ نہ کر سکے اس کا راہ خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۷۔ کمال نماز

نماز ایک عظیم ترین عبادت ہے جسے "قربان کل تقی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد ظاہر ہے کہ بندہ اخلاص کے قدم آگے بڑھاتا ہے اور اپنے پروردگار سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے نماز بازاروں اور پہاڑوں کی بلندیوں اور صحراؤں میں بھی ہو سکتی ہے۔ غسل خانہ کے اندر بند کمرہ میں بھی ہو سکتی ہے جہاں کسی دوسرے کا گذر نہ ہو۔ کہ اس کا تعلق عبد و معبود کے رابطے سے ہے اور عبد و معبود کے رابطہ میں "مجمع" یا "بستی" کی کوئی شرط نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود سورۂ عنکبوت میں نماز کی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ نماز برائی سے روکنے والی ہے اور نماز اس وقت تک نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے جب تک اس میں برائی سے روکنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔

درحقیقت نماز کا قیام ... ہو سکتا ہے فرد ... نہیں ہو سکتا ہے۔

اس نکتہ سے اس حقیقت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نماز کا کام یہ ہے کہ نمازی کو برائیوں سے روکے اور نمازی کا کام یہ ہے کہ پورے معاشرہ کو برائیوں سے روکے ورنہ ... اور پروردگار سے دور ہو کر خود غرضی اور مفاد پرستی سے نماز کو معراج مومن نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

معراج خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سرکار دو عالمؐ اس وقت تک عرش اعظم سے پلٹ کر نہیں آئے جب تک اپنے ہمراہ امت کے لئے تحفہ نماز اور نماز کے تحفظ کے لئے "فرض" ... نہیں آئے جس کا مطلب یہ ہے کہ معراج دوسروں کا خیال رکھنے کا نام ہے۔ ...

مقاصد کی تکمیل یا اپنے مقام تقرب کے عروج کو معراج نہیں کہا جاتا ہے۔

۱۸۔ سبب تباہی اقوام

سورہ مبارکہ ہود ۱۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "تمہارے پہلے والے زمانوں اور نسلوں میں ایسے افراد کیوں نہیں پیدا ہوئے جو لوگوں کو برائیوں سے روکتے سوائے چند افراد کے جنہیں ہم نے نجات دے دی اور ظالموں نے ہمیشہ عیش و عشرت کا راستہ اختیار کیا ہے اور وہ سب کے سب مجرم ہی تھے۔"

"ہم کسی بستی قوم کو ہلاک نہیں کرتے ہیں مگر یہ کہ ... اصلاح کرنے والے ہوں۔"

ان آیات کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ امتوں کی تباہی اور بربادی میں سے بڑا حصہ نہی عن المنکر سے غفلت کا ہے اور اسی ایک کام کے نہ ہونے سے قوموں کی قومیں تباہی اور بربادی کے گھاٹ اتر گئی ہیں۔

سرکار دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"پروردگار اس کمزور مومن سے نفرت کرتا ہے جس میں برائیوں سے روکنے کی طاقت نہ ہو۔" (وسائل ۱/۳۹۹)

... کمزور صاحب ایمان سے بیزار رہتا ہے جس کے پاس دین نہیں ہوتا ہے یعنی وہ برائیوں سے نہیں روکتا ہے۔" (وسائل ۱/۳۹۹)

"کسی مومن کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ برائی ... برائی کو دیکھے اور ... کرے۔" (کنز العمال حدیث ۵۶۱۴)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ:

"اگر کوئی شخص برائی کو دیکھے اور قدرت رکھنے کے باوجود منع نہ کرے تو گویا ... کی نافرمانی کو دوست رکھتا ہے اور جو خدا کی نافرمانی کو دوست رکھتا ہے گویا پروردگار ... سے عداوت رکھتا ہے۔" (مستدرک الوسائل ۲/۲۵۷)

امام زین العابدینؑ نے اپنے پروردگار کے حرم سے پیغمبر کرمؐ کا یہ ارشاد نقل ...

"کسی مومن آنکھ کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ برائی کو دیکھنے کے بعد جب تک اصلاح نہ کرے ... پلک جھپکائے۔" (تنبیہ الخواطر ص ۴۱۲)

۱۹۔ اساس دین

● امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں حضرات سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ جس شخص کے طریقہ کار میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے۔" (بحار ۱۰۰/۸۶)

● مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے کہ "شریعت کا قوام امر بالمعروف نہی عن المنکر اور حدود الہیہ کے قیام سے ہے ... اس کے بغیر شریعت باقی نہیں رہ سکتی ... امر بالمعروف ... واضح ہوتا ہے کہ حقیقی دین ... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ... اس کے علاوہ دین صرف ... کی باتیں ہیں اور ... کی بازی گری ...!

۲۰۔ رضائے الہی

قرآن مجید نے جنت کے حور و قصور کا ذکر کرنے کے بعد بھی ارشاد فرمایا ہے ... پروردگار کی رضا بھی بہت بڑی نعمت ہے ... کی علامت ہے کہ دنیا کی زندگی میں راحت دین سے لے کر آخرت تک کسی شے کی وہ اہمیت اور قدر و قیمت نہیں ہے جو قدر و قیمت رضائے الہی کی ہے۔

مولائے کائنات کا کردار گواہ ہے کہ وہ جنت اور دوزخ کی خاطر عبادت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور اپنا ایک سجدہ بھی جنت کی خاطر نہیں دے سکتے تھے لیکن جب رضائے الہی کا سوال سامنے آگیا تو بستر پیغمبرؐ پر نفس بیچنے اور جان دینے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ تاکہ رضائے الہی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اور انسان ہر وہ عمل انجام دے جس میں رضائے الہی شامل ہو اور ہر اس عمل سے پرہیز کرے جس میں پروردگار کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔

مگر صورت حال کو دیکھنے کے بعد اس روایت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر ایک شخص نے امیر المومنینؑ کی خدمت میں یہ تجویز رکھی کہ اس جنگ سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ اپنے اطراف والوں کو لے کر واپس چلے جائیں اور ہم اپنے کام چلے جائیں۔ یہی زیادہ بہتر ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے اپنے خیال میں بہت پاکیزہ نصیحت کی ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ پروردگار اپنے اولیاء کے بارے میں ہرگز اس بات سے راضی نہیں ہے کہ زمین پر اس کی معصیت ہوتی رہے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ نہ نیکیوں کا حکم دیں اور نہ برائیوں سے منع کریں۔ میری نظر میں جنگ کی تکالیف آتش جہنم کے طوق و زنجیر سے کہیں زیادہ آسان اور قابل برداشت ہیں۔ (منہج سعادہ ۲ ، ۲۲۶)

۲۱۔ تمامیت امور

امیر المومنینؑ نے محمد حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: "پروردگار کی بارگاہ میں تمام امور کی تمامیت کا دار و مدار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے۔" (وسائل ۱۱/۳۹۰)

امر و نہی کے بغیر اسلام کا کردار مکمل ہوتا ہے، اور نہ معاشرہ کے امور کی تکمیل کا کوئی وسیلہ ہے۔ جس معاشرہ میں نیکیوں کا فقدان رہے گا، اور برائیاں سر اٹھاتی رہیں گی اس معاشرہ کو کار خیر کی راہ نہیں پہنچ سکتے۔ امور دین کی تکمیل چاہتے ہیں تو پہلے امر و نہی کا سلسلہ قائم کرنا ہوگا اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا جو نیکیوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں یا برائیوں کے فروغ کا سبب بن جاتی ہیں۔

۲۲۔ افضل از جہاد

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا کے تمام کار خیر کے مقابلہ میں جہاد ایک عظیم کام ہے کہ ہر کار خیر سے فرد یا معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے اور جہاد کے ذریعہ اصل دین کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلہ میں جہاد کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ جہاد مفسد افراد کو راستہ سے دور کر دیتا ہے لیکن

قیام امر و نہی برائیوں کا سد باب نہیں کر پاتا ہے اور دین الٰہی کا اصل منشاء یہ ہے کہ انسان زندہ رہیں اور نیک کردار بن کر زندہ رہیں۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان فنا ہو جائیں اور فنا کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرنا ہوتا تو پروردگار تمام نالائق افراد کو پہلے ہی فنا کر دیتا اور جنگ و جہاد کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

جہاد درحقیقت وہ علاج ہے جو امر و نہی کے ناکام ہونے کے بعد مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے ورنہ اسلام کا اصل منشاء نیکیوں کا رواج اور برائیوں کا سد باب ہے۔ جو کام امر و نہی کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مولائے کائناتؑ کا ارشاد ہے کہ جہاد راہ خدا اور تمام کارہائے خیر سب ملا کر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلہ میں ویسے ہی ہیں جیسے سمندر کے مقابلہ میں جھاگ۔
(نہج البلاغہ حکم ۳۷۴)

سارے کار ہائے خیر ظاہری حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی اس واقعیت کا اہتمام ہے جس کے لئے دین کا نظام بنایا گیا ہے اور جس پر شریعت کی بنیادیں قائم کی گئی ہیں۔

۲۳۔ رغم انف کفار

امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جس شخص نے برائیوں سے روکا اس نے گویا کفار کی ناک رگڑ دی۔" (نہج البلاغہ حکمت ۳۱)

کفر کا منشاء یہ ہے کہ سماج میں برائیاں رہیں تاکہ اسے فروغ حاصل ہو، جبکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سماج سے برائیاں ختم ہو جائیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کے لئے وہ روئے زمین پر آیا ہے اور جس کا اس نے روز اول وعدہ کیا ہے کہ لا الہ الا اللہ کہو تمام مشکلات سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

امر و نہی کی منزل درحقیقت اسلام اور کفر کے درمیان ایک معرکہ ہے جہاں شیطانی طاقتیں برائیوں کو رواج دینا چاہتی ہیں اور رحمان کے نمائندے ان برائیوں کا سد باب کرنا چاہتے ہیں۔

اسی لئے امیرالمومنینؑ ہی نے دوسرا فقرہ ارشاد فرمایا کہ "نیکیوں کا حکم دینا مومنین کی پشت کو مضبوط بنانا ہے" کہ جیسے جیسے نیکیوں کا رواج بڑھتا جائے گا شوکت ایمان میں اضافہ ہوتا جائے گا اور مومنین کی طاقت قوی تر ہوتی جائے گی۔

امر بالمعروف کا وجوب تمام عالم انسانیت کے لئے ہے۔ صرف اسلام کا پیغام ہے اور اس سے غفلت سارے عالم انسانیت کے لئے عظیم ترین خسارہ اور نقصان ہے جس کا اندازہ دور حاضر میں بلا کسی زحمت کے کیا جا سکتا ہے۔

۲۴۔ مصدر خیرات و برکات

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے صرف معاشرہ کی اصلاح ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ ان خیرات و برکات کا بھی نزول ہوتا ہے جنہیں بداعمالیاں اور برائیاں روک دیتی ہیں اور جن سے فساد کرنے والی بدترین عالم انسانیت محروم ہو جاتی ہے۔

— حضرت عائشہ نے سرکار دو عالمؐ کا یہ خطبہ نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "پروردگار کا ارشاد ہے کہ نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو قبل اس کے کہ تم دعا کرو اور میں قبول نہ کروں۔ تم سوال کرو اور میں عطا نہ کروں۔ تم فریاد کرو اور میں مدد نہ کروں۔" (ترغیب ۲/۲۳۲)

گویا امر و نہی سے غفلت کرنے والے افراد کسی طرح کی نیکی کے حقدار نہیں ہوتے ہیں نہ ان کی فریاد قابل سماعت ہوتی ہے۔

— دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کہ "اگر لوگ نیکیوں کا حکم نہ دیں گے اور برائیوں سے منع نہ کریں گے اور میرے اہلبیتؑ کے نیک افراد کا اتباع نہ کریں گے تو پروردگار ان پر بدترین افراد کو مسلط کر دے گا اور اس وقت نیک افراد کی دعا بھی قبول نہ ہوگی" (بحار ۱۰/۲۲)

— مولائے کائناتؑ نے اپنی آخری وصیت میں ارشاد فرمایا کہ "خبردار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کر دینا کہ خدا تم پر اشرار کو مسلط کر دے اور اس وقت تمہاری دعا مستجاب نہ ہو" (نہج البلاغہ)

— رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جب میری امت کی نگاہ میں دنیا عظیم ہو جائے گی تو

اسلام کی ہیبت سلب کر لی جائے گی اور جب امر و نہی سے غافل ہو جائے گی تو برکات وحی سے محروم کر دیا جائے گا۔ (کنز العمال حدیث ۶۰۰۰)

— امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو ورنہ عذاب الٰہی تمہیں بھی شامل ہو جائے گا (وسائل الشیعہ)

— ابن مسعود نے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا نقص یہ تھا کہ جب کسی ایسے آدمی سے ملاقات ہوتی تھی جو گناہوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور جب وہ حلقہ احباب و اصحاب میں شامل ہو جاتا تھا تو نہی عن المنکر نہ کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے دل ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے اور سب ملعون قرار پا گئے۔ لہٰذا خبردار تم اس فریضہ سے غافل نہ ہو جانا۔ (ترغیب ۲/۲۲۹)

— انس بن مالک کا بیان ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کو فائدہ پہونچاتا رہے گا جب تک وہ اس کے حق میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

لوگوں نے عرض کی کہ حضور یہ کوتاہی کیا ہے؟

فرمایا کہ منکرات کو علی الاعلان سامنے آنے دے اور ان کی اصلاح نہ کرے۔ یہی کلمہ توحید کی سب سے بڑی توہین و تحقیر ہے۔ (ترغیب ۲/۲۲)

۲۵۔ نجات از جہنم

سورۂ تحریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ایمان والو! اپنے نفس کو اور اپنے اہل کو اس آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اور جس پر وہ ملائکہ معین ہوں گے جو سخت مزاج اور تند و تیز ہیں اور حکم خدا کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔" (تحریم ۔ ۶)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رونا شروع کر دیا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں اپنے کو جہنم سے نہیں بچا سکتا ہوں تو اپنے اہل کو کس طرح بچاؤں گا؟

فرمایا تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ انہیں نیکیوں کا حکم دو اور برائیوں سے روکو جس طرح خود عمل کرتے ہو۔ (بحار ۱۰۰/۱۳)

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ میں اپنے نفس کو تو بچا سکتا ہوں اپنے اہل کو بچانے کا راستہ کیا ہوگا؟

فرمایا جن باتوں کا خدا نے حکم دیا ہے ان کا حکم دو اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے روکو۔ اب اگر انھوں نے مان لیا تو تم نے انھیں جہنم سے بچا لیا اور اگر انکار کر دیا تو تم نے اپنے فریضہ کو ادا کر کے اپنے کو بچا لیا۔ (وسائل ۱/ ۲۰۷)

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مشکل ترین عمل ہونے کے بعد بھی نقصان دہ بہرحال نہیں ہے جیسا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ امر و نہی سے نہ روزی رکتی ہے اور نہ موت قریب آتی ہے۔ (ترغیب ۳/ ۲۲)

امام جعفر صادقؑ نے بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ موت کو قریب کرتے ہیں اور نہ روزی کو دور۔ (وسائل ۱/ ۳۹۹)

مولائے کائنات کا ارشاد گرامی نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خدائی اخلاق میں شامل ہیں اور ان سے نہ موت قریب آتی ہے اور نہ روزی میں کوئی کمی پیدا ہوتی ہے "امر بالمعروف دسوسہ شیطانی ہے جس کے ذریعہ دشمن آدم، اولاد آدم کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ ونعوذ باللہ من شر الشیطان"

مناہی رسول اکرمؐ

بحث کے خاتمہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بعض منہیات کا تذکرہ کر دیا جائے جنھیں مناہی رسول اکرمؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن سے رسول اکرمؐ نے منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں تمام چیزیں محرمات میں داخل نہیں ہیں اور بعض چیزیں صرف مکروہات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس فہرست سے اخلاق سازی، اصلاح معاشرہ اور تہذیب نفس کا بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ بات کی خاطر سرکار دو عالمؐ کے مناہی اور ممنوعہ کردہ امور حسب ذیل ہیں

- سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا۔
- ریشم کا کپڑا پہننا (مردوں کے لئے)
- نشہ میں دھت شرابی، مجسمہ ساز، چودہ گوٹ کھیلنے والا اور شطرنج کے کھلاڑی کو سلام کرنا۔
- بالیوں کے دانوں کو تر دانوں کے عوض بیچنا۔
- پھلوں کو پکنے سے پہلے بیچنا۔
- خرما کو زرد یا سرخ ہونے سے پہلے فروخت کرنا۔
- بچہ کو جانور کے شکم ہی میں فروخت کرنا۔
- قبروں کے اندر گچکاری کرنا۔
- ضرورت سے زیادہ سوال کرنا۔
- مال کا برباد کرنا۔
- ماں کی نافرمانی کرنا۔
- بچیوں کا زندہ دفن کر دینا۔
- فضول قیل و قال کرنا۔
- رکوع کی حالت میں گدھے کی طرح گردن جھکا دینا۔
- رات کے وقت پھل توڑ لینا کہ مساکین نہ دیکھنے پائیں۔
- نئے مکان کی خریداری یا جنات کے خوف سے جانور ذبح کرنا۔
- نماز یا سلام میں کوتاہی کرنا کہ صرف علیک کہہ دیا اور علیک السلام نہیں کہا۔
- خریداری کی نیت کے بغیر دام بڑھانا۔
- لوگوں سے کٹ کر رہنا۔
- ظالم کی مدد کرنا۔
- بادشاہ ظالم کے فرمودات میں سہولت پیدا کرنا۔
- دنیا کی خاطر دنیا دار کا احترام کرنا۔

- ہمسایہ کی ایک بالشت زمین میں بھی خیانت کرنا۔
- قرآن پڑھنا اور اس پر عمل نہ کرنا۔
- عورت یا مرد یا بچہ کے پیچھے سے بدفعلی کرنا۔
- کسی کافر عورت سے بھی زنا کرنا۔
- ہمسایہ کے گھر میں تاک جھانک کرنا۔
- مہر کے سلسلہ میں عورت پر ظلم کرنا کہ اس طرح نکاح بھی ایک طرح کا زنا ہو جاتا ہے۔
- حق بات کی گواہی پر پردہ ڈالنا
- دو بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا۔
- مسلمان فقیر کی غربت کی بنا پر توہین کرنا۔
- حرام مال کمانا اور پھر کار خیر کرنا۔
- نامحرم عورت سے بیہودہ مذاق کرنا۔
- ہمسایہ کو عاریتاً برتن دینے سے انکار کر دینا۔
- مسلمان کو طمانچہ مارنا۔
- بادشاہ ظالم کی طرف سے تازیانہ اٹھانا۔
- چغلخوری کرنا۔
- کسی پاکیزہ کردار انسان پر زنا کی تہمت لگانا۔
- شراب پینا۔
- سور کھانا۔
- امانت میں خیانت کرنا۔
- جھوٹی گواہی دینا۔
- غلاموں اور نوکروں کی بات پر توجہ نہ دینا۔
- شہرت یا دولت کے لئے تلاوت قرآن کرنا۔
- مرد و عورت کے ناجائز تعلقات کے لئے دلالی کرنا۔

- چوری کا مال خریدنا۔
- مسلمان کو دھوکہ دینا یا ملاوٹ کرنا
- کسی کے راز کو فاش کرنا۔
- کسی عورت کے اوصاف بیان کر کے مرد میں بدکاری کا جذبہ پیدا کرانا۔
- کسی نامحرم عورت کو نظر بھر کر دیکھنا۔
- دنیا کو دکھانے یا سنانے کے لئے لوگوں کو کھانا کھلانا۔
- عورت کا شوہر کے علاوہ کسی بھی مرد کو نظر بھر کر دیکھنا۔
- مرد کا عورت کو غلط چلنے پر مجبور کرنا۔
- عورت کا بلاوجہ مطالبہ طلاق کرنا۔
- امامت جماعت میں ماموین کا خیال نہ کرنا۔
- ضرورت مند انسان کو باوجود امکان قرض نہ دینا۔
- قرض لینے کے بعد [illegible] کرنا۔
- [illegible] ذخیرہ کرنا۔
- دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا کرا دینا۔
- جنابت کی حالت میں کھانا پینا۔
- دانتوں سے ناخن کاٹنا۔
- حمام میں مسواک کرنا۔
- نماز میں فضول کام انجام دینا۔
- صدقہ دے کر احسان جتانا۔

(میزان الحکمۃ جلد ۱۰، ص ۲۰۵ تا ۲۲۴)

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

تولا و تبرا

اولیاء خدا سے محبت کرنے کا نام ہے تولّا اور دشمنان دین و مذہب سے بیزاری کا نام ہے تبرّا۔

اس فریضہ کو محبت اور نفرت یا مودت اور برائت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن محبت درحقیقت قلبی جذبات کا نام ہے اور قلبی صفات تمام امور ذہنی [illegible] نہیں لائے جاسکتے ہیں۔ یہ کیفیات حالات کی بنا پر خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور انہیں دنیا کا کوئی [illegible] نہیں روک سکتا ہے۔

اسلام کا مقصد روح و نفس کی منزل میں یہ قلبی حدیں [illegible] اسے عقائد اور [illegible] میں شمار کیا جاتا۔

اسلام کا مقصد اس کا عملی اظہار ہے جس کے لئے [illegible] میں جگہ دی گئی ہے اور اسے اسلامی اعمال و عبادات میں شمار کیا گیا ہے۔

اس عبارت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تولا محبت کا عملی اظہار ہے [illegible] عداوت اور نفرت کا عملی اعلان۔

[illegible] کی محبت عملی اظہار سے الگ ہو جاتی ہے [illegible] ایک حد تک [illegible] اس طرح دشمنان دین و مذہب سے نفرت عملی [illegible] سے جدا ہو جائے [illegible] سکتی ہے [illegible] ہیں ہے اور اسلام اپنے قوانین کو جذبات کی سرحد سے [illegible] رکھنا چاہتا ہے اس کا اصرار یہ ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی مرضی کے مطابق عمل بھی کیا جائے تا کہ عمل [illegible] محبت کا عملی [illegible] جس سے [illegible] دوری، [illegible] کی جائے تا کہ یہ دوری ہی برائت کا عملی اظہار ہو سکے۔

تولا و تبرا کے معاملہ میں بعض حلقوں میں ضرورت سے زیادہ حساسیت پیدا کر چکے ہیں اور ان سے ایک طرح کے تفرقہ کی بو آنے لگی ہے۔ حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ [illegible] الفاظ قرآن میں [illegible] مقدس [illegible] فرما دیا ہے اور [illegible] کے مقابلہ میں [illegible] حساسیت کوئی قیمت نہیں رکھتی ہے [illegible] الفاظ کو [illegible] کا حامل [illegible] سکتا ہے۔ بلکہ درحقیقت [illegible] کو محبت یا نفرت [illegible] سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہرحال الفاظ کو محبوب قرار دیا جائے یا قابل نفرت۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں جذبات انسانی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہیں اور ان کے بغیر مذہب کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ بلکہ واضح لفظوں میں [illegible] سکتا ہے کہ [illegible] اور [illegible] اصل میں [illegible] تبرا ہے کہ منافق حقیقت محبت کا اظہار تو کر سکتا ہے لیکن باطل سے بیزاری کا اعلان نہیں کر سکتا ہے جیسا کہ سورہ مبارکہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"یہ منافقین صاحبان ایمان سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے شیاطین کی خلوت میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم تو فقط [illegible] ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" (بقرہ ۱۴)

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین تولا کا اعلان تو کر سکتے ہیں لیکن تبرا ان کے [illegible] سے باہر ہے اور یہ صرف [illegible] ایمان و اخلاص کا کام [illegible] ہے۔

اسلام کے دیگر فروعی کی طرح تولا و تبرا کو بھی متعدد امتیازات حاصل ہیں [illegible] ان [illegible] اس مقام پر روشنی کی جا رہی ہے۔

[illegible] الہیہ

[illegible] طرح [illegible] اور [illegible] مگر [illegible] کے [illegible] میں [illegible] سب سے پہلے [illegible] شامل ہیں۔ اسی طرح تولا و تبرا بھی [illegible] کا ایک حصہ ہیں [illegible] کہ [illegible] کا حق [illegible] ہوتا ہے، اور تولا و تبرا کا تعلق اعلیٰ ترین شخصیت

سے ہے۔ اور اگر جس قدر آسان ہے تولّا اسی قدر مشکل ہے کہ اس سے انسان کی اپنی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور اسی طرح یہی جس قدر آسان ہے تبرّا اسی قدر مشکل ہے کہ اس سے اختلافات کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پروردگار عالم نے تولّا کا بھی اعلان فرمایا ہے اور تبرّا کا بھی تاکہ یہ عمل عبادت بننے سے پہلے سیرتِ معبود بن جائے۔

اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایک ہی عمل ایک اعتبار سے عبادت ہو اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے سنت الٰہیہ ہو، جس طرح کہ صلوات کا معاملہ ہے کہ صلوات عمل خدا بھی ہے اور عمل ملائکہ بھی اور پھر فریضہ صاحبان ایمان بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا اور ملائکہ کے بارے میں اس کا اعلان بطور رحمت و سیرت ہوا ہے اور صاحبان ایمان کے بارے میں بطور فریضہ۔ اس کے علاوہ پروردگار کی طرف سے صلوات نزول رحمت ہے اور صاحبان ایمان کی طرف سے دعائے رحمت۔

تولّا اور تبرّا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ اپنے دوستوں سے خدا بھی محبت کرتا ہے اور صاحبان ایمان بھی۔ دشمنان خدا سے خدا بھی نفرت کرتا ہے اور صاحبان ایمان بھی۔ لیکن دونوں کے تولّا اور تبرّا کے معیار میں بھی فرق ہے اور طریقۂ اظہار میں بھی۔

پروردگار تولّا کا اظہار نسبت رحمت، عصمت، کرم، نزول رحمت، وغیرہ کی شکل میں کرتا ہے اور بندے اس کا اظہار اتباع، پیروی، اطاعت، فرمانبرداری وغیرہ کے اداروں سے کرتے ہیں۔

یہی حال تبرّا کا بھی ہے کہ پروردگار کے یہاں اس کا اظہار مسجود العوام میں ... نجاست، قتل، حبط اعمال، لعنت، مردودیت وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے اور صاحبان ایمان اس کا اظہار شخصیت سے کنارہ کشی، اعمال سے بیزاری اور ایسے افراد سے علیحدگی کی شکل میں کرتے ہیں کہ ایسے افراد کو کسی طرح کا منصب نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی حال میں ان کی بیعت کی جا سکتی ہے، اور نہ ان سے تعاون کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

پروردگار کے تولّا و تبرّا کی طرف حسب ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے

- "مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا اب پروردگار کی طرف سے ان سے بیزاری کا اعلان کیا جا رہا ہے۔" (توبہ۔١)
- "اللہ و رسول کی طرف سے روز حج اکبر یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔" (توبہ۔٣)
- "جو شخص بھی اللہ، ملائکہ، مرسلین اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا بھی کافروں کا دشمن ہے۔" (بقرہ۔٩٨)
- "پروردگار توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (بقرہ۔٢٢٢)
- "اللہ نیک عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (آل عمران۔١٣٤)
- "اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (مائدہ۔٤٢)
- "پروردگار ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جم کر اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔" (صف۔٤)

ان کے علاوہ بے شمار مقامات ہیں جہاں محبت کرنے اور دور کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تولّا اور تبرّا ایک طرف صاحبان ایمان کا فریضہ ہے اور دوسری طرف پروردگار کا طریقہ اور یہی بات اس کی عظمت و جلالت کے لئے کافی ہے۔

٢۔ سیرت انبیاء

قرآن کریم نے انبیاء کرام کے تذکرہ کے ذیل میں بھی بعض افراد سے محبت اور بعض افراد سے نفرت اور بیزاری کا اعلان کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمل اس قدر مقدس اور پاکیزہ ہے کہ ایک طرف پروردگار نے اختیار کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کے نمائندے اور پاکیزہ کردار بندے گلے لگائے ہوئے ہیں۔

- ابراہیم نے ستارہ، چاند کے ساتھ سورج کو بھی ڈوبتے دیکھ لیا تو فرمایا کہ قوم والو! میں تمہارے شرک سے بری اور بیزار ہوں۔ (انعام۔٧٨)
- جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ آزر دشمن خدا ہے تو انہوں نے اس سے تبرّا کا اعلان کر دیا کہ

ابراہیم بہت نرم دل، تضرع کرنے والے اور بردبار تھے۔ (توبہ ۱۱۴)

• پیغمبرؐ! اگر یہ لوگ تکذیب ہی کرتے رہیں تو کہہ دو کہ تمہارے لئے تمہارا عمل ہے اور میرے لئے میرا عمل ہے۔ تم میرے عمل سے بیزار ہو اور میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں۔ (یونس ۴۱)

• ہود نے کہا کہ میں خدا کو بھی گواہ قرار دیتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ (ہود ۵۴)

• تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے پیروؤں کی سیرت نمونہ ہے کہ ان لوگوں نے قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے بیزار ہیں۔

۲۔ سیرت مرسل اعظمؐ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارا رشتہ سرکار دو عالمؐ سے اس رشتہ سے قدرے مختلف ہے جو باقی انبیاء و مرسلین کے ساتھ ہے۔

جملہ انبیاء و مرسلین سے ہمارا رشتہ ایمان اور عقیدہ کا رشتہ ہے لیکن ہم ان کے امتی نہیں ہیں اور نہ ان کا عمل ہمارے لئے واجب الاتباع ہے لیکن سرکار دو عالمؐ سے ہمارا رشتہ ذہنی ہے۔ ایمان کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی۔

اس لئے اگر کوئی شخص سیرت انبیاء و مرسلین کے بارے میں تشکیک پیدا کر سکتا ہے اور اسے سابق انبیاء کا طرز عمل قرار دے کر اس سے فرار کیا جا سکتا ہے تو قرآن مجید میں پیغمبر مرسل اعظمؐ کا تذکرہ بھی موجود ہے جس سے امت اسلامیہ کے لئے اسوۂ حسنہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

• "اللہ اور رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔" (توبہ)

• "پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ خدا صرف ایک ہے اور میں تمہارے شرک سے بری اور بیزار ہوں۔" (انعام ۱۹)

ان آیات کے علاوہ سرکار دو عالمؐ کی حیات میں تولّا اور تبرّا کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ کبھی آپ نے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ یہ مجھ سے ہیں۔ میں ان سے ہوں۔ یہ میری

پارۂ جگر ہے۔ یہ میرے جسم کے لئے سر ہے۔ یہ میرے اہلبیتؑ میں شامل ہے۔ اس سے زیادہ روئے زمین پر کوئی سچا نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہے۔ وغیرہ

اور کبھی اس کا اظہار عملی طور پر کیا کہ بچوں کے لئے خطبہ کو قطع کر دیا۔ نواسہ کے لئے سجدہ کو طول دے دیا۔ عید کے موقع پر ناقہ بن گئے۔ بیٹیؑ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ علیؑ کو دوش پر بلند کر لیا۔ وغیرہ

یہی حال نفرت اور بیزاری کا ہے کہ کبھی آپ نے [illegible] کے بارے میں فرمایا کہ خدایا! میں خالد کے عمل سے بیزار ہوں۔ اور کبھی عملی طور پر متعدد حاضرین سے کہہ کر "قوموا عنی" میرے پاس سے نکل جاؤ۔ میرے گھر میں جھگڑا کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے یا بعض افراد کو جیش اسامہ میں شامل کرکے اعلان کر دیا کہ اس سے انکار کرنے والے پر خدا کی لعنت ہے تاکہ تبرّا اور بیزاری کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کا واقعی اظہار لعنت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے جس طرح کہ مباہلہ کے میدان میں جھوٹے افراد سے بیزاری کا طریقہ کار بھی یہی اختیار کیا گیا تھا۔

۴۔ دعوت معرفت

اسلام نے اول روز سے مسلسل اس بات کی دعوت دی ہے کہ انسان خدا سے معرفت کا رشتہ قائم کرے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ امر بھی محتاج وضاحت نہیں ہے کہ اسلام نے اس فیصلہ کو بھی مسلمانوں کے حوالہ نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی پسند سے افراد کا انتخاب کریں اور انھیں قابل محبت [illegible]

بلکہ یہ کام بھی آیات اور روایات کی روشنی میں انجام دینا ہے کہ مسئلہ اپنے دوست یا دشمن کا نہیں ہے۔ مسئلہ اولیاء خدا اور دشمنانِ خدا کے تعین کا ہے اور اولیاء و اعداء الٰہی کا تعین پروردگار کو کرنا ہے۔ مسلمانوں کو نہیں کرنا ہے۔

جناب ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن مجید کا بیان اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جب ان پر آزر کا دشمن خدا ہونا واضح ہوگیا تو انھوں نے تبرّا کا اعلان کردیا اور یہ ثابت کردیا کہ معرفت کے بغیر تولّا یا تبرّا کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۵۔ کردار سازی

اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کو جس شخص سے محبت ہوجاتی ہے اس کے کردار کو اپنانے کی خواہش خود سے پیدا ہوتی ہے اور جس شخص سے نفرت ہوجاتی ہے اس کے طرز عمل سے بالعموم طور پر علیحدگی کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور یہ انسانی زندگی میں کردار سازی کا بہترین طریقہ ہے کہ اسلام نے نیک کردار افراد سے محبت کو واجب کردیا ہے تاکہ انسان ان کے اعمال کی پیروی کرے اور بدکردار افراد سے نفرت کو واجب کردیا ہے تاکہ ان کے اعمال سے دوری اور کنارہ کشی اختیار کرے اور اس طرح لاشعوری طور پر صاحب کردار ہوجائے۔

۶۔ صفائے نفس

قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ "خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے ہیں۔"

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس دل میں کسی کی محبت آجاتی ہے اس میں اس شخص کی عداوت نہیں آسکتی ہے اور جس دل میں کسی شخص کی عداوت آجاتی ہے اس میں اس شخص کی محبت نہیں آسکتی ہے۔ اور اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک دل میں محبت کو جگہ دیدی جائے اور دوسرے دل میں عداوت رکھ دی جائے۔ محبت کا ظرف محبت کے شایانِ شان ہوگا اور عداوت کا مرکز عداوت کے قابل ہوگا۔

اب چونکہ اولیاء خدا سے محبت کرنا ہے اور دشمنانِ خدا سے نفرت کرنا ہے لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ نفس پاکیزہ ہو ورنہ نجس اور ناپاک ضمیر میں نہ اولیاء خدا کی محبت آسکتی ہے اور نہ دشمنانِ خدا کی عداوت۔

اسلام نے اس تولّا و تبرّا کے ذریعہ مسلمانوں کے نفس کو پاکیزہ بنانا چاہا ہے تاکہ مسلمان اپنے نفس کو اولیاء اللہ کی محبت اور دشمنانِ خدا کی عداوت کے شایانِ شان بناسکے اور اس طرح تولّا و تبرّا کے عملی فرائض نفس انسانی کی تطہیر کا وسیلہ بن جائیں اور انسان پاکیزہ نفس ہوجائے۔

۷۔ امتیاز خیر و شر

انسانی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے خیر و شر کا امتیاز۔

وہ انسان، انسان کہے جانے کے قابل نہیں ہے جس کے پاس یہ سرمایہ نہ ہو اور وہ صاحب عقل، صاحب عقل نہیں ہے جو اس شعور سے محروم ہو۔

دنیا میں کتنے ہی نادان افراد پائے جاتے ہیں جو اس شعور سے محروم ہوگئے ہیں اور ان کی زندگی میں خیر سے نفرت داخل ہوگئی ہے یا شر سے محبت شامل ہوگئی ہے۔

اسلام اپنے چاہنے والوں کو اس بلا سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے لہٰذا اس نے تولّا اور تبرّا واجب کردیا تاکہ انسان ہمیشہ خیر و شر میں امتیاز کرتا رہے اور قابل محبت افراد کو دل میں رکھنے کا حوصلہ پیدا کرے اور قابل نفرت افراد کو دل کے ہر گوشہ سے نکال کر پھینک دے۔

۸۔ دعوت اتباع

قرآن مجید نے سورۂ مبارکۂ آل عمران آیت ۳۱ میں صاف اعلان کردیا ہے کہ "اگر تمھیں خدا سے محبت ہے تو رسولؐ کا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت بھی کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بھی معاف کردے گا۔"

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ محبت انسان کو اتباع کی دعوت دیتی ہے اور اس شخص

اس کے برعکس برائت کا مسئلہ ہے کہ اگر مسلمان دشمنانِ خدا کے اعمال و افعال، حرکات و سکنات اور گفتار و رفتار کی مخالفت نہیں کرتا ہے تو اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اس نے برائت اور بیزاری کا عمل نہیں کیا اور یہ بیزاری اسی طرح کا ایک دعویٰ ہے جس طرح اتباع کے بغیر محبت کا دعویٰ ایک دعوے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

۹۔ سببِ مغفرت

اسی آیت کریمہ میں یہ اعلان بھی ہو گیا ہے کہ اگر تم محبت الٰہی کی بنیاد پر رسولؐ کا اتباع کرو گے تو پروردگار تم سے محبت بھی کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی معاف کر دے گا۔ گویا محبت الٰہی میں تین طرح کے ثمرات پائے جاتے ہیں:

ا۔ یہی محبت انسان کو اتباعِ رسولؐ پر آمادہ کرتی ہے۔

ب۔ یہی محبت انسان کو محبوبِ خدا بنا دیتی ہے کہ پروردگار اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

ج۔ یہی محبت انسان کے گناہوں کو معاف کرا دیتی ہے اور پروردگار اتباعِ رسولؐ کی وجہ سے بے شمار گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ محبت کے اثرات ہی سے برائت کے اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کوئی شخص دشمنِ خدا اور رسولؐ سے نفرت نہیں کرتا ہے تو نہ اس کا کردار محبوبِ الٰہی ہو سکتا ہے نہ اس کے گناہ معاف کیے جا سکتے ہیں۔ مغفرت کی تمنا ہے تو دوستانِ خدا کی محبت کے ساتھ دشمنانِ خدا و رسولؐ سے برائت اور بیزاری کا اعلان بھی کرنا پڑے گا۔

۱۰۔ ادائے اجرِ رسالت

اسلام کی تاریخ اور قرآن مجید کے مضامین سے باخبر انسان جانتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم نے تبلیغِ اسلام کی راہ میں بے پناہ مشقتیں برداشت کرنے کے بعد بھی کسی طرح کے [illegible] کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ فریضہ ہمدردی اور مذہبی مجبوری سمجھ کر [illegible] حق کی تبلیغ کرتے [illegible]

کی کہ آپ نے بے حد زحمتیں برداشت کی ہیں۔ ہم اس کا اجر دینا چاہتے ہیں تو آپ نے حکمِ الٰہی کے مطابق ان کے لئے اجرِ رسالت کی تعیین کر دی اور وہ تمام کا تمام محبتِ اہلبیتؑ۔

ظاہر ہے کہ قوم کی طرف سے اجرت لینے کا مطالبہ اس بات کی دلیل تھا کہ قوم رسالت کے خدمات سے آشنا ضرور تھی اور اس کا خیال یہ تھا کہ اجرت میں ممکن کامیاب عطا کرنے والے انسان کی اجرت دنیا کی دولت یا حکومت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قدرت نے اجرت کا اعلان کیوں کیا؟

قدرت کا یہ اعلان ان کے مطالبہ کی تصدیق نہیں بلکہ تردید ہے۔ ان کے خیال میں رسالت کی اجرت دولت، عورت یا حکومت تھی۔ قدرت نے اس تصور کی مکمل تردید کر دی اور یہ اعلان کر دیا کہ رسالت کی اجرت صرف محبتِ اہلبیتؑ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ اولیاء اللہ اور اہلبیتِ رسولؐ سے محبت کرنے والا صرف محبت نہیں کرتا ہے بلکہ رسولِ اکرمؐ کی اجرت بھی ادا کر رہا ہے جو ایک عظیم ترین شرف ہے اور جس سے بالاتر کوئی شرف نہیں ہے۔ جس طرح کہ ان سے نفرت اور عداوت رکھنے والا ان کا ہی دشمن نہیں ہے بلکہ رسولِ اکرمؐ کا دشمن ہے اور رسالت کے حقوق رسالت کا غاصب اور ان کی متاعِ شریعت کا ناجائز استعمال کرنے والا ہے جس پر کسی طرح کے [illegible] کا استحقاق نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ دلیلِ عظمتِ کردار

سورۂ مبارکۂ مریم آیت ۹۶ میں پروردگارِ عالم نے واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے
"جن لوگوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال انجام دئے، ہم عنقریب لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت قرار دے دیں گے۔"

جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف سے خاصانِ خدا کی محبت کا [illegible] ان کے کردار کا بھی اعلان ہے اور گویا کہ پروردگار نے اس طرح ان [illegible]

معرفت کا حکم ان کے غیر مومن اور بدکردار ہونے کا اعلان ہے کہ پروردگار کسی مومن صالح سے عداوت کا حکم نہیں دے سکتا ہے۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے چاہنے والوں کو باخبر کیا تھا کہ عنقریب شام کا حاکم تمہیں دو باتوں پر مجبور کرے گا۔

۱۔ مجھے برا بھلا کہو۔

۲۔ مجھ سے بیزاری اختیار کرو۔

دیکھو خبردار مجھے برا کہہ لینا کہ میں اسے برداشت کر لوں گا کہ اس کا تعلق زبان سے ہے اور مجھے تمہاری زندگی اور بقا منظور ہے۔ لیکن مجھ سے بیزاری اختیار نہ کرنا کہ یہ ایک قلبی امر ہے اور مقام تقیہ میں بھی دل کو طیب و طاہر اور صاحب ایمان رہنا چاہیئے۔ اور مجھ سے برائت اس لئے جائز نہیں ہے کہ میں دین اسلام پر پیدا ہوا ہوں۔ جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ ایمان ذکر مرتبہ بڑی چیز ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقتاً دین اسلام پر پیدا ہوا ہے تو اس سے برائت ہرگز جائز نہیں ہے اور اسے بھی سعادت و عداوت کا مرکز نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ سبب نصرت الٰہی

سرکار دو عالم نے اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر مسلسل غدیر تک جب بھی اہلبیت کی عظمت و جلالت کا اعلان کیا ہے اور ان کے حق میں دعا کی ہے تو اس کا عنوان یہی ہوتا تھا کہ "خدایا ان سے محبت کرنے والوں سے محبت کرنا اور ان سے عداوت رکھنے والوں کو اپنا دشمن قرار دینا، اور ان کے مددگار کی مدد کرنا"۔ گویا کہ اولیاء اللہ کی محبت انسان کو ان کی امداد پر آمادہ کرتی ہے اور ان کی نصرت اور امداد انسان کو نصرت الٰہی کا حقدار بنا دیتی ہے۔ انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر دنیا کا کوئی کام امداد الٰہی کے بغیر انجام نہیں دے سکتا ہے۔ "خلق الانسان ضعیفا" (انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے) اور کمزور شخص کو ہر حال سہارا چاہیئے۔ اور سہارے کی دنیا میں پروردگار سے بالاتر کوئی سہارا نہیں ہے لہذا انسان خدائی سہارے کی راہ میں جو قدم آگے بڑھاتا ہے تو سرکار دو عالم کا یہ ارشاد نگاہ کے سامنے آ جاتا

کہ اللہ اہلبیت کی مدد کرنے والوں کی مدد کرتا ہے اور اس مدد کا جذبہ محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا ولائے اہلبیت نصرت الٰہی کے حصول کا مصدر و مرکز ہے جس کے بغیر انسان نصرت الٰہی کا حقدار نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پروردگار اپنے رحم و کرم کی بنا پر بلا استحقاق بھی بعض نالائق بندوں کو سہارا دے دیا کرتا ہے اور انہیں یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ہم دوسروں کے سہارے کے محتاج نہیں رہ گئے ہیں یا ہمیں بھی نصرت الٰہی حاصل ہو گئی ہے۔ حالانکہ رسول اکرم نے جس نصرت کی دعا کی ہے اور جس کے بارے میں محبان اہلبیت کو دعا دی ہے۔ اس کا مرتبہ اس فطری اور عمومی سہارے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

۱۳۔ علامت ایمان

سورۂ مبارکہ آل عمران آیت ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "صاحبان ایمان کو یہ حق نہیں ہے کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست قرار دیں کہ اس طرح انسان کا رشتہ خدا سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔"

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار مومنین کے لئے یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ وہ غیر مومنین سے رشتہ محبت قائم کریں اور ان سے تولا کا رشتہ جوڑیں اور ظاہر ہے کہ جب معبود مومنوں کے لئے یہ بات پسند نہیں کرتا ہے تو خود اپنے لئے کس طرح ممکن ہے کہ غیر مومنین کی تولا کا حکم دے دے۔ لہذا اس کی طرف سے تولا کا حکم اس بات کی علامت ہے کہ جس کی نگاہ میں صاحب ایمان ہے اور اس کا ایمان کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے اور اسی کے طفیل میں محبت کرنے والے کا ایمان بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ غیر مومن کے دل میں آل محمد کی محبت نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔

تولا ہی کی طرح تبرا کا بھی حال ہے کہ جس طرح کافر سے تولا جائز نہیں ہے اسی طرح مومن سے تبرا بھی جائز نہیں ہے اور ہر شخص کا جو دشمن سے تبرا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسان صاحب ایمان نہیں ہے جس طرح کہ ہر منافق کے ساتھ برتاؤ کی بنا پر سرکار دو عالم نے خالد بن ولید کے بارے میں فرمایا تھا کہ "خدایا میں ان کے اعمال سے برائت کا اعلان کرتا ہوں"

خالق کو سپرد کرنے کے بجائے پروردگار سے فریاد کرنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ اب نقصان قابل علاج نہیں رہ گیا ہے اور اس کے دل میں وہ روح ایمان نہیں ہے جو مومن کے جان و مال کے احترام پر آمادہ کرتی ہے، اور جس کے بعد انسان اس طرح کے اقدامات نہیں کرتا ہے جیسا ظالم نے کیا ہے۔

۴۱۔ سورۂ مبارکۂ بقرہ آیت ۱۶۷ میں ارشاد ہوتا ہے

"اس موقع کو یاد کرو جب پیر اپنے مریدوں سے تبرّا کریں گے عذاب نگاہوں کے سامنے ہوگا، اور تمام وسائل نجات منقطع ہو چکے ہوں گے اس وقت مرید کہیں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں واپس کر دیا جاتا تو ہم ان سے اسی طرح تبرّا کرتے جس طرح انھوں نے ہم سے بیزاری کا اعلان کیا ہے۔ پروردگار اس طرح ان کے اعمال کو حسرت ناک بنا کر پیش کرتا ہے اور اب یہ سب جہنم سے نکلنے والے نہیں ہیں"

آیت مبارکہ سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تبرّا ایک شریف ترین عمل ہے جس سے کنارہ کشی کرنے والوں کو روز قیامت حسرت دائم کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تبرّا کرنے والوں کے لئے کوئی وسیلۂ نجات نہ ہوگا، اور ان کے سارے وسائل منقطع ہو چکے ہوں گے۔

تبرّا کرنے والوں کا انجام جہنم ہے اور ان کو جہنم سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ پروردگار جملہ صاحبان ایمان کو دشمنان خدا سے تبرّا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے اور روز قیامت کی حسرت سے محفوظ رکھے۔!

معاملات

اصول و فروع کے ذیل میں عام طور سے اسلام کے پانچ مخصوص عقائد اور دس مخصوص عبادات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے کل عقائد پانچ اصول میں اور کل فروع دس عبادات میں منحصر ہیں حالانکہ یہ بات ہرگز نہیں ہے۔

اسلام کے عقائد میں یہ پانچ امور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن عقائد کی دنیا اس سے کہیں زیادہ وسیع تر ہے جس میں بہت سے دیگر امور بھی شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تصور ہی سے یہ تصور بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بیشتر صاحبان ایمان کے سامنے جب بداء یا رجعت کا ذکر آتا ہے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ ان عقائد کا کوئی ذکر اصول دین میں نہیں آیا ہے حالانکہ ہر صاحب نظر جانتا ہے کہ عقیدہ کا اصول دین میں داخل ہونا اور ہے اور عقیدہ کا عقیدہ ہونا اور ہے۔ بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں اصول دین کی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن ان کا عقیدہ رکھنا بہر حال ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان صاحب ایمان نہیں ہو سکتا ہے۔

یہی حال فروع دین کا بھی ہے کہ فروع دین درحقیقت اسلام کے تمام عملی احکام کا نام ہے۔ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہمارے یہاں فروع دین میں صرف عبادات کو شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دس امور کو یاد کرنے کے بعد اپنے کو فروع دین کے بارے میں مکمل عارف شریعت تصور کر لیتا ہے۔ جب کہ اسلام ایک ایسا جامع مذہب ہے جس میں کسی شعبۂ زندگی کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور ہر شعبۂ زندگی کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔

اسلامی قوانین میں اگر قعر دریا میں رہنے والی مچھلی کا حکم موجود ہے تو آسمان پر

چمکنے والے چاند اور سورج کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس کے دامن میں اگر ذرۂ خاک کی جگہ ہے تو بلندیٔ کوہ کی بھی جگہ ہے۔

وہ حقوق نفس دینے کی بھی بات کرتا ہے اور حقوق اللہ کی عظمت کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اس کی جامعیت کا اندازہ کوئی قانون نہیں لگا سکتا ہے اور نہ کوئی قانون ساز ادارہ اس کی وسعت و ہمہ گیری کا تصور کر سکتا ہے۔

اسلام کی جامعیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: عبادات۔ اموال۔ احوال۔

احوال کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ انسان کے حالات خود اپنی ذات کے ساتھ۔ اس باب میں تمام ذاتی اخلاقیات صداقت، امانت، شجاعت، عدالت وغیرہ کے ساتھ اقرار کا شعبہ بھی شامل ہو جاتا ہے جہاں انسان اپنے اوپر کسی کے حق کا اقرار کرتا ہے اور وہ حق اقرار کی بنیاد پر اس پر ثابت ہو جاتا ہے۔

۲۔ انسان کے حالات پروردگار کے ساتھ۔ اس قسم میں عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، نذر، عہد، قسم وغیرہ سب شامل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ انسان کے حالات دوسروں کے ساتھ۔ اس قسم میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر، نکاح، طلاق، حدود، دیات، قصاص، قضا، شہادت، وکالت وغیرہ جیسے امور شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔ انسان کے حالات حیوانات کے ساتھ۔ اس قسم میں شکار، ذبیحہ، سابقہ، تیر اندازی وغیرہ کے شعبے شامل ہیں۔

۵۔ انسان کے حالات دیگر مخلوقات کے ساتھ۔ اس قسم میں کھانے پینے کے احکام شامل ہیں۔

نوٹ: ان تمام مسائل کو دوسرے اعتبارات سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے وہ تقسیم اس سے زیادہ دقیق تر ہو کہ اس مقام پر بہت سے ابواب بھی احوال

میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن سردست اس تقسیم میں صرف انسانی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

اموال:

اس شعبۂ حیات میں بھی پانچ طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں:

ملکیت کے اقسام: انفرادی ملکیت، مشترک ملکیت، عوامی ملکیت، عمومی ملکیت، سرکاری ملکیت وغیرہ۔

۲۔ ملکیت کے اسباب: وراثت، تجارت، ہبہ، صدقہ، قرض، لقطہ وغیرہ۔

۳۔ ملکیت کا انتقال: تجارت، صلح، وقف، وصیت، وراثت وغیرہ۔

۴۔ ملکیت کی حفاظت: رہن، حوالہ، ضمانت، کفالت، امانت، عاریت، غصب۔

۵۔ خاتمۂ ملکیت: عتق (آزادیٔ غلام)، تدبیر، مکاتبہ۔

اعمال:

اعمال کے ذیل میں بہت سے دینیاتی امور بھی آجاتے ہیں لیکن اس وقت صرف ان امور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جہاں انسان کو صرف عمل انجام دینا ہوتا ہے جیسے اجارہ (مزدوری) کہ جہاں اجیر صرف عمل کرتا ہے۔ مالیات کا سلسلہ اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

جعالہ۔ جہاں بلا تخصیص فرد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو شخص بھی فلاں عمل انجام دیدیگا اسے اس قدر اجرت دی جائے گی۔

مضاربہ۔ جہاں ایک شخص دوسرے شخص کے مال سے کاروبار کرتا ہے اور نفع میں دونوں افراد حسب قرارداد شریک ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر ایک فریق کی طرف سے عمل کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اسی عمل نے اسے مضاربہ کا شریک بنا دیا ہے۔

مساقات۔ جہاں ایک انسان دوسرے کے کھیت کی سینچائی کا کام انجام دیتا ہے۔

مزارعہ۔ جہاں ایک انسان دوسرے کے کھیت میں کاشت کرتا ہے اور بعد میں حسب قرارداد اسے اس عمل کی اجرت مل جاتی ہے۔

امتیازات وخصوصیات

اسلامی تعلیمات میں جس طرح نظام عبادات بیشمار خصوصیات وامتیازات کا حامل ہے۔ اسی طرح نظام معاملات میں بھی بیشمار خصوصیات وامتیازات پائے جاتے ہیں جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

واضح رہے کہ عبادات اور معاملات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ عبادات میں قربۃً الی اللہ کی نیت ضروری ہے لیکن معاملات دنیا خدا سے غافل ہو کر دنیاداری کی بنیاد پر بھی انجام دئے جا سکتے ہیں۔ عبادت کی نیت میں ذرہ برابر بھی ریاکاری پیدا ہو جائے تو عمل باطل ہو جاتا ہے لیکن معاملات میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ وہ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے بھی انجام پا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود معاملات کی دنیاداری بھی قانون سے یکسر آزاد نہیں ہے بلکہ اس میں بھی بیشمار پابندیاں پائی جاتی ہیں کہ جن کے بغیر معاملہ کی صحت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے علمی اعتبار سے معاملات کو بھی دو حصوں پر تقسیم کیا ہے بعض معاملات دو طرفہ ہوتے ہیں کہ ایک فریق ایجاب کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا معاہدہ کو قبول کرتا ہے جیسے تجارت اور نکاح وغیرہ۔

اور دوسرے بعض معاملات بالکل یک طرفہ ہوتے ہیں اور دوسرے کسی شخص کی قبولیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے جیسے طلاق یا وقف وغیرہ کہ یہ امور ایک طرف سے انجام پاتے ہیں اور ان میں کسی کے قبول کرنے کی شرط نہیں ہوتی ہے۔

پہلی قسم کو عقود کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کو ایقاعات۔ لیکن اجمالی طور پر دونوں کو معاملات میں شامل کیا جاتا ہے اور معاملات کا دائرہ اسی طرح وسیع ہو جاتا ہے جس طرح عقائد میں وہ عقائد بھی شامل تھے جن پر اسلام کا دارومدار تھا اور وہ عقائد بھی شامل تھے جن کے بغیر ان اعراب کی طرح مسلمان تو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن صاحب ایمان نہیں

کہا جا سکتا تھا۔

۱۔ تفرقۂ حلال وحرام

دنیا کے نظاموں میں عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کاروبار کی دنیا حلال وحرام سے بالاتر ہے۔

تجارت پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ ہے چاہے جس چیز کی تجارت کی جائے صرف دوسرے افراد کے حق میں ظلم نہ ہونے پائے۔

لیکن اسلام کا قانون یہ نہیں ہے وہ پیسہ سے زیادہ دوسری جہات کو اہمیت دیتا ہے اور اس کی نظر میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں ہے جس میں ذاتی طور پر کوئی عیب پایا جاتا ہو یا اس سے سماج کے فاسد ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

مثال کے طور پر قحبہ خانہ کو دنیا کے نظام جائز قرار دے سکتے ہیں لیکن اسلام جائز نہیں کر سکتا ہے کہ اس سے انسانی شرافت وعفت کے تباہ وبرباد ہو جانے کا شدید ترین خطرہ ہے چنانچہ اسلام نے تجارت کی دنیا میں بھی حسب ذیل معاملات کو حرام قرار دے دیا ہے۔

ا۔ ذاتی طور پر نجس قرار پانے والی اشیاء کی تجارت جیسے شراب، غیر شکاری کتا، سور اور مردار کی تجارت

ب۔ غلیظ مال کی تجارت کہ یہ دوسروں کو نقصان پہونچانے کے مرادف ہے۔

ج۔ جس مال کی سماج میں کوئی قیمت نہ ہو اس کی تجارت کہ یہ کھلی ہوئی حرام خوری ہے۔

د۔ جس مال کا کوئی فائدہ سوائے حرام کے نہ ہو جیسے آلات لہو ولعب وقماربازی۔

ہ۔ سودی معاملات کہ سود خود بھی مفت خوری اور حرام خوری کی ایک واضح قسم ہے۔

۲۔ اخلاقیات

تجارت کی دنیا مادیات کی دنیا ہے لیکن اسلام نے اسے بھی اخلاقیات کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے اور اس کی نظر میں مادیات سے زیادہ اہمیت اخلاقیات کی ہے۔ مال انسانی

سزا اس کی بیان نہیں ہے لیکن اخلاقی اس کی مذمت کی شدید ہے۔

اخلاقیات کے تحفظ کے ذیل میں اسلام نے حسب ذیل امور کی ممانعت کو ضروری قرار دیا ہے:

بیچنے والے کا اپنے مال کی تعریف کرنا اور خریدار کا برائی کرنا، کہ پہلی قسم میں دھوکہ کا خطرہ ہے اور دوسری قسم میں رنجش اور دل آزاری کا اندیشہ ہے۔

ب۔ مسلمان بھائی کے معاملہ میں دخل دینا اور دام بڑھا کر جنس پر قبضہ کر لینا کہ اس طرح مادیت کے فائدہ کے ساتھ اسلامیت کا نقصان ہے۔

ج۔ طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان تجارت کرنا کہ وقت عبادت الٰہی اور دعا کا ہے اور اس میں بندہ کا رخ خدا کی طرف ہونا چاہیئے نہ کہ کاروبار کی طرف۔

د۔ معاملات میں قسم کھانا کہ ذات پروردگار اس بات سے بلند تر ہے کہ اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ قرار دیا جائے۔

ہ۔ ایسے مقام پر سودا کرنا، جہاں عیب معلوم نہ ہو سکے کہ اس طرح فریب کاری کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ طرفین کے شرائط

اسلام اس بات سے ہرگز راضی نہیں ہے کہ معاملات کو مادی معاملہ قرار دے کر جس طرح چاہے اجناس کا تبادلہ کر لیا جائے۔ وہ احتیاطی تدابیر کے طور پر طرفین میں سے شرائط کو دیکھنا چاہتا ہے جس کے بعد کسی طرح کا فساد نہ پیدا ہونے پائے۔ مثال کے طور پر

الف۔ طرفین کو بالغ ہونا چاہیئے۔ نابالغ بچہ کے معاملہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے جب تک کہ اس کی حیثیت ایک واسطہ اور ذریعہ کی نہ ہو جائے۔ نابالغ مستقل طور پر معاملہ کرنے کے قابل نہیں ہے اور نہ اسے احکام کا موضوع بنایا گیا ہے۔

ب۔ طرفین کو عاقل ہونا چاہیئے۔ دیوانوں کے معاملات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگرچہ مغربی معاشروں میں بعض دیوانوں کو بھی تاجر اور خریدار بنا دیا جاتا ہے۔

ج۔ طرفین کو ہوشمند ہونا چاہیئے۔ اگر معاملہ کرنے والے دونوں افراد عاقل ہیں

دیوانے نہیں ہیں لیکن اہمیت کا شعور نہیں رکھتے ہیں تو اسلام انہیں معاملہ کرنے کا حق نہیں دیتا ہے کہ اس طرح یا دونوں کا مال ضائع ہو جائے گا یا ایک فریق دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سارا مال لوٹ لے گا۔

د۔ قصد و ارادہ۔ معاملات کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ انجام پانا چاہیئے ہنسی مذاق کا معاملہ تجارت کے بجائے مستقبل میں منافرت کا ذریعہ بن سکتا ہے لہذا طرفین کو ہوش و حواس اور قصد و ارادہ کے ساتھ سودا کرنا چاہیئے۔

ہ۔ اختیار۔ مجبوری کی حالت میں معاملہ صحیح نہیں ہوتا ہے معاملہ کے لئے اختیار اور آزادی کا ہونا ضروری ہے تاکہ اپنے اختیار سے مال دے اور اپنے اختیار سے قیمت کا تعین کرے۔

۴۔ اموال کے شرائط

اسلام نے طرفین معاملہ کی طرح خود اموال میں بھی چند شرائط کا ہونا ضروری قرار دیا ہے کہ ان کے بغیر مال قابل تجارت نہیں ہے۔

ا۔ مال کی مقدار معلوم ہو اور قیمت بھی معلوم اور معین ہو۔

ب۔ بیچنے والا قبضہ دینے کی طاقت رکھتا ہو تاکہ معاملہ فوری طور پر ہو سکے۔

ج۔ وہ جملہ خصوصیات واضح ہوں جن کی وجہ سے قیمت میں فرق ہو سکتا ہے۔

د۔ مال پر دوسرے کا حق نہ ہو کہ اس طرح اس کی حق تلفی ہو جائے گی۔

ہ۔ جس شے کو فروخت کر رہا ہے وہ کوئی واقعی شے ہو ورنہ صرف منافع اور ... کی بیع نہیں ہو سکتی ہے۔

۵۔ اختیار فسخ

اسلام نے معاملات کو پاکیزہ بنانے کے لئے یہ انتظام بھی کیا ہے کہ جہاں کسی طرح کے نقصان کا اندیشہ تھا وہاں معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار بھی دے دیا ہے تاکہ معاملہ

مکمل آزادی۔ رضامندی اور دیانتداری کے ساتھ انجام پائے اور کسی طرح کا نقص یا عیب نہ پیدا ہونے پائے۔

اسلامی فقہ میں حسب ذیل قسم کے اختیارات پائے جاتے ہیں:

۱۔ اختیار مجلس۔ انسان نے جس مقام پر سودا کیا ہے اگر اسی وقت اسی مقام پر معاملہ کو ختم کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے۔ اسلام میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔

۲۔ اختیار خسارہ۔ اگر انسان یہ تصور کرتا ہے کہ عام معاملات کے اعتبار سے اس معاملہ میں کوئی خاص نقصان ہو رہا ہے تو اسلام نے اسے حق دیا ہے کہ معاملہ کو ختم کر دے چاہے اس وقت کوئی شرط نہ کی ہو بشرطیکہ عام طور سے لوگ اس شرط کو ضروری سمجھتے ہوں۔

۳۔ اختیار شرط۔ اگر معاملہ میں پہلے ہی سے طے کر لیا گیا ہے کہ طرفین یا کسی ایک فریق کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا تو اس شرط پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

۴۔ اختیار فریب کاری۔ اگر کسی فریق نے ملاوٹ یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے فریق کو دھوکہ دیا ہے تو اسلام اُسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار بھی دیتا ہے۔

۵۔ اختیار عیب۔ اگر معاملہ کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ جنس میں عیب پایا جاتا ہے تو خریدار کو معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ اختیار غصبیت۔ اگر معاملہ کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ سارا مال مالک کا نہیں ہے اور کچھ حصہ غصبی ہے تو خریدار اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے۔ سارا مال غصبی ہو تو معاملہ پہلے ہی سے باطل ہے۔ فسخ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ اختیار رویت۔ اگر خریدار نے مال کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس میں مطلوبہ صفات نہیں پائے جاتے ہیں تو اسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے موارد ہیں جہاں اسلام نے معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار دیا ہے اور سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کسی طرح کی فریب کاری یا بددیانتی نہیں چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاملات کی دنیا میں بھی انسان انسان رہے اور مسلمان ہے تو مسلمان رہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا منہ دیکھ کر انسان انسانیت یا شرافت نفس

سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس طرح مال کا فائدہ آل کی بربادی بن جائے۔

۶۔ لحاظ مستقبل

اسلام صرف یہ نہیں چاہتا ہے کہ معاملہ تمام ہو گیا تو بات تمام ہو گئی اور اب انسان کو جس طرح بھی ہو اس معاملہ کو برداشت کرنا پڑے گا بلکہ اس نے اگر ایک طرف اختیارات کی فہرست بنا دی ہے تو دوسری طرف اقالہ کا قانون بھی بنا دیا ہے کہ بیچنے والا یا خریدنے والا اگر اپنے معاملہ سے پشیمان ہو جائے تو اسے یہ اختیار رہے کہ معاملہ کو ختم کر سکے اور دوسرے فریق کو چاہیئے کہ اس کے اس مطالبہ کو قبول کر لے جس طرح کہ پروردگار بندہ کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔ ورنہ اگر انسان اسی ضد پر قائم رہ جائے کہ اب کوئی بات قبول نہ کرے گا تو اسے روز قیامت کے بارے میں بھی یہی سوچنا چاہیئے کہ اگر پروردگار نے بھی یہی فیصلہ کر دیا کہ اب غلطی ہو چکی ہے اور جہنم لازم ہو چکا ہے لہٰذا اب کوئی بات سنی نہیں جا سکتی ہے تو انسان کا انجام کیا ہوگا۔ وہ اگر پروردگار سے ایسے برتاؤ کی توقع رکھتا ہے تو اسے بھی بندگان پروردگار کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہیئے۔

۷۔ حق شفعہ

اسلام نے اپنے معاملات میں اس قدر اخلاقیات کو شامل کیا ہے کہ اگر ایک مال میں مختلف افراد شریک ہیں اور ایک شریک اپنے حصہ کو بیچنا چاہتا ہے تو اسے یہ آزادی نہیں ہے کہ جس طرح چاہے فروخت کر دے اور نیا خریدار پرانے شریک کا شریک بن کر اسے اذیت پہونچائے۔ بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ اگر پرانا شریک مال کو اسی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہے جس قیمت پر دوسرا شخص خرید رہا ہے تو اس کا حق مقدم ہے۔ اس لئے کہ اسے نئے خریدار کو برداشت کرنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے قابل برداشت نہ ہو۔ لہٰذا اسلام نے ایک طرف یہ چاہا کہ مالک کا مال ضائع نہ ہو اور اسے پوری قیمت مل جائے اور دوسری طرف یہ چاہا کہ پرانا شریک کسی نئی مصیبت میں مبتلا

نہ ہو لہٰذا اسے یہ اختیار رہے کہ وہ قیمت ادا کر کے اپنے کو نئی مصیبت سے بچا لے۔

۸۔ حرمت اکل مال بالباطل

اسلامی معاملات کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسلام نے ناجائز طریقہ پر مال کے استعمال کو حرام قرار دے دیا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ مال ملکیت میں داخل ہو تو صحیح راستوں سے داخل ہو اور ملکیت سے خارج ہو تو صحیح اصول کے ذریعہ خارج ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے لاکھوں روپیہ کے ہبہ اور ہدیہ کو جائز قرار دیا ہے لیکن سود کے ایک پیسہ کو بھی حرام کر دیا ہے۔

اس کی نگاہ میں سود کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تجارتی سود۔ جہاں کسی مال کو اسی مال کے عوض اضافہ کے ساتھ فروخت کیا جاتا ہے۔

۲۔ قرضی سود۔ جہاں ایک مقدار میں مال دے کر اس سے زیادہ مقدار میں واپسی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اسلام کا فلسفہ یہ ہے کہ جب معاوضہ میں برابر کا مال واپس لے لیا گیا ہے یا قرض میں پوری رقم واپس لے لی گئی ہے تو اب اضافہ کے مطالبہ کا کیا جواز ہے اور اس اضافہ کے مقابلہ میں صاحب مال نے کیا دیا ہے جس کے عوض میں اضافہ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اگر اس نے کم سے کم اس خطرہ ہی میں حصہ لیا ہوتا کہ اگر مال ضائع ہو گیا یا تجارت میں نقصان ہو گیا تو صاحب مال اس کا ذمہ دار ہو گا تو اسے اس خطرہ کا معاوضہ دے دیا جا سکتا تھا جیسا کہ مضاربہ میں ہوتا ہے جہاں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور ایک شخص کی محنت۔ اور فائدہ میں دونوں حصہ دار ہوتے ہیں لیکن نقصان کو صاحب مال برداشت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مالک کاروبار کرنے والے کے فائدہ میں شریک ہوتا ہے تو یہ شرکت اس خطرہ کا نتیجہ ہے جو اس نے خسارہ کی صورت میں مول لیا ہے۔ ورنہ مکمل مال واپس لینے کے بعد اضافہ کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے جب کہ اضافہ دوسرے کی محنت سے ہوا ہو اور مال محفوظ رہنے کی صورت میں اضافہ نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

۹۔ ایجاب و قبول

اسلام کا بنیادی قانون یہ ہے کہ معاملات کو ایجاب و قبول کے ذریعہ انجام پانا چاہیے۔ اس نے تجارت وغیرہ جیسے مالی مسائل میں ایجاب و قبول کی لفظی شرط کو ہٹا لیا ہے اور دنیا کے مالی معاملات کو معتبر قرار دے دیا ہے۔ تو جہاں زندگی اور نسلوں کا مسئلہ ہے وہاں اس سہولت کی اجازت نہیں دی ہے اور یہ شرط کر دی ہے کہ نکاح و طلاق جیسے مسائل کو ایجاب و قبول ہی کے ذریعہ انجام پانا چاہیے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی معاملات ہی سے ہے لیکن یہ معاملات وہ نہیں ہیں جہاں اختلاف اور فساد کا تعلق صرف مال دنیا سے ہو۔ یہاں فساد کا تعلق انسان کی عزت و آبرو اور نسلوں کی تباہی اور بربادی سے ہے لہٰذا اسلام نے یہ ضروری سمجھا کہ الفاظ کو درمیان میں لایا جائے اور الفاظ بھی اشارہ۔ کنایہ والے نہ ہوں تاکہ بات کو پوری صراحت اور پورے یقین کے ساتھ کہا جائے اور کسی طرح کا شک و شبہ نہ پیدا ہونے پائے کہ شک یا اختلاف زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

یہ تصور قطعاً غلط ہے کہ میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ بات وہاں صحیح ہوتی ہے جہاں مقصد خواہشات کی تسکین و تکمیل ہوتا ہے لیکن جہاں نسلوں کی بقا کا مسئلہ ہو اور پوری زندگی کو ایک رشتہ میں منسلک کیا گیا ہو وہاں ایسے الفاظ بہرحال ضروری ہیں جو رشتہ کو طرفین پر واضح کر دیں اور دونوں کو ان کی ذمہ داری سے باخبر کر دیں۔

ایسا نہ ہو کہ کام نکل جانے کے بعد مرد یہ کہے کہ میرے ذہن میں کسی نفقہ یا مہر یا دوسری ذمہ داریوں کا تصور بھی نہیں تھا اور عورت یہ کہے کہ میں نے اپنا سارا وجود اس لئے آپ کے حوالے کر دیا تھا کہ میرا خیال تھا کہ آپ اپنی کل کائنات میرے حوالے کر دیں گے۔

اسلام نے چاہا کہ الفاظ کے ذریعہ بات بالکل واضح ہو جائے تاکہ کسی طرح کے اختلاف یا عیاری و مکاری کو فروغ نہ حاصل ہونے پائے۔

یہی وجہ ہے کہ الفاظ [illegible]

بات کے تیقن کا اظہار ہوتا ہے اور کسی طرح کا دوسرا احتمال نہیں رہ جاتا ہے اور پھر ماضی کے الفاظ کو حال میں استعمال کرنے کے لئے قصد انشار کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ عقد ایک نقد اور یہ ذہن جائے بلکہ وقت حاضر میں ایک رشتہ قرار پائے اور اس کے تمام ارکان صد فیصد واضح ہوں اور کسی طرح کے اشتباہ کا امکان نہ ہو۔

اس مقام پر اسلام نے ایک اور احتیاط برتی ہے کہ اگر عقد کرنے والے زندگی کے تجربات سے ناآشنا ہیں تو انھیں تجربہ کار افراد کا سہارا دے دیا جائے تاکہ وہ کسی طرح کا دھوکہ نہ کھانے پائیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ عقد کے موقع پر طرفین کے پاس جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور تجربات کم۔ اور بزرگان خاندان کے پاس تجربات زیادہ ہوتے ہیں اور جذبات کم۔ لہذا اسلام نے چاہا کہ نہ صاحب معاملہ کے جذبات پامال ہونے پائیں اور نہ وہ بزرگوں کے تجربات سے محروم رہنے پائے۔

اب چونکہ عورت کے وجود میں جذبات زیادہ ہوتے ہیں اور ایجاب واقدام کا کام اسے انجام دینا ہوتا ہے لہذا اسلام نے احتیاط کا راستہ یہ اختیار کیا کہ لڑکی کنواری ہے تو باپ یا دادا سے اجازت ضرور لے لے کہ ان کے پاس تجربات حیات بھی ہیں اور وہ جذباتی طور پر اپنی بچی کے لئے بہترین اور خوشگوار زندگی کے خواہشمند بھی ہیں اور اس طرح اس کی زندگی جذبات کے طوفان میں بہنے سے محفوظ ہو جائے گی۔ ورنہ اگر وہ ازدواجی زندگی کا تجربہ کر چکی ہے اور طلاق یا بیوگی کی منزل سے گذر چکی ہے تو اب اسے کسی کی رائے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ صرف اپنی پسند سے عقد کر سکتی ہے۔ اسلام کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے ذاتی تجربہ کو بزرگوں کے مشورہ کا قائم مقام بنا دیا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ تجربہ مشورہ سے زیادہ قیمتی ہوا کرتا ہے۔

۱۰۔ معتدل بنیادیں

اسلام نے اپنے تمام معاملات میں اس نکتہ کو بھی پیش نگاہ رکھا ہے کہ کوئی [illegible]

[illegible] بنیاد نہ ہو اور جو بنیاد قرار دی جائے وہ معتدل اور متوازن ہو۔ چنانچہ اس نے نکاح کے واسطے بھی ایک معتدل بنیاد قرار دی ہے کہ کس قسم کی عورت [illegible] ہے اور کس قسم کی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔ کب تک نکاح باقی رہ سکتا ہے اور کب اسے توڑا جا سکتا ہے۔ کون سے اسباب ہیں جن میں نکاح فسخ [illegible] کون سے حالات ہیں جہاں عورت خود بخود حرام ہو جاتی ہے اور نکاح [illegible] نہیں پڑتی ہے۔

اور اسی طرح میراث میں بھی ترکہ کی ایک معتدل بنیاد قرار دی [illegible] کون سے افراد وارث ہو سکتے ہیں اور کن افراد میں وراثت [illegible] نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے بعد اصل میراث کے لئے بھی ایک [illegible] قرار دی ہے جس کے ذریعہ انسان کے تمام رشتوں کا بالترتیب احاطہ کر لیا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں میراث کی دو بنیادیں ہیں:

ایک وہ ذاتی قرارداد ہے جس میں طرفین ایک دوسرے سے [illegible] کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وراثت کے حقدار ہو جاتے ہیں۔

اور ایک وہ فطری رشتہ ہے جسے پیدا کرنے والے نے قائم کر [illegible] تین درجات قرار دئے ہیں:

— پہلے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتہ ولادت براہ راست [illegible] طبقہ میں ماں باپ اور نیچے کے طبقہ میں اولاد۔

— دوسرے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتہ ماں باپ کے [illegible] ہے۔ اس کے بالائی طبقہ میں ان کے ماں باپ ہیں اور نچلے طبقہ میں ان کی اولاد [illegible] کے بھائی بہن۔

تیسرے درجہ میں وہ افراد ہیں جن کا رشتہ ماں باپ کے والد [illegible] قائم ہوتا ہے [illegible] ان کی دوسری اولاد شامل ہے جیسے میت کا چچا یا ماموں [illegible]

اس متوازن بنیاد کو قائم کرتے وقت پھر اسلام نے حالات [illegible]

کہ وراثت پانے والے غریب ہیں یا امیر۔ نیک کردار ہیں یا بدکردار کہ اس طرح میرا
عالم میں منتشر ہو جائے گی اور کوئی شخص بھی وارث نہ ہو سکے گا۔ البتہ حالات اس حد تک بدل
ہو جائیں کہ انسان مرنے والے کا قاتل بن جائے یا پیدا کرنے والے ہی کا منکر ہو جائے تو اسے
میراث سے بہرحال محروم کر دیا جائے گا کہ پہلی صورت میں مورث کو مار کر وارث بننا چاہتا ہے
تو اس کی سزا یہ ہے کہ وراثت سے محروم کر دیا جائے اور دوسری صورت میں وہ اسی کے وجود
کا قائل نہیں ہے جس نے قانون وراثت کو بنایا ہے تو اس کے وارث ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

غرض کہ اسلام کے جملہ احکام، عبادات اور معاملات اس قدر دقیق مصالح کے حامل
ہیں کہ ان کی مکمل شرح اور توضیح کے لئے کتابیں درکار ہیں۔

اس مقام پر صرف چند مصالح معاملات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ بات واضح
ہو جائے کہ جس طرح اسلام کے عبادات کا کوئی جواب نہیں ہے اسی طرح اسلام کے معاملات کی
بھی کوئی مثال اور نظیر نہیں ہے۔ رب کریم امت اسلامیہ کو توفیق دے کہ وہ اپنے دین و مذہب
کی صحیح قدریں پہچانے اور عالم انسانیت کو بھی توفیق دے کہ ٹھوکریں کھانے کے بجائے اسلامی
تعلیمات کے سایہ میں پناہ لے۔ خالق کائنات کا قانون مخلوقات کے انکار کی پیداوار سے بہرحال
بہتر ہوتا ہے بشرطیکہ انسان میں اس امر کا شعور پیدا ہو جائے!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔